تخلیق

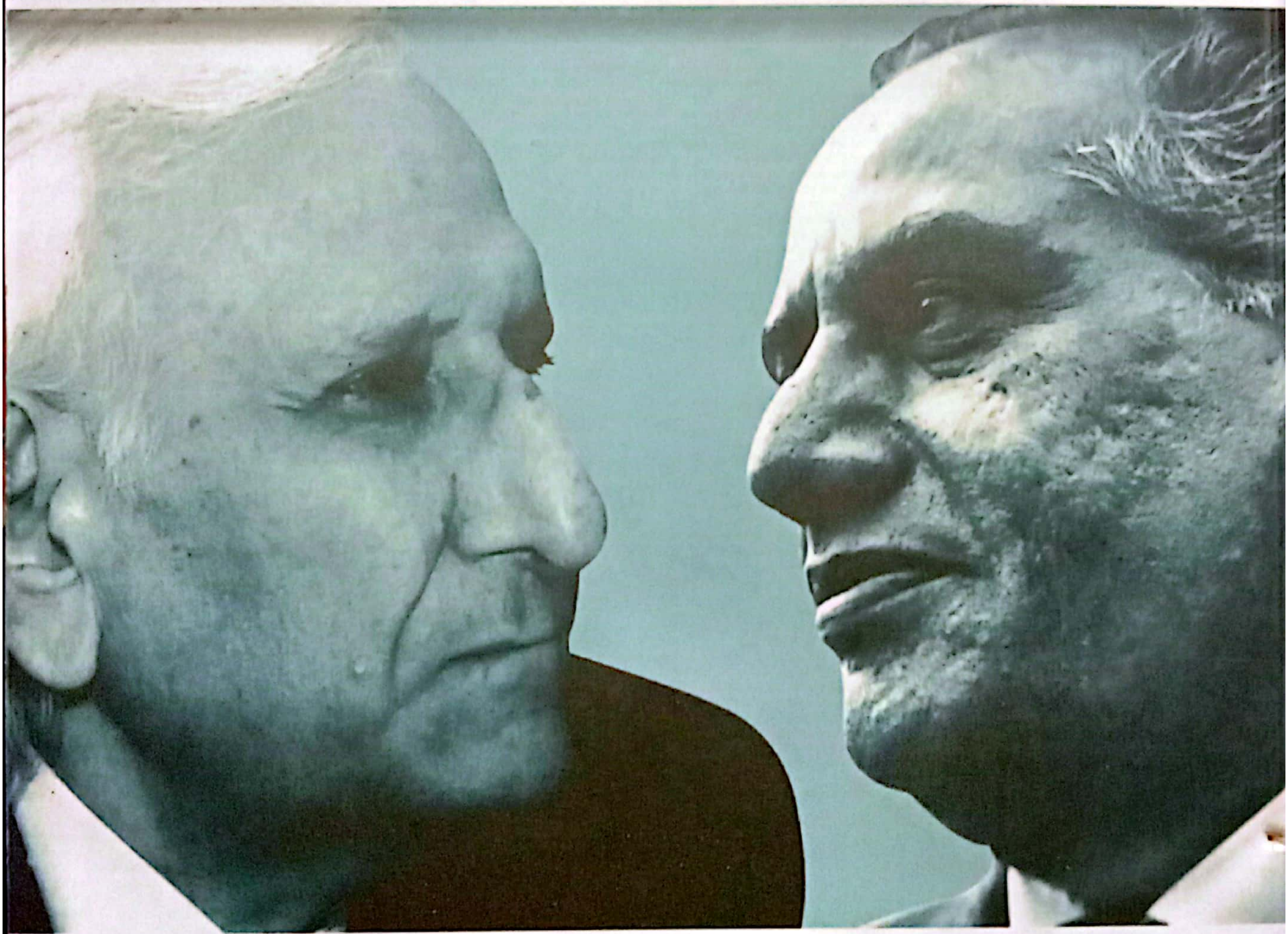

CamScanner

اشاعت کا مسلسل 44واں سال

ماہنامہ تخلیق لاہور

بانی مدیر اظہر جاوید

عرصہ ادارت 2012 - 1969ء

مدیر سونان اظہر جاوید

شمارہ : 3	مارچ 2013ء	جلد : 44

قیمت فی پرچہ : 100روپے ...... سالانہ : 500روپے (سالانہ 100ڈالر بیرون ممالک)

**E-67.A-1, St # 3, Near Defence Chowk, Police Chowki,
Super Town, Lahore-Cantt.**

فون نمبرز: 04236620499۔04236671007......موبائیل فون:03218899007

ای میل:ajavedtakhleeq@yahoo.com......ajavedtakhleeq@gmail.com

ماہنامہ ''تخلیق'' کے مدیر جناب اظہر جاوید نے عہد کیا تھا کہ وہ ''تخلیق'' کو اپنی زندگی کے آخر سانس تک جاری رکھیں گے۔ انہوں نے اس عہد کو پورا کیا اور 14 رفروری 2012ء کو اپنی جان...... جانِ آفرین کے سپرد کی تو اس ماہ کا ''تخلیق'' شائع کر چکے تھے اور یہ ادبی رسالہ اپنی اشاعت کے 43ویں سال میں قدم رکھ چکا تھا۔

جناب اظہر جاوید کی وفات کے بعد ''تخلیق'' کی ترتیب وتدوین اور طباعت واشاعت کی ذمہ داری میرے کندھوں پر آ پڑی۔ ادبی صحافت کے میدان میں نووارد ہونے کے باوجود...... میں نے اپنے والد مرحوم کی اس وراثت کو قائم رکھنے کا عہد کیا ہے اور سب سے پہلے ان کی یاد میں ''اظہر جاوید نمبر'' پیش کیا جسے ادبی حلقوں میں پسند کیا گیا۔ دم ہے تو ''تخلیق'' پیہم رہے گا اور یہ ''علامت''، ''افکار''، ''صریر''، ''تقاضے'' اور ''طلوعِ افکار'' جیسے رسائل کی صف میں شامل نہیں ہوگا۔ (انشا اللہ) جو مدیر اعلیٰ کی وفات کے ساتھ ہی مرحوم ہو گئے۔

43 سال تک ''تخلیق'' کی اشاعت رفیقانِ تخلیق کے تعاون کی مرہونِ منت ہے۔ میں توقع کرتا ہوں کہ یہ تعاون اب مجھے بھی حاصل رہے گا۔ ''تخلیق'' کے نئے دور میں چند اہلِ ادب نے دل کھول کر ''تخلیق'' کی معاونت کی اور آئندہ بھی مدد کا وعدہ کیا ہے۔ یہ اہلِ دل شاد آباد رہیں۔ ان اہلِ دل کے مشورے سے ''تخلیق'' کی باقاعدہ اشاعت کے لئے ''تخلیق فاؤنڈیشن'' قائم کی جا رہی ہے اور چند ناگزیر وجوہات کی وجہ سے دفتر ''تخلیق'' کی تبدیلی اور پرچے کی قیمت میں معمولی اضافہ وقت کی اہم ضرورت ہے۔ اُمید ہے آپ اسے خوشی سے قبول کریں گے۔

امریکہ، یورپ اور ہندوستان میں ''تخلیق'' کے امور کی ذمہ داری محترمہ نیّر جہاں، تاشی ظہیر اور نارنگ ساقی نے حسبِ سابق قبول کر لی ہے۔ یورپ اور امریکہ کے لئے زرِتعاون سو (100) ڈالر (یا اس کے مساوی کرنسی)، ہندوستان کے لئے زرِسالانہ صرف 1,000 روپے ہے۔

☆ تخلیق کا نیا پتہ: E-67.A-1, St # 3, Near Defence Chowk, Police Chowki, Super Town, Lahore-Cantt

PAKISTAN
Soonan Azhar
E/13/13C-1, Bismilla Lane, Cavalary Ground, Officer Colony, St.No.7 Walton
Lahore-Cantt.
Ph: 04236671007
Cell : 0321-8899007
Email:ajavedtakhleeq@gmail.com
Email:ajavedtakhleeq@yahoo.com

INDIA
K.L. Narang Saqi
L-4-Connaught Circus, New Delhi-110001, India
Ph: 0091-41517818
Email:narangsaqi@gmail.com

U.S.A.
Naiyar Jahan
721-Hill Street
111-Santa Monica
C.A. 90405, U.S.A.
Ph : 0013103969303
Email:Zihanat@hotmail.com
urdu@urdu markaz.com

U.S.A.
Tashie Zaheer
591-Sylvanave
Mountain View
C.A.94041
U.S.A.
Ph: 0015107503297
Email: tzaheer@gmail.com

ترتیب

پہلی بات	سونان اظہر جاوید	5
تخلیق کا تحسین ایوارڈ 2013		7
تخلیق کا تحسین ایوارڈ 2013		8

فیض صاحب کی یاد میں

چند لمحے فیض احمد فیض کے ساتھ	انور سدید	9
چند یادیں	سلیمہ ہاشمی	12
نذرِ فیض	بسمل صابری	14

مضمون

ممتاز شیریں اُردو کی پہلی نقاد خاتون	ابن سلطان	15

منظومات

غنودگی	ڈاکٹر وزیر آغا	19
ناآشنا	شہزاد احمد	19
دشتِ بے خواب	حسن عسکری کاظمی	20
نیا شہر	انور سدید	20
قطعہ	انور سدید	20
تین مصرعوں کی نظمیں	ناصر زیدی	21
نظمیں	علیم صبا نویدی	21
اندر مویا رہتا ہے	سلیم شہزاد	22
وہ اُداس شب تھی......	سجاد مرزا	22
تو جو آ جائے تو	سرور حسین	23
ماہیے	سلطان کھاروی	23
تڑپ	خالد ناز	24
گزارش	آفتاب خان	25
قطعہ	اقبال گرامی	25
وہ جنہیں آسماں کھا گیا	ثروت زہرا	26
نئے سال کا سورج	نیّر رانی شفق	26

افسانے

مٹی کی مہک	ڈاکٹر رشید امجد	27
سہاگ سرائے	نجم الحسن رضوی	31
گھونسلے سے گری چڑیا	ڈاکٹر ابدال بیلا	35
حصار	ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش	39
خالی گلدان	نجمہ عثمان	45
غفورا خاکروب	حنیف باوا	51
راز اک مٹھی میں	سلمٰی اعوان	56
اجنبی شہر میں ایک انسان	نثار احمد صدیقی	62

غزلیں

سیّد مشکور حسین یاد، شاہین، حسن عسکری کاظمی، ناصر زیدی، اسلم گورداسپوری، کرشن پرویز، انور سدید، بسمل صابری، رشیدہ عیاں، ڈاکٹر محبوب راہی، نجمہ عثمان، ڈاکٹر وصی مکرانی، خورشید بیگ میلسوی، ناصر علی سیّد، سوہن راہی، اکرام تبسم، بی ڈی کالیہ ہمدم، عرش صہبائی، زمان کنجاہی، مظفر حسن منصور، آفتاب راجا، تسنیم کوثر، اطہر جعفری، آفتاب راجا، مسّرت رعنا، ریاض ندیم نیازی، فوقیہ مشتاق، محمود رحیم 66 - 80

یادنگاری

کرنل مجید ملک	شفیع عقیل	81

آپ بیتی

میری کہانی	فرخندہ لودھی	86
نکلے ہوئے جنت سے	عزیز میرٹھی	92
سفرِ شمال	طارق محمود	97
بیتے کل کا اک پل	نذیر فتح پوری	100

ڈائری

سنگریزے اور جواہر	غلام الثقلین نقوی	105

طنز و مزاح

میں نہیں مانتا......	ڈاکٹر معین قریشی	109

جائزے

ایک درویش صفت انسان	گلشن کھنہ	111
کچھ یادیں کچھ باتیں	عذرا اصغر	114
شیرازہ	انور سدید	117

گوشۂ اظہر جاوید

محبتوں کا پیامبر......	ف۔س۔اعجاز	120
اظہر جاوید کی یاد میں	ایم ڈی ملک	122
روشنی کی مثال تھا اظہر	علی رضا	124
عجیب مانوس اجنبی تھا	خالدہ احسان	126
اظہر جاوید کی نذر	ڈاکٹر وصی مکرانی	130
اظہر جاوید کی نذر	لطیف قریشی	130
سلسلے محبتوں کے	خطوط اظہر جاوید	131
قندِ مکرر (اپنی بات)	اظہر جاوید	134

پنجاب رنگ

سنگی ساتھی......	حسن عسکری کاظمی	136
سم راج	سلیم شہزاد	136
نمکین غزل	بیرا جی	137
ست بسم اللہ	منزّہ شاہد	137
غزلیں	اظہر جاوید	138
ویگن والی (کہانی)	اظہر جاوید	139

تبصرے

143

اظہر جاوید مدیرِ ''تخلیق'' کی پہلی برسی

148

انجمن خیال (خطوط)

کشمیری لال ذاکر، حسن عسکری کاظمی، علی سفیان آفاقی، نذیر فتح پوری، عزیز میرٹھی، مراق مرزا، سلیمان خمار، شفیع ہمدم، ایس ایم معین قریشی، تشنہ بریلوی، سیفی سرونجی، دردانہ نوشین خان، خاقان ساجد، سکندر حیات میکن، رومانہ رومی، خان پرویز، غلام نبی اعوان، اخلاق عاطف، مظفر حسن منصور، محمد آصف مرزا، انوار احمد بگوی، جاوید راہی، مشتاق احمد، آئی۔یو۔جرال، سرور حسین، سیّد ریاض حسین، خالد عبداللہ، تصور اقبال، مہ جبین قیصر، شگفتہ نازلی، نجیب عمر، حفیظ انجم، یٰسین احمد، وصی مکرانی واجدی، نسرین نکہت سبزواری، انوار فیروز 150–168

ٹائیٹل : سلیمہ ہاشمی

بیک ٹائیٹل : انیس یعقوب

ناشر — سونان اظہر جاوید

طابع — بیدار سرمدی

قانونی مشاورت — لطیف قریشی، سیّد شاہد بخاری

مطبع — بُکسن پرنٹرز، گلشن راوی، لاہور

مقامِ اشاعت

E-67.A-1, St # 3, Near Defence Chowk,

Police Chowki, Super Town, Lahore-Cantt

o بِسمِ اللّٰہِ الرّحمٰنِ الرّحِیم ط o

پہلی بات

ہر سال جب 4 جنوری کی صبح طلوع ہوتی تو میں نمازِ فجر ادا کرنے کے بعد اپنے والد گرامی اظہر جاوید کو فون کرتا اور انہیں سالگرہ پر مبارک باد پیش کرتا اور دُعا کرتا کہ اللہ تعالیٰ انہیں صحت مند زندگی عطا کرے اور ان کے شوق و ذوق کے سلسلے جن میں رسالہ ''تخلیق'' کو فوقیت حاصل تھی، سابقہ برسوں کی طرح تزک و احتشام سے چھپتا رہے۔ اظہر جاوید اس وقت نماز پڑھ چکے ہوتے اور درودِ ابراہیمی کے وظیفے میں مستغرق ہوتے۔ گھنٹی دیر تک بجتی رہتی تو میں سمجھ جاتا کہ اپنے روز کے معمول میں مصروف ہوں گے۔ کچھ وقفے کے بعد میں دوبارہ فون کرتا تو میری آواز سنتے ہی دعاؤں سے یاد کرتے لیکن انہیں بالکل معلوم نہ ہوتا کہ ان کی زندگی نئے سال میں قدم رکھ چکی ہے۔ میں یاد دلاتا تو کہتے ''خدا کی دی ہوئی معینہ زندگی کا ایک سال اور کم ہو گیا۔'' یہ بات انہوں نے 4 جنوری 2012ء کو بھی کہی تھی لیکن کیا پتہ تھا کہ یہ اُن کی حیاتِ مستعار کا آخری سال تھا اور 14 فروری کو جب فرشتۂ اجل نے دروازے پر دستک دی تو کسی کو بتائے بغیر اُٹھ کر چلے گئے اور اب تک واپس نہیں آئے۔

اظہر جاوید کے دوستوں کو یاد ہوگا کہ انہوں نے اپنے ''ٹیبل کیلنڈر'' پر اپنے احباب کی سالگرہ کی تاریخ پر سبز دائرہ کا نشان لگا رکھا ہوتا تھا اور وہ سالگرہ کا تحفہ لے کر معینہ روز مبارکباد دینے کے لیے ہر دوست کے درِ دولت پر ضرور حاضری دیتے۔ 4 جنوری 2013ء میرے لیے شدید کرب، دُکھ اور درد کا دن تھا۔ میں فون تھامے روتا رہا، آج میرے جس جلیل القدر باپ کی سالگرہ تھی، لیکن وہ سینکڑوں من مٹی کے نیچے دفن تھے۔ ان کے دوست گزشتہ پورا سال انہیں یاد کرتے رہے تھے لیکن ناگاہ خیال آیا کہ آج کا اہم دن کسے یاد ہوگا؟ میں نے ارادہ کیا کہ پورا دن اظہر جاوید کی لحد پر گزاروں۔ قرآن خوانی کے انتظامات کر رہا تھا کہ منور سلطانہ صاحبہ کا فون آ گیا۔ وہ بے حد دل گرفتہ تھیں، میرے غم میں شریک تھیں۔ میری بیٹی آبگینہ کو بھی اپنے دادا کا بے مثال لاڈ پیار یاد تھا۔ گھر سے نکلنے لگا تو سیپاروں کا جزدان اُٹھا کر وہ بھی میرے ساتھ چل دی۔ یہ سوگوار دن تھا لیکن ابو کی یادوں نے اسے خوش گوار بنا دیا۔

پھر اچانک 14 فروری وارد ہو گیا اور مجھے احساس ہُوا کہ وقت تو اُڑتا چلا جا رہا ہے۔ والد صاحب کو ہم سے جدا ہوئے ایک سال گزر گیا ہے اور ان کی برسی کا دن آ گیا ہے۔ اب جو غم کی کیفیت پیدا ہوئی وہ 4 جنوری کی کیفیت سے بالکل مختلف تھی۔ اس میں غم کی لہر زیادہ تھی۔ والد کی شفقت بھرے سائے سے محرومی کا احساس بہت نمایاں تھا۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ ''تخلیق'' نے ایک سال کا فاصلہ طے کر لیا تھا۔ اس ایک سال نے اس ناتجربہ کار کو نہ صرف ادبی صحافی بنا دیا تھا بلکہ اسے اظہر جاوید کی مسند بھی عطا کر دی تھی۔ میں ''تخلیق'' کے قلمی معاونین کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میرے معمولی کام کو اہمیت دی اور اس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ میں نے اظہر جاوید کی یادگار کو شاندار بنانے میں مقدور بھر کوشش کی ہے۔ میرا احساس یہ بھی تھا کہ اظہر جاوید کا مزاج شہرت گریز تھا۔ انہوں نے ''تخلیق'' میں بے شمار نئے لکھنے والوں کو متعارف کرایا اور سینئر ادیبوں کے وقار میں اضافے کی سعی کی لیکن ملک کے اس ممتاز ادبی پرچے کو اپنے نام و نمود کا وسیلہ نہیں بنایا۔ گزشتہ ایک سال کے دوران مجھے یہ تجربہ بھی ہوا کہ میرے والد صاحب نے مخلص دوستوں کا ایک وسیع حلقہ پیدا کیا۔ اس حلقے کا ہر رکن ان کی وفات پر غم زدہ تھا اور پھر اس کا اظہار انہوں نے اپنے مضامین میں بھی کیا۔ یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔

میں نے اپنی ناتجربہ کاری کا ذکر کیا تو ان دوستوں نے دستِ خلوص دراز کیا اور نہ صرف تخلیق کی ترتیب وتدوین میں معاونت کی بلکہ بالواسطہ طور پر میری ادبی تربیت کا خیال بھی رکھا۔ اور مالی تعاون کی ایسی مثال بھی قائم کی جس پر میں فخر کا اظہار کرسکتا ہوں کہ ''تخلیق'' کا اشاعتی مستقبل ان کے تعاون سے منسلک ہے۔ میں امریکہ، کینیڈا، برطانیہ، یورپ اور خلیجی ریاستوں میں آباد تارکینِ وطن کا خصوصی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے نہ صرف اپنے مخلص دوست کی یادگار کو قائم رکھنے میں تعاون کیا بلکہ اُردو زبان کا حق بھی ادا کیا۔ ان کی اس ''اُردو دوستی'' کو تاریخ ادب میں سنہری حروف میں لکھا جائے گا۔ بعض قلمی معاونین نے اعزازی پرچے کی فرمائش کی۔ میں ان کے ادبی حق کو تسلیم کرتا ہوں لیکن یہ گزارش بھی ضروری ہے کہ ادبی پرچے کی اشاعت منفعت کا کاروبار نہیں ہے۔ سٹال پر فروخت کے لیے بھیجے جانے والے پرچوں کی کبھی قیمت وصول نہیں ہوتی اور اب ادبی رسالے کے قلمی معاونین میں اس کے قارئین بھی شامل ہیں اور مدیر بھی۔ انسان کے بہت سے شوق جو عادتِ ثانیہ بن چکے ہیں جسم کے لیے ضرر رساں ہیں لیکن گراں قیمت ہیں۔ جبکہ ادب روح کی غذا ہے۔ آپ کے خیالات کے فروغ کا وسیلہ ہے۔ ''تخلیق'' سے تعاون آپ کی ادبی عبادت ہے۔ اسے جاری رکھیے۔

''تخلیق'' گزشتہ 43 برسوں کے دوران میں ''دوماہی'' چھپتا رہا ہے۔ کچھ دوستوں نے اسے ماہنامہ کردینے کی تجویز دی جبکہ طباعتی اخراجات میں غیر معمولی اضافے کے پیشِ نظر ''تخلیق'' کو سہ ماہی کرنے کا مشورہ بھی دیا گیا۔ میرے لیے یہ تجرباتی دور ہے۔ منافع کی خواہش نہیں لیکن نقصان اٹھانے کی بھی ایک حد ہے۔ جسے آپ کے عملی تعاون سے ہی محدود کیا جاسکتا ہے۔ یہ ادبی سفر جاری رکھنے کے لیے اپنے مشوروں سے نوازیئے۔ ''تخلیق'' کی محدود ضخامت کے پیشِ نظر ہی یہ تحریک کی گئی ہے کہ

''الفاظ قیمتی سرمایہ ہیں۔ یہ دولت کفایت سے استعمال کیجئے۔ اختصار سے لکھیے۔''

بہت سے کرم فرماؤں نے اس تحریک میں عملی معاونت شروع کردی ہے۔ تاہم ''انجمن خیال'' کے خطوط میں بعض ذاتی اور غیر ادبی مندرجات کی ایڈیٹنگ ناگزیر ہوجاتی ہے۔ درخواست ہے کہ اپنے خطوط میں سابقہ پرچے کے مضامین، نظم ونثر پر رائے دے کر ممنون کیجئے اور نقطۂ اختلاف کو ادب کے شائستہ دائرے میں ہی رکھیے۔ اختلاف ادب کا اہم جزو ہے۔ اس اہم جزو کی تعمیر کیجئے۔

اُردو کے ممتاز ادباء کی اعلیٰ ادبی خدمات کا اعتراف کرنے کے لیے ایک نیا سلسلہ شروع کیا جارہا ہے۔

وفیات

گزشتہ چند ماہ کے دوران میں اُردو زبان وادب، جن معروف ادبی شخصیات سے محروم ہوگیا، ان میں 200 سے زائد کتابوں کے مصنف سنیل گنگوپادھیائے، نامور نقاد ڈاکٹر محمد علی صدیقی، ہندوستان کے ماہرِ غالبیات، ڈاکٹر حنیف نقوی، نظم جدید کے شاعر اور ڈرامہ نگار رضی ترمذی، دانشور نقاد رشید نثار، پاکستانیت کے تاریخ نگار مرزا محمد مظفر شامل ہیں۔ لندن میں مقیم منفرد افسانہ نگار صفیہ صدیقی اور علامہ اقبال کے فارسی کلام کو اُردو میں منظوم کرنے والے مترجم شاعر محمد سرور رجا بھی اس دنیا سے اُٹھ گئے۔ منفرد شاعرہ محترمہ شبنم شکیل کے شوہر جناب شکیل احمد اسلام آباد میں انتقال کرگئے۔ ان سب کی رحلت پر اُردو دنیا سوگوار ہے اور غم کا اظہار کرتی ہے۔

﴿پرچہ پریس میں جارہا تھا کہ جناب حفیظ صدیقی مدیر ماہنامہ ''تحریریں'' کی وفات کی خبر آگئی۔ مرحوم وضعدار ادیب تھے۔ اللہ تعالیٰ اُن کی مغفرت کرے۔﴾

رب راکھا

سونان اظہر جاوید

تخلیق کا ''تحسین ایوارڈ 2013ء''

ڈاکٹر انور سدید

ڈاکٹر انور سدید بنیادی طور پر ادیب ہیں، انہوں نے ادبی زندگی کا آغاز 1942ء میں بچوں کے رسالہ ''گلدستہ'' سے کیا اور پھر افسانہ نگاری کی طرف آ گئے۔ وزیر آغا انہیں رسالہ ''اوراق'' میں تنقید اور انشائیے کی طرف لے آئے، اس دور میں انہوں نے شاعری میں بھی نام پیدا کیا۔ 1988ء میں سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہوئے تو صحافت میں آ گئے۔ انہوں نے عملی زندگی کی ابتدا سول انجینئرنگ میں سب انجینئر کی حیثیت میں کی اور سپرنٹنڈنٹ انجینئر کے گریڈ تک پہنچے لیکن انہوں نے ادب کو ہمیشہ اپنا عشق قرار دیا۔ ان کی پوری زندگی جو اب 85ویں برس میں داخل ہو چکی ہے، ان کی دیانت دارانہ محنت اور جاں کاہ ریاضت کی آئینہ دار ہے اور وہ اب بھی ملک کے ممتاز ترین اخبار ''نوائے وقت'' کے ساتھ وابستہ ہیں۔

انور سدید 4 دسمبر 1928ء کو ضلع سرگودھا کے ایک قصباتی شہر میانی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم سرگودھا اور ڈیرہ غازی خان کے سکولوں سے حاصل کی۔ ایف ایس سی کے لیے اسلامیہ کالج لاہور میں داخلہ لیا لیکن تحریک پاکستان میں شرکت کی وجہ سے ایف ایس سی نہ کر سکے اور گورنمنٹ انجینئرنگ سکول رسول سے اوّل بدرجہ اوّل اور طلائی تمغے کے ساتھ ڈپلوما حاصل کیا۔ بعد میں انسٹی ٹیوٹ آف انجینئرنگ ڈھاکہ سے اے، ایم، آئی، ای کے امتحانات پاس کر کے سول انجینئرنگ کی ڈگری لی اور ملازمتی زندگی پنجاب کے محکمہ آبپاشی میں بسر کی۔

انور سدید نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔اے (اردو) کیا اور خارجی امیدواروں میں سب سے زیادہ نمبر لینے کا ریکارڈ قائم کیا۔ انہیں یونیورسٹی کا طلائی تمغہ وائس چانسلر حمید احمد خان نے عطا کیا۔ 1978ء میں مقالہ ''اردو ادب کی تحریکیں'' لکھ کر پی ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اس کتاب پر اکادمی ادبیات پاکستان نے انہیں ہجرہ ایوارڈ دیا۔ ان کی کتاب ''اقبال کے کلاسیکی نقوش'' پر رائٹرز گلڈ ایوارڈ...... ''اردو میں حج ناموں کی روایت'' پر نقوش ایوارڈ اور بہترین کالم نگاری پر اے، پی، این، ایس ایوارڈ مل چکا ہے۔ انہیں صدرِ پاکستان کا ''تمغۂ امتیاز'' 2008ء میں دیا گیا۔

ڈاکٹر انور سدید کی اب تک 85 تالیفات و تصنیفات چھپ چکی ہیں۔ ''اردو ادب کی تحریکیں''...... ''اردو افسانے میں دیہات کی پیشکش''...... ''پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ'' اور ''اردو ادب میں سفرنامہ'' ان کی چند ایسی کتابیں ہیں جو موضوع کے اعتبار سے بے نظیر ہیں اور اُردو ادب میں اولیّات کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان کی معروف کتابوں میں ''فکر و خیال''...... ''اختلافات''...... ''اقبال کے کلاسیکی نقوش...... انشائیہ اُردو ادب میں'' ''غالب کا جہاں اور''۔ ''اردو شاعری کا دیار''۔ ''اردو نثر کے آفاق'' وغیرہ شامل ہیں۔ اکادمی ادبیات پاکستان نے ان سے ''پاکستانی ادب کے معمار'' کے سلسلے میں بانو قدسیہ، غلام جیلانی اصغر، فرخندہ لودھی، غلام الثقلین نقوی اور مولانا صلاح الدین احمد پر کتابیں لکھوائیں۔

ہندوستان میں ان کے ادبی خدمات پر پی ایچ۔ڈی سطح کا کام ہو چکا ہے۔ پاکستان میں ایم۔اے اور ایم۔فل کے متعدد مقالات لکھے جا چکے ہیں۔ رسالہ ''قرطاس''، ''بے لاگ''، ''تخلیق''، ''اوراق''، ''چہار سو''، ''ارتکاز''، ''روشنائی''، ''جدید ادب'' اور ''کوہسار'' میں انور سدید پر خصوصی گوشے چھپ چکے ہیں۔

انور سدید کا منفرد اعزاز یہ ہے کہ انہوں نے پورے اُردو ادب کا ایک سال کا ضخیم ترین جائزہ ''ادب کہانی 1997ء'' کتابی صورت میں پیش کیا۔ 2002ء میں انہوں نے ''سنڈے نوائے وقت'' میں ایک سال میں 223 کتابوں پر تبصرے لکھنے کا عالمی ریکارڈ قائم کیا۔ ''کچھ وقت کتابوں کے ساتھ'' ان کے ایک سو تبصروں کی کتاب ہے۔ ''کتب مینار'' کے نام سے تبصروں کی دوسری کتاب آغا امیر حسین نے ''کلاسیک'' سے شائع کی ہے۔ رسالہ ''تخلیق'' میں ان کی سلسلہ وار کتابیں ''غالب کے نئے خطوط''، ''دلّی دور نہیں'' اور ''غزل کے رنگ'' چھپ چکی ہے۔

انور سدید کے ادبی کام پر سجاد نقوی نے ایک ضخیم کتاب لکھی ہے۔ ملک مقبول احمد نے ان کے گم شدہ انٹرویوز کی دو کتابیں ''آپس کی باتیں'' اور ''برسبیلِ گفتگو'' مرتب کی ہیں، وہ اسے اپنا خصوصی اعزاز قرار دیتے ہیں کہ ''تخلیق'' کے ساتھ روزِ اوّل سے قلمی معاونت کر رہے ہیں اور اظہر جاوید (مرحوم) کے بہترین دوستوں میں سے تھے۔ ڈاکٹر انور سدید کے اس بے مثال ادبی کام پر ادارہ ''تخلیق'' ان کی خدمت میں ''تخلیق کا تحسین ایوارڈ 2013ء'' پیش کرتا ہے۔

سونان اظہر جاوید

تخلیق کا "تحسین ایوارڈ 2013ء"

شفیع عقیل

شفیع عقیل کی ادبی شخصیت کے کئی زاویے ہیں، وہ شاعر ہیں، افسانہ نگار ہیں، دیس دیس کی کہانیوں کو تلاش کرنے والے محقق اور مترجم ہیں۔ طنز و مزاح نگار ہیں اور سب سے اہم زاویہ ان کی صحافت کا ہے کہ اس خارزار کو انہوں نے وسیلۂ حیات بنایا اور اپنی محنت و مشقت سے آبرومندانہ زندگی بسر کی، ادب ان کا فطری شوق تھا۔ انہوں نے 1952ء سے لے کر زمانہ حال تک چالیس سے زیادہ کتابیں پیش کیں، ادبی دنیا میں کثیر الجہت مصنف شمار ہوئے اور شہرت و ناموری حاصل کی۔

شفیع عقیل 1930ء میں لاہور چھاؤنی کے علاقے میں واقع ایک گاؤں "تھینسہ" میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم لاہور کے ایک ٹاٹ سکول میں حاصل کی اور اس دور میں ہی ادب کے ذوق کی پرورش کی اور 1948ء میں ادیب، عالم اور منشی فاضل کے امتحانات پاس کیے۔ پیدائشی نام محمد شفیع تھا۔ ادبی نام شفیع عقیل اختیار کیا۔ 1950ء میں کراچی آ گئے اور رزقِ حیات حاصل کرنے کے لیے صحافت کا پیشہ اختیار کیا۔ اسی برس روزنامہ "جنگ" کراچی میں میگزین ایڈیٹر مقرر کیے گئے۔ اس دور میں انہوں نے سیاست، ادب، معاشرت، فنونِ لطیفہ پر متعدد کالم لکھے۔ بچوں کا رسالہ "بھائی جان" مرتب کیا۔ ادبی جریدہ "ماحول" کی ماہانہ ادارت کی، ملک کے ممتاز مزاح نگار مجید لاہوری سے ملاقات ہوئی تو انہیں دیہاتی سادگی، وضعداری اور صاف گوئی سے متاثر کیا۔ مجید لاہوری نے انہیں اپنے فکاہی رسالے "نمکدان" کا معاون ایڈیٹر بنا لیا۔ 1986ء میں انہیں "اخبارِ جہاں" کا مدیر مقرر کیا گیا۔ بیسویں صدی کے آخری تین برسوں میں شفیع عقیل نے اخبار "جنگ" کے ایڈیٹوریل ڈائریکٹر کی خدمات انجام دیں اور آج کل ش، ع کے قلمی نام سے اخبار جنگ کے میگزین میں کتابوں پر تبصرے لکھتے ہیں۔

شفیع عقیل کی زندگی صحافت میں گزری ہے۔ انہوں نے قلم و قرطاس کے ساتھ اپنا رشتہ مضبوطی سے قائم رکھا۔ اور کتابوں کی تصنیف و تالیف کے علاوہ سیر و سیاحت کے شوق کی پرورش کی جس کا ثبوت جرمنی، برطانیہ، ترکی، کینیڈا، جاپان، تھائی لینڈ، بھارت، آسٹریا، بلجیم، پولینڈ، شام، فرانس، امریکہ، ازبکستان میں ان کی جہاں گردی ہے۔ جناب شفیع عقیل کی پہلی کتاب "بھوکے" افسانوں کی کی تھی جو 1952ء میں چھپی۔ اگلے برس انہوں نے طنز و مزاح کی کتاب "ایک آنسو ایک تبسم" شائع کی۔ پھر زندگی پر پوری وسعت سے نظر ڈالنے کے لیے ناول "ڈھل گئی رات" لکھا جو ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہوا۔ شفیع عقیل کو قومی زبان اُردو کی طرح اپنی ماں بولی پنجابی بھی بہت عزیز ہے۔ "سوچاں دی زنجیر" ان کی پنجابی شاعری کی کتاب ہے۔ انہوں نے مرزا اسداللہ خان غالب کی اُردو شاعری کو بھی پنجابی میں ترجمہ کیا ہے۔ اس کتاب کا نام "غالب جنہوں ہر کوئی چنگا آکھے" ہے۔ انہیں قائداعظم محمد علی جناح کی تقریروں اور بیانات کو پنجابی میں پیش کرنے کا اعزاز حاصل ہے۔ پنجابی کلاسیکی ادب کی مشہور کتاب "سسی پنوں ہاشم شاہ" پر تحقیقی نظر ڈالنے کے بعد اس پر شفیع عقیل نے اپنے تنقیدی نقطۂ نظر کا اظہار کیا ہے۔ ان کے اعلیٰ ادبی کام پر 2004ء میں صدرِ پاکستان نے "تمغۂ امتیاز" عطا کیا۔ پاکستان رائٹرز گلڈ، اکادمی ادبیات پاکستان، بک کونسل آف پاکستان، عالمی اُردو کانفرنس ہندوستان' بھی انہیں ایوارڈ پیش کر چکی ہے۔ تحقیقی زاویے سے شفیع عقیل نے پنجابی زبان کے ادب کو زیادہ اہمیت دی، ان کی صحافتی خدمات کو کراچی پریس کلب نے سراہا اور انہیں "لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ" پیش کیا۔ مجید لاہوری کی شخصیت اور فن پر ان کا کام انفرادی نوعیت کا ہے۔ پاکستان کے نامور مصوروں کو متعارف کرانے کے لیے ان کا سلسلۂ مضامین و کتب کو بڑی قدر کی نگہہ سے دیکھا گیا ہے۔ نامور ادیبوں کی کہانیاں، مضامین اور منظومات جو گردشِ زمانہ میں گم ہو چکی تھیں شفیع عقیل نے بازیافت کیں، ممتاز ادیبوں سے ان کے انٹرویوز میں چھپ چکے۔ یہ سب ایک فرد کا کام ہے جسے آپ انجمن بھی قرار دے سکتے ہیں۔ ادارہ "تخلیق" ان اعلیٰ ادبی خدمات پر جناب شفیع عقیل کو "تخلیق کا تحسین ایوارڈ 2013ء" پیش کرتا ہے۔

سونان اظہر جاوید

فیض احمد فیض کی یاد میں

چند لمحے فیض احمد فیض کی معیّت میں

ڈاکٹر انور سدید

فیض کی پہلی نظم گورنمنٹ کالج لاہور کے رسالہ ''راوی'' میں ''میرے معصوم قاتل'' کے عنوان سے 1929ء میں شائع ہوئی تو ان کی عمر 18 سال (پ 1911ء) تھی۔ 30 سال کی عمر میں ان کی شاعری کا پہلا مجموعہ ''نقشِ فریادی'' 1941ء میں شائع ہوا۔ لیکن اس وقت تک ان کی شہرت کو پر لگ چکے تھے اور وہ نہ صرف نئی غزل کے نمایاں شاعر تسلیم کیے جا چکے تھے بلکہ ان کی غزل کے نئے آہنگ اور تازہ کاری نے بھی نوجوانوں کو مسحور کر رکھا تھا۔ میں نے ان کا نام پہلی دفعہ 1944ء میں اسلامیہ کالج لاہور میں سُنا جہاں میں سالِ اوّل کا طالب علم تھا۔ جناب رفیق خاور فارسی کے استاد تھے لیکن شاعری اردو میں کرتے تھے۔ ان کی دو نظمیں ''حسن کی دیوی ریحانہ'' ......اور ''زہرہ نے میرا سکھ چھینا'' ...... جو اختر شیرانی کے اُسلوبِ شعر میں لکھی گئی تھیں، طالب علموں میں بہت مشہور تھیں۔ ایک دن خالی پیریڈ میں طلبا رفیق خاور صاحب کے گرد جمع ہو گئے اور ان سے یہ نظمیں سنانے کی درخواست کرنے لگے تو انہوں نے یہ قطعہ اپنے مخصوص تحت اللفظ میں سنایا ؎

رات یوں کھوئے ہوئے دل میں تری یاد آئی
جیسے ویرانوں میں چپکے سے بہار آ جائے
جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آ جائے

پروفیسر رفیق خاور صاحب جب اپنے طلبا کی داد سمیٹ چکے تو انہوں نے فرمایا ''یہ قطعہ میرا نہیں بلکہ فیض احمد فیضؔ کا ہے۔ اور آپ کو اس لیے سنایا ہے کہ ان کی شاعری کی کتاب خرید کر یا لائبریری سے لے کر پڑھیں۔'' اب مجھے یاد آتا ہے کہ رفیق خاور صاحب نے کتاب کا نام طلبا کا اشتیاق بڑھانے کے لیے نہیں بتایا تھا اور جب طلبا کے شوق کو انگیخت مل گئی تو انہوں نے کہا ''کتاب کا نام ہے ''نقشِ فریادی'' اور یہ کالج کے سامنے ''قومی کتب خانے'' سے مل سکتی ہے۔'' اس کتاب کی قیمت زیادہ نہیں تھی۔ لیکن میرا جیب خرچ خریداری کا متحمل نہیں تھا۔ اس لیے یہ کتاب میں نے دلّی دروازہ کے باغ میں واقع ''شاہ محمد غوث لائبریری'' سے لے کر پڑھی۔

فیض احمد فیضؔ سے یہ میرا پہلا تعارف تھا اور ان کی شاعری میری طالب علمانہ دانش سے بلند تھی لیکن یہ حقیقت ہے کہ لاہور سے دور میں نے محکمہ آبپاشی میں ملازمت اختیار کی تو محکمہ نہر کے ویران بنگلوں کی تنہائی میں کتابیں ہی میری دوست تھیں، میرا محبوب موضوع تو افسانہ تھا لیکن میں نے شاعری کی کتابوں کو بھی اپنے مطالعے کا حصّہ بنا رکھا تھا اور ان میں فیض صاحب بھی شامل تھے۔ اب اپنی زندگی کے

85ویں سال میں پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اقبال کے بعد فیض احمد فیضؔ بیسویں صدی کے سب سے بڑے شاعر تسلیم کیے جا چکے ہیں، بلاشبہ آزاد نظم کو فروغ دینے والوں میں تصدّق حسین خالد، عطاءاللہ سجاد، میراجی اور ن۔م۔راشد کی اہمیت زیادہ ہے لیکن قبولِ عوام فیضؔ کو ملا اور اس صدی کے جائزوں میں اقبال کے بعد فیضؔ کو ہی ان سب پر فوقیت دی گئی ہے۔ اور اب میں اپنے آپ کو ان خوش قسمت لوگوں میں شمار کر سکتا ہوں جنہوں نے اپنی زندگی اور ادب کا سفر فیضؔ صاحب کی شہرت کی چاندنی میں طے کیا۔ ان کے مطالعے سے دل و دماغ کو منوّر کیا اور ان کی محفلِ غائبانہ سے استفادہ کیا۔ یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے اور ہمیشہ جاری رہے گا۔ میں نے ان کی سب کتابیں بالاستیعاب پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

فیضؔ صاحب 13 فروری 1914ء کو سیالکوٹ کے ایک دور افتادہ گاؤں کالا قادر میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد بیرسٹر سلطان محمد خان اپنے علم اور حکمت کی اساس پر افغانستان کے امیر عبدالرحمان کے دربار میں میر منشی (چیف سیکرٹری) مقرر ہو گئے۔ دربار میں ان کے خلاف سازشیں ہونے لگیں تو جان بچا کر انگلستان چلے گئے۔ اس دوران امیر افغانستان کا رویّہ تبدیل ہو گیا تو انہیں برطانیہ میں افغانستان کا سفیر مقرر کر دیا۔ واپس سیالکوٹ آئے تو شاہانہ زندگی بسر کی۔ فیضؔ صاحب نے لکھا ہے:

''...... میں ابھی کالج میں تھا تو ان (والد صاحب) کا انتقال ہو گیا۔ جنازے وغیرہ سے فارغ ہوئے تو قرض خواہ آنے لگے۔ اب معلوم ہوا کہ ہم لوگ اس زمانے میں 80 ہزار روپے کے مقروض تھے۔ انہوں (والد صاحب) نے ہمیں کبھی نہیں بتایا کہ تمام فراخدلی قرض کی بدولت تھی۔'' (''ادبیات''، فیض نمبر، ص292)

فیضؔ صاحب کے بڑے بھائی طفیل احمد خان مقدمے بازی میں اُلجھ گئے۔ فیضؔ صاحب نے شاعری سے لو لگا لی اور تمام عمر دل و نظر کا حق ادا کرتے رہے۔ زندگی قناعت اور سیر چشمی سے گزاری۔ اپنے پورے عہد کو متاثر کیا اور یہ فقیرانہ صدائیں لگانے لگے:

اب کوئی اور کرے پرورشِ گلشنِ غم — دوستو! ختم ہوئی دیدۂ تر کی شبنم

....

کوئے جاناں میں کھلا، میرے لہو کا پرچم — دیکھیے، دیتے ہیں کس کس کو صدا میرے بعد

....

تھم گیا شورِ جنوں، ختم ہوئی بارشِ سنگ — خاکِ راہ، آج لیے ہے، لبِ دیدار کا رنگ

ترقی پسند تحریک کے ایک نامور شاعر کی حیثیت میں انقلاب کی آواز فیضؔ نے بھی اٹھائی اور غریب عوام سے مضبوط ناتہ بھی جوڑا لیکن ترقی پسند تحریک کو اپنی شرائط پر قبول کیا تو تسلیم و رضا کی خُو کو قائم رکھا۔ چنانچہ جب کمیونسٹ پارٹی نے ''اقبال کے انہدام'' کی ''پارٹی لائن'' جاری کی تو فیضؔ صاحب نے اس کی مخالفت کی۔ پھر انجمن ترقی پسند مصنفین نے انقلاب کے سرخ پرچم کو سوویٹ یونین سے ابھرتے دیکھا تو اس تحریک کے ادبی رسائل پر غیر ترقی پسندوں کی اشاعت ممنوع قرار دے دی۔ میں نے اپنے ایک مضمون میں اسے ''ادبی مارشل لاء'' قرار دیا اور جن ادیبوں کو گردن زدنی قرار دیا گیا تھا ان میں سعادت حسن منٹو، یوسف ظفر، نسیم حجازی، شورش کاشمیری، صمد شاہین، ممتاز شیریں، محمد حسن عسکری، قیوم نظر اور شیر محمد اختر جیسے ادباء شامل تھے۔ اس قرارداد کو سب ترقی پسند ادیبوں نے قبول کیا صرف فیض احمد فیضؔ نے اس کی مخالفت کی۔ چنانچہ ترقی پسند رسالہ ''سویرا'' شائع ہوا تو اس میں غیر ترقی پسند ادیبوں کو شامل نہیں کیا گیا تھا۔ محبِّ وطن قاری نے

''سویرا نمبر 6'' پڑھنے سے انکار کر دیا اور کئی برسوں کے بعد کباڑیوں نے اس پرچے کو فٹ پاتھ پر فروخت کیا۔ یہ دو واقعے فیضؔ کی کشادہ دلی اور بلند نظری کے مظہر ہیں۔

ترقی پسند تحریک کے بیشتر شاعروں مثلاً مخدوم محی الدین، علی سردار جعفری، عارف عبدالمتین، احمد ندیم قاسمی وغیرہ نے مروجہ زبان اور مقبولِ عام اُسلوب میں تحریکی شاعری لکھی لیکن فیض احمد فیضؔ نے اپنے فن کا چاک منفرد انداز میں گھمایا اور صریرِ خامہ کو نوائے سروش بنانے کے لیے اپنا شعری ڈکشن الگ تراشا۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے انہیں خراجِ تحسین ادا کیا تو لکھا:

''فیضؔ کے فن میں سخن سنجی اور نرم آہنگ نغمہ خوانی کو زیادہ اہمیّت حاصل ہے......ان کا لہجہ غنائی ہے، ان کا دل محبت سے چور ہے۔ ان کا شعری وجود ایک روشن الاؤ کی طرح ہے جس میں دھیمی دھیمی آگ جل رہی ہے۔ اس کے سوزِ دروں میں سب ہنگامی آلائشیں پگھل جاتی ہیں اور جمالیاتی حسن کاری کی آنچ سے تپ کر تخلیقی جوہر تابندہ و روشن ہو اٹھتا ہے۔'' (میرے خیال میں نظریاتی اعتبار سے ایک غیر ترقی پسند نقاد کا فیضؔ صاحب کو یہ بہترین خراجِ تحسین ہے)

بیشتر ترقی پسند شعرا کی شاعری سوویٹ یونین کے انہدام کے بعد طاقِ نسیاں کی نذر ہو چکی ہے، لیکن میر تقی میرؔ اور میرزا غالبؔ کی طرح فیضؔ کی شاعری وقت کے پل صراط کو عبور کر چکی ہے اور اس کے اثر و عمل کا اندازہ اس حقیقت سے لگایئے کہ آج دین و مذہب اور سیاست و تہذیب کے ایوانوں میں مطالب و معانی عوام تک پہنچانے کے لیے فیض کے اشعار سب سے زیادہ پڑھے جاتے ہیں۔

فیضؔ صاحب اپنی زندگی میں شہرت کے آسمان پر پہنچ چکے تھے۔ شاید انہیں اس حقیقت کا علم بھی تھا لیکن ایک اور حقیقت یہ بھی ہے کہ وہ سستی شہرت کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اور دوسرے شاعروں کو ان کا حق دینے اور ان کی عظمت تسلیم کرنے سے ہرگز گریز نہیں کرتے تھے۔ ایک دفعہ شہزاد احمد نے بتایا کہ لندن کی ایک محفل میں جس میں زہرا نگاہ اور احمد فرازؔ بھی موجود تھے، کسی نے فیض صاحب سے کہا ''آپ بیسویں صدی کے سب سے بڑے شاعر ہیں''......فیضؔ صاحب سُن کر خاموش ہو گئے۔ پھر سگریٹ کا لمبا کش لیا اور اپنے دھیمے شیریں لہجے میں بولے:

''بھائی! انیسویں صدی کا سب سے بڑا شاعر غالب تھا۔ بیسویں صدی کا سب سے بڑا شاعر اقبال ہے۔''

محمد خالد اختر کا ناول ''چاکی واڑہ میں وصال'' جو نظروں سے اوجھل ہو کر فراموش کر دیا گیا تھا، لمبے عرصے کے بعد فیضؔ صاحب نے پڑھا تو اس کی تعریف میں رطب اللسان ہو گئے جس کسی کو ملتے یہ ناول پڑھنے کا مشورہ دیتے اور کہتے ''ہمارے درمیان محمد خالد اختر جیسا بڑا ناول نگار موجود ہے۔'' کشور ناہید نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ لوگوں نے فیض صاحب اور راشد صاحب کو لڑوانے کی بہت کوشش کی، راشد صاحب برہم بھی ہوئے تھے اور اس بات سے چڑ بھی جاتے تھے کہ لوگ ان کے مقابلے میں فیضؔ صاحب کو بڑا شاعر کیوں کہتے ہیں مگر فیض صاحب سے جب بھی ذکر ہوا وہ ہمیشہ راشد صاحب کی تعریف بھی کرتے تھے اور عزت بھی۔ اس طرح ایک دو دفعہ ہمارے ساتھ چل کر قاسمی صاحب کے پاس بھی گئے۔''

فیضؔ صاحب آج ہم میں موجود نہیں لیکن ان کا نام خواص کی زبان پر اور ان کا کلام عوام کے دلوں میں محفوظ ہیں۔ بلاشبہ وہ دوام ابد پا چکے ہیں اور بیسویں صدی کے نصف آخر کے سب سے بڑے شاعر ہیں جنہیں یاد کرنے والے ہر زمانے میں موجود رہیں گے۔

◆◆◆

فیض اور اظہر جاوید (چند یادیں)

سلیمہ ہاشمی

صدیوں پہلے جب اظہر جاوید سے پہلی ملاقات ہوئی تو چھوٹتے ہی بولے ''آپ لکھا کریں!'' میں نے فوراً جواب دیا ''میرا کام اور ہے، قبیلہ دوسرا ہے۔'' پھر احساس ہُوا کہ بدتمیزی ہوگئی ہے۔ وضاحت کے طور پر بتایا کہ بچپن میں ہی طے کر لیا تھا کہ کاغذ پر لائن لگانے اور رنگ بھرنے میں جو لطف ہے وہ لفظوں کے جوڑنے میں نہیں اور یوں بھی چھوٹی عمر میں بھانپ گئی تھی کہ فیض کی بیٹی ہونے کے ناطے لوگوں کی توقعات پوری کرنا اور اظہر جاوید جیسے لوگوں کے سوالات کا سامنا کرنا عمر قید کے برابر ہوگئی۔

میرا یہ ٹکا سا جواب دینا کوئی نئی بات نہیں تھی۔ لوگ یا تو خاموش ہو جاتے یا موسم کی بات کرنے لگتے۔ لیکن اظہر جاوید اس قسم کے نہیں تھے۔ ہنس کر بولے ''یہ تو آپ کہہ رہی ہیں نا۔ ہم نے تو آپ کو اپنے قبیلے کا ممبر بنایا ہے۔'' اب میرے خاموش ہو جانے کی باری تھی۔ سوچا بات کو طول دینے سے فائدہ؟ جب ایک بات اِنے سال پہلے طے ہو چکی ہے تو اُسے دوبارہ کریدنے سے کیا حاصل؟

فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ یہ تو آغازِ موضوع ہے۔ وہ پھر شروع ہو گئے۔

''ہاں تو مضمون کب لکھیں گی؟''

''کیسا مضمون؟ کون سا مضمون؟ میرا مضمون تو painting ہے۔''

''ہاں خوب یاد دلایا۔ آپ کے ذمے ایک تو فروری کے پرچے کا سرورق اور دوسرا فیض صاحب پر مضمون۔''

یہ تھی پہلی ملاقات اظہر جاوید کے ساتھ۔ میں نے سوچا بھلا آدمی ہے۔ بات کو ختم کرنے کا یہی طریقہ ہے کہ ایک فرمائش پوری کر دوں، لہٰذا سرورق چند دنوں میں کچی پکی سوچ بچار کے بعد بھجوا دیا۔

سرورق بھیجنے کی دیر تھی کہ فون بجا۔ ''بہت بہت نوازش۔ لفافہ موصول ہوا۔ کس طرح شکریہ ادا کروں۔ ایمان سے دل خوش کر دیا۔ کیا خوبصورت سرورق ہے۔ لیکن ذرا ڈرائیور کو ڈانٹیے۔ لفافے میں سے مضمون نہیں نکلا۔'' میں جھنجلا تو گئی لیکن خیال آیا کہ یہ لکھنے والے ہم آرٹسٹوں سے بھی چار ہاتھ آگے ہوتے ہیں۔ لاچاری سے کہا ''جی جو کام آتا ہے وہ کرتی ہوں۔ بزرگوں سے یہی سیکھا ہے۔''

''کام تو آتا ہی ہے مگر میرا دل کہتا ہے کہ دوسرا کام بھی آتا ہے۔''

چونکہ میرا دل کے معاملے میں پڑھنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا، اس لیے میں نے مزید ٹالنے کے لئے کہا ''اچھا وعدہ۔ اگلے سال کے شمارے کے لئے پیش کروں گی۔'' یقین تھا ایک سال چین سے گذرے گا۔

چند مہینوں بعد کسی تقریب میں، منتظمین سے رشتہ داری کی وجہ سے ابّو کے بارے میں چند باتیں زبانی کہہ دیں۔ ادب کے

جاسوس فوج کے جاسوسوں سے زیادہ طرار اور باخبر ہوتے ہیں۔اظہر جاوید کے کم از کم دس فون آئے۔لاڈ سے لے کر ناراضگی تک کی تمام منزلیں فون پر ہی طے ہوئیں۔جب تک کہ میں نے سقوط ڈھاکہ کی تقلید کرتے ہوئے ہتھیار نہ ڈالے اور تقریر کی نقل اُن تک نہ پہنچی وہ نہ ٹلے۔پھر تو سلسلہ چل نکلا۔اُن کی فرمائشیں اور اصرار موسمِ بہار کی آمد کی علامت بن گئیں۔کبھی فیض اور کبھی آرٹ اور کبھی دونوں۔دو چار حرف ضرور قلمبند کرنے پڑے۔

اظہر جاوید کی وجہ سے اپنے قبیلے کے ساتھ ساتھ اُس دوسرے قبیلے سے بھی دعا سلام رہنے لگی۔اپنی جاہلیت کا تو احساس تھا ہی لیکن اظہر کی شفقت اور سادگی کی وجہ سے پھوہڑ پن کا خوف جاتا رہا۔اُن کے صبر کو بہت آزمایا لیکن پھر بھی رشتہ جُڑا رہا۔''تخلیق'' کی وجہ سے بہت سی بھولی بسری یادیں تازہ ہو جاتیں۔ہمیں بہت کم موقعہ ملتا تھا ابّو کے پاس اطمینان سے بیٹھنے کا۔ان یادوں کو قلمبند کرنے کی وجہ سے بہت سی باتیں ذہن میں دہرائیں......ابّو کے یادوں کا ہجوم، حالات کے تقاضے۔اتنا وقت کہاں ملتا کہ اپنی کوئی بات ہوتی؟ لیکن پھر بھی اُن کی نظریں ہماری زندگیوں پر جمی رہتیں۔ایک مرتبہ اُن کو یوں لگا کہ میں نوکری کے ہاتھوں بہت ہراساں ہوں۔بولے''تم محنت بہت کرتی ہو''......''کیا کروں۔عادت ہے۔مزدوروں کے گھر میں پیدا ہوئی ہوں!''

ابّو نے قہقہہ لگایا اور کہا''ہاں لیکن ہم نے کوئی نوکری پانچ سال سے زیادہ عرصے کے لئے نہیں کی۔5 سال پڑھایا، 5 سال فوج میں رہا، 5 سال صحافت کی، 5 سال آرٹ کونسل، یہاں تک کہ جیل بھی 5 سال ہی کاٹی!''

''اور شاعری؟'' میں نے پوچھا۔مسکرائے اور خاموش رہے۔

میرے اور NCA کے مسائل کے بارے میں سُن کر وہ میرے لئے پریشان تو رہتے تھے مگر اُنہیں یہ بات بہت بھاتی تھی کہ میزو اور میں ان دنوں خود مختار پروفیشنل نہیں لیکن اپنی جگہ ''فیض کی بیٹی'' ہونے کے ناطے نہیں بلکہ اپنی محنت سے بنانی ہے۔کبھی کبھی اُنہیں چھیڑتے ہوئے میں کہتی کہ مجھے کیا معلوم تھا کہ فیض کی بیٹی ہونے کا مطلب مشقّتی ہوتا ہے۔دو چار مربعے ہوتے تو آرام سے گلچھڑے اُڑاتے! ابّو سنتے اور ہنس دیتے۔''

ابّو کے چلے جانے کے بعد مشقّت کم نہیں زیادہ ہوگئی ہے۔2011 میں اُن کی صد سالہ جشنِ ولادت پر احساس ہوا کہ وہ توقعات جو بہت پہلے ہم نے اپنے سے جُدا کر دی تھیں، وہ کم نہیں ہوئیں بلکہ بہت بڑھ گئی ہیں۔فیض کی باتیں، اُن کی سوچ اور اُن کی بے پناہ محبت، نہ صرف اپنی زندگی کا حصہ ہیں بلکہ یہ ہمیں اَن گنت لوگوں سے جوڑتی بھی ہیں۔

فیض نے اپنی زندگی میں لوح و قلم کے علاوہ جو قندیلِ غم اپنائی اُس کی روشنی جب پھیلتی ہوئی نظر آتی ہے تو پھر اُن کی ''لینن امن انعام'' کی تقریر کے آخری جملے یاد آ جاتے ہیں: ''مجھے یقین ہے کہ انسانیت جس نے اپنے دشمنوں سے آج تک کبھی ہار نہیں کھائی، اب بھی فتح یاب ہو کر رہے گی۔اور آخر کار جنگ و نفرت اور ظلم و کدورت کے بجائے ہماری باہمی زندگی کی بنیاد ہی ٹھہرے گی جس کی تلقین اب سے بہت پہلے فارسی شاعر حافظ نے کی تھی۔''

خلل پذیر بود ہر بنا کہ می بینی   مگر بنائے محبت کہ خالی از خلل است

◆◆◆

بسمل صابری

نذرِ فیض احمد فیض

ہم تذکرۂ حُرمتِ فن کرتے رہیں گے
اس طرح بھی تقدیسِ وطن کرتے رہیں گے

اے صبحِ وطن تیری لگن کرتے رہیں گے
ہر دَور میں ہم اہلِ سُخن کرتے رہیں گے

ڈھل جائے نئے دن میں ایسی کوئی خوشبو
وہ جس سے معطر یہ بدن کرتے رہیں گے

اِک جہدِ مُسلسل جو بنے جذبۂ تعمیر
خوشحال ترے شعلہ سُخن کرتے رہیں گے

ہر چند خلشِ طولِ مسافت کی ہے پھر بھی
سیراب لہو سے یہ چمن کرتے رہیں گے

ہے اَبرِ گُہر بار شہیدوں کے لہو میں
لفظوں میں رَقم اپنی گھٹن کرتے رہیں گے

یہ دَور بھی بن جائے گا تقدیر ہماری
شاداب تیرے دشت و دَمن کرتے رہیں گے

یہ کھیت یہ کھلیان یہ گھر اور یہ گلیاں
روشن یہ گلستانِ وطن کرتے رہیں گے

جب قوم کے خوابوں کی بھی تعمیر ہو بسملؔ
دھڑکن کو بھی شعروں کی کرن کرتے رہیں گے

◆◆◆

ادارہ 'تخلیق' نے قارئین کی پرزور فرمایش پر لفظوں کا پوائنٹ سائز چھوٹا کیا ہے۔ اس پہ اپنی رائے ''انجمنِ خطوط'' میں لکھ کر بھیجیں۔ (ادارہ 'تخلیق')

ممتاز شیریں: اُردو کی پہلی نقاد خاتون

ابنِ سلطان

احباب ہی نہیں تو کیا زندگی حفیظؔ
دنیا چلی گئی مری دنیا لیے ہوئے

ممتاز شیریں نے فنِ افسانہ نگاری، ترجمہ نگاری اور تنقید کے شعبوں میں جو گراں قدر خدمات انجام دیں ان کا ایک عالم معترف ہے۔ ان کی تخلیقی اور تنقیدی کامرانیوں سے اُردو ادب کی ثروت میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ سچ تو یہ ہے کہ ندرتِ تخیل، اسلوب کی انفرادیت، فکر پرور اور بصیرت افروز تجزیاتی مطالعہ کو جس فن کارانہ مہارت سے انھوں نے اپنی تحریروں کو مزّین کیا، وہ انھیں ایک ممتاز مقام عطا کرتا ہے۔ ایک بلند پایہ نقاد کی حیثیت سے انھوں نے مقدور بھر کوشش کی کہ افکارِ تازہ کی اساس پر جہانِ تازہ کا قصرِ عالی شان تعمیر کیا جائے۔ وہ ایک وسیع القلب اور فراخ دل تخلیق کار اور زیرک نقاد تھیں۔ ادبی تخلیقات کے محاسن اور معائب پر ان کی گہری نظر رہتی تھی۔ ان کی تحریریں اس عالم آب و گل کے جملہ مظاہر اور معاملات کے بارے میں زندگی کی حقیقی معنویت کو سامنے لاتی ہیں۔ معاشرتی زندگی ہو یا کائنات کے غیر مختتم مسائل سب کے بارے میں ممتاز شیریں کا اندازِ فکر ہمہ گیر نوعیت کا رہا۔ اپنے محاکمے سے وہ اچھائی اور برائی میں موجود حدِ فاصل کے بارے میں قاری کو مثبت شعور و آگہی سے متمتع کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہیں۔ زندگی کی آفاقی اور حیات آفریں اقدار کے تحفظ، ارتقا اور بقا کو وہ دل و جاں سے عزیز رکھتی تھیں۔ اُردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے ان کی خدمات تاریخِ ادب کا ایک اہم باب ہیں۔

ممتاز شیریں کے والد کا نام قاضی عبدالغفور تھا۔ وہ اپنے عہد کے ممتاز عالم تھے۔ عربی اور فارسی زبان پر انھیں دسترس حاصل تھی۔ ممتاز شیریں 12 ستمبر 1924ء کو اپنے آبائی وطن بنگلور میں پیدا ہوئیں۔ ان کے نانا ٹیپو قاسم خان نے اپنی اس نواسی کو تعلیم و تربیت کی خاطر اپنے پاس میسور بلا لیا۔ اس طرح وہ بچپن ہی میں اپنے ننھیال میں رہنے لگیں۔ ممتاز شیریں کے نانا اور نانی نے اپنی اس ہونہار نواسی کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی۔ ممتاز شیریں ایک فطین طالبہ تھیں انھوں نے 13 برس کی عمر میں میٹرک کا امتحان درجۂ اول میں امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔ ان کے اساتذہ ان کی قابلیت اور خداداد صلاحیتوں کے معترف تھے۔ 1941 میں ممتاز شیریں نے مہارانی کالج بنگلور سے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ 1942 میں ممتاز شیریں کی شادی صمد شاہین سے ہو گئی۔ ممتاز شیریں نے 1944 میں اپنے شوہر صمد شاہین سے مل کر بنگلور سے ایک ادبی مجلّے ''نیا دور'' کی اشاعت کا آغاز کیا۔ اس رجحان ساز ادبی مجلّے نے جمود کا خاتمہ کیا اور مسائل ادب اور تخلیقی محرکات کے بارے میں چشم کشا صداقتیں سامنے لانے کی سعی کی گئی۔ ممتاز شیریں نے زمانۂ طالب علمی ہی سے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا لیا۔ ان کی سنجیدگی، فہم و فراست، تدبر و بصیرت اور وسیع مطالعہ نے انھیں سب کی منظورِ نظر بنا دیا۔ ہر جماعت میں وہ اوّل آتیں اور ہر مضمون میں

امتحان میں وہ سرفہرست رہتیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد ممتاز شیریں کا خاندان ہجرت کر کے کراچی پہنچا۔ کراچی آنے کے بعد ممتاز شیریں نے اپنے ادبی مجلّے ''نیا دور'' کی اشاعت پر توجہ دی اور کراچی سے اس کی باقاعدہ اشاعت کا آغاز کیا لیکن 1952 میں ممتاز شیریں اپنے شوہر کے ہمراہ بیرونِ ملک چلی گئیں اور یوں یہ مجلّہ اس طرح بند ہوا کہ پھر کبھی اس کی اشاعت کی نوبت نہ آئی۔ ادبی مجلّہ ''نیا دور'' ممتاز شیریں کی تنقیدی بصیرت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ پاکستان آنے کے بعد ممتاز شیریں نے جامعہ کراچی میں داخلہ لیا اور انگریزی ادبیات میں ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ جامعہ کراچی سے ایم۔ اے انگلش کرنے کے بعد ممتاز شیریں برطانیہ چلی گئیں اور آکسفورڈ یونیورسٹی میں جدید انگریزی تنقید میں اختصاصی مہارت فراہم کرنے والی تدریسی کلاسز میں داخلہ لیا اور انگریزی ادب کے نابغۂ روزگار نقادوں اور ادیبوں سے اکتسابِ فیض کیا اور انگریزی ادب کا وسیع مطالعہ کیا۔ ممتاز شیریں کی دلی تمنا تھی کہ آکسفورڈ یونیورسٹی میں ان کی تعلیم جاری رہے اور وہ اس عظیم جامعہ سے ڈاکٹریٹ (ڈی۔ فل) کریں لیکن بعض ناگزیر حالات اور خاندانی مسائل کے باعث وہ اپنا نصب العین حاصل نہ کر سکیں اور انھیں اپنا تعلیمی سلسلہ منقطع کر کے پاکستان واپس آنا پڑا۔ جس کا انھیں عمر بھر قلق رہا۔

ممتاز شیریں نے 1942 میں تخلیق ادب میں اپنے سفر کا آغاز کیا۔ ان کا پہلا افسانہ ''انگڑائی'' ادبی مجلّہ ''ساقی'' دہلی میں 1944 میں شائع ہوا تو ادبی حلقوں میں اسے زبردست پذیرائی ملی۔ اس افسانے میں ممتاز شیریں نے فرائڈ کے نظریہ تحلیل نفسی کو جس مؤثر انداز میں پیشِ نظر رکھا ہے وہ قاری کو مسحور کر دیتا ہے۔ افسانہ کیا ہے عبرت کا ایک تازیانہ ہے۔ ایک لڑکی بچپن میں اپنی ہی جنس کی ایک دوسری عورت سے پیمانِ وفا باندھ لیتی ہے۔ جب وہ بھرپور شباب کی منزل کو پہنچتی ہے تو اس کے مزاج اور جذبات میں جو مدوجزر پیدا ہوتا ہے وہ اسے مخالف جنس کی جانب کشش پر مجبور کر دیتا ہے۔ جذبات کی یہ کروٹ اور محبت کی یہ انگڑائی نفسیاتی اعتبار سے گہری معنویت کی حامل ہے۔ بچپن کی ناپختہ باتیں جوانی میں جس طرح بدل جاتی ہیں، ان کا حقیقت پسندانہ تجزیہ اس افسانے کا اہم موضوع ہے۔ یہ افسانہ ممتاز شیریں کے پہلے افسانوی مجموعے ''اپنی نگریا'' میں شامل ہے۔ وقت کے ساتھ خیالات میں جو تغیر و تبدل ہوتا ہے وہ قاری کے لیے ایک انوکھا تجربہ بن جاتا ہے۔ یہ تجربہ جہاں جذباتی اور نفسیاتی اضطراب کا مظہر ہے وہاں اس کی تہہ میں روحانی مسرت کے منابع کا سراغ بھی ملتا ہے۔ وہ ایک مستعد اور فعال تخلیق کار تھیں۔ ان کے اسلوب کو علمی و ادبی حلقوں نے ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا۔

1954ء میں ہالینڈ کے دارالحکومت ہیگ میں ایک بین الاقوامی ادبی کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ اس عالمی ادبی کانفرنس میں عالمی ادب اور انسانیت کو درپیش مسائل کے بارے میں وقیع مقالات پیش کیے گئے۔ ممتاز شیریں کو اس عالمی ادبی کانفرنس میں پاکستان کی نمائندگی کا اعزاز حاصل ہے۔ اس عالمی ادبی کانفرنس میں ممتاز شیریں نے دنیا کے نامور ادیبوں سے ملاقات کی اور عالمی ادب کے تناظر میں عصری آگہی کے موضوع پر ان کے خیالات کو سمجھنے کی کوشش کی۔ ادب کو وہ زندگی کی تنقید اور درپیش صورتِ حال کی اصلاح کے لیے بہت اہم سمجھتی تھیں۔ ممتاز شیریں کو 1972ء میں پیٹ کے سرطان کا عارضہ لاحق ہو گیا۔ مرض میں اس قدر شدت آ گئی کہ 11 مارچ 1973ء کو پولی کلینک اسلام آباد میں وہ انتقال کر گئیں۔ اُردو افسانے اور تنقید کے اس آسمان کو اسلام آباد کی زمین نے اپنے دامن میں چھپا لیا۔ ممتاز شیریں کی وفات سے اُردو تنقید کا ایک درخشاں باب ختم ہو گیا۔ اُردو کی پہلی خاتون نقاد سے ہم محروم ہو گئے۔ تانیثیت (Feminism) کی علم بردار، حرفِ صداقت لکھنے والی اس باکمال، پرعزم، فطین اور جری تخلیق کار کی موت نے اُردو ادب کو ناقابلِ اندمال صدمے سے دوچار کر دیا۔

اپنی تخلیقی کامرانیوں سے ممتاز شیریں نے اُردو دنیا کو حیرت زدہ کر دیا۔ رنگ، خوشبو اور حسن و خوبی کے تمام استعارے ان کے توانا اور ابدآشنا اسلوب میں سمٹ آئے تھے۔ ان کی تمام تحریریں قلب اور روح کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر جانے والی اثر آفرینی سے لبریز تھیں۔ ممتاز شیریں کی درج ذیل تصانیف انھیں شہرت عام اور بقائے دوام کے دربار میں بلند مقام پر فائز کریں گی۔

(1) اپنی نگریا (افسانوں کا مجموعہ): اسے مکتبہ جدید لاہور نے پہلی مرتبہ ستمبر 1947ء میں شایع کیا۔ اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے۔

(2) میگھ ملہار (طویل افسانوں پر مشتمل مجموعہ): یہ لارک پبلشرز کراچی کے زیراہتمام پہلی مرتبہ 1962ء میں شائع ہوا۔

(3) معیار: یہ کتاب ممتاز شیریں کے تنقیدی مقالات پر مشتمل ہے۔ اُردو میں فرائڈ کے نظریہ تحلیل نفسی کو اس تنقید میں پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔

(4) دُرِشہوار: یہ ممتاز شیریں کے ترجمہ کی بلند پایہ کتاب ہے۔ اس میں انھوں نے جان آسٹن کے مشہور ناول ''دی پیرل'' کو اُردو زبان کے قالب میں ڈھالا ہے۔ ممتاز شیریں کا عالمانہ تحقیقی مقالہ بھی اس ترجمے میں شامل ہے جس میں انھوں نے امریکی ناول کے ارتقا پر تحقیقی نگاہ ڈالی ہے۔ اُردو میں فکشن پر تنقید اور تحقیق کا یہ اعلیٰ معیار پیش کرتی ہے۔ یہ ترجمہ مصنف کی اصل کتاب سے قریب ترین ہے۔

(5) امریکی کہانیاں: یہ بھی تراجم پر مشتمل کتاب ہے۔ ممتاز شیریں نے اس کتاب میں امریکی مختصر افسانوں کے اُردو تراجم پیش کیے ہیں۔ ان تراجم میں انھوں نے تخلیق کی چاشنی کو اس طرح سمو دیا ہے کہ قاری ان کے اسلوب کی کشش کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ ان تراجم کے ساتھ ساتھ ممتاز شیریں نے امریکی افسانہ نگاروں کے اسلوب اور تخلیقات کے فنی پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ممتاز شیریں کے یہ تنقیدی مضامین اور تجزیے جو نہایت جامع اور برمحل ہیں ان کے مطالعہ سے قاری پر فن افسانہ نگاری کے متعدد پہلو واضح ہو جاتے ہیں۔ افسانوں پر ممتاز شیریں کی تنقید اپنی جگہ ایک مستقل افادی نوعیت رکھتی ہے۔

اُردو ادب میں حریتِ فکر کی روایت کو پروان چڑھانے میں ممتاز شیریں کا کردار بہت اہمیت کا حامل ہے۔ وہ عجز و انکسار اور خلوص کا پیکر تھیں۔ ''ظلمتِ نیم روز'' ہو یا ''منٹو نوری نہ ناری'' ہر جگہ اسلوبیاتی تنوع کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ قدرت اللہ شہاب اور محمود ہاشمی کے اسلوب کو وہ قدر کی نگاہ سے دیکھتی تھیں۔ قدرت اللہ شہاب کی تصنیف ''یا خدا'' اور محمود ہاشمی کی تصنیف ''کشمیر اُداس ہے'' کا پیش لفظ جس گہری معنویت کے ساتھ ممتاز شیریں نے لکھا ہے وہ ان کی تنقیدی بصیرت کے ارفع معیار کی دلیل ہے۔ وطن اور اہلِ وطن کے ساتھ قلبی لگاؤ اور والہانہ محبت ان کے قلب، جسم اور روح سے عبارت تھی۔ ابتدا میں اگرچہ وہ کرشن چندر کے فنِ افسانہ نگاری کی مداح رہیں مگر جب کرشن چندر نے پاکستان کی آزادی اور تقسیمِ ہند کے موضوع پر افسانوں میں کانگریسی سوچ کی ترجمانی کی تو ممتاز شیریں نے اس اندازِ فکر پر نہ صرف گرفت کی بلکہ اسے ناپسند کرتے ہوئے تقسیمِ ہند کے واقعات اور ان کے اثرات کے بارے میں کرشن چندر کی رائے سے اختلاف کیا۔ ممتاز شیریں نے اُردو ادب میں منٹو اور عصمت چغتائی پر جنس کے حوالے سے کی جانے والی تنقید کو بلاجواز قرار دیتے ہوئے ان کے اسلوب کو بہ نظرِ تحسین دیکھا۔ ممتاز شیریں کا تنقیدی مسلک کئی اعتبار سے محمد حسن عسکری کے قریب تر دکھائی دیتا ہے۔ سب کے ساتھ اخلاق اور اخلاص سے لبریز ان کا سلوک ان کی شخصیت کا امتیازی وصف تھا۔ ان کے اسلوب کی بے ساختگی اور بے تکلفی اپنی مثال آپ ہے۔ زبان

و بیان پر ان کی خلاقانہ دسترس اور اسلوب کی ندرت کے اعجاز سے انھوں نے ادب، فن اور زندگی کو نئے آفاق سے آشنا کیا۔ ان کے ہاں فن کار کی انا، سلیقہ اور علم و ادب کے ساتھ قلبی لگاؤ، وطن اور اہلِ وطن کے ساتھ والہانہ وابستگی کی جو کیفیت ہے وہ انھیں ایک اہم مقام عطا کرتی ہے۔ ادب کو انسانیت کے وقار اور سربلندی کے لیے استعمال کرنے کی وہ زبردست حامی تھیں۔ انھوں نے داخلی اور خارجی احساسات کو جس مہارت سے پیرایۂ اظہار عطا کیا ہے وہ قابلِ غور ہے۔ اپنے ایک مضمون میں ممتاز شیریں نے اپنے اسلوب اور تخلیقی محرّکات کی صراحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''مجھ میں فن کار کی انا سہی لیکن اتنا انکسار تو ضرور ہے کہ یہ محسوس کر سکوں کہ بڑے ادیبوں کے سامنے ہم کتنے چھوٹے ہیں اور فن کار کے ارتقا اور تکمیل تک پہنچنے میں ہمیں ابھی کتنے اور مرحلے طے کرنے ہیں۔ میں اپنے بارے میں صرف یہ کہہ سکتی ہوں کہ پہلے درجے سے گزر کر میں نے دوسرے میں قدم رکھا ہے اور اپنی ذات میں نارسیسی، انہماک پر بڑی حد تک قابو پا لیا ہے۔'' (آغا بابر: ''حرفِ سوگوار'' مضمون مشمولہ مجلّہ ''سیپ'' کراچی، شمارہ 55، جنوری 1990ء، صفحہ 304)

ممتاز شیریں کو انگریزی، اردو، عربی، فارسی اور پاکستان کی متعدد علاقائی زبانوں کے ادب پر دسترس حاصل تھی۔ عالمی کلاسیک کا انھوں نے عمیق مطالعہ کیا تھا۔ زندگی کے نت نئے مطالب اور مفاہیم کی جستجو ہمیشہ ان کا مطمعِ نظر رہا۔ اپنی تخلیقی تحریروں اور تنقیدی مقالات کے معجز نما اثر سے وہ قاری کو زندگی کے مثبت شعور سے متمتع کرنے کی آرزومند تھیں۔ ان کی تخلیقی اور تنقیدی تحریریں یدِ بیضا کا معجزہ دکھاتی ہیں اور حیات و کائنات کے ایسے متعدد تجربات جن سے عام قاری بالعموم ناآشنا رہتا ہے۔ ممتاز شیریں کی پُر تاثیر تحریروں کے مطالعے کے بعد وہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ سب کچھ تو گویا پہلے ہی سے اس کے نہاں خانۂ دل میں جاگزیں تھا۔ اس طرح فکر و خیال کی دنیا میں ایک انقلاب رونما ہوتا ہے جس کی وجہ سے قاری کے دل میں ایک ولولۂ تازہ پیدا ہوتا ہے۔

ترجمے کے ذریعے وہ دو تہذیبوں کو قریب تر لانا چاہتی تھیں۔ تراجم کے ذریعے انھوں نے اُردو زبان کو نئے جذبوں، نئے امکانات، نئے مزاج اور نئے تخلیقی محرکات سے روشناس کرانے کی مقدور بھر کوشش کی۔ ان کے تراجم کی ایک اہم اور نمایاں خوبی یہ ہے کہ ان کے مطالعہ کے بعد قاری ان کے تخلیق کار کی روح سے ہم کلام ہو جاتا ہے۔ مترجم کی حیثیت سے وہ پسِ منظر میں رہتے ہوئے قاری کو ترجمے کی حقیقی روح سے متعارف کرنے میں کبھی تامل نہیں کرتیں۔ ان کے تراجم سے اُردو کے افسانوی ادب کی ثروت میں اضافہ ہوا اور فکر و خیال کو حسن و دل کشی اور لطافت کے اعلیٰ معیار تک پہنچانے میں کامیابی ہوئی۔ افسانوی ادب کی تنقید میں ممتاز شیریں کا دبنگ لہجہ ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ گزشتہ آٹھ عشروں میں لکھی جانے والی اردو تنقید پر نظر ڈالیں تو کوئی بھی خاتون نقاد دکھائی نہیں دیتی۔ ممتاز شیریں نے اردو تنقید کے دامن میں اپنی عالمانہ تنقید کے گوہرِ نایاب ڈال کر اسے عالمی ادب میں مغرور و مفتخر کر دیا۔ زندگی کی صداقتوں کو اپنے اسلوب کی حُسن کاریوں سے مزّین کرنے والی اس عظیم ادیبہ کے تخلیقی کارنامے تاریخ ادب میں آبِ زر سے لکھے جائیں گے اور تاریخ ہر دور میں ان کے فقید المثال اسلوب لائق صد رشک و تحسین کام اور عظیم نام کی تعظیم کرے گی۔

◆◆◆

ڈاکٹر وزیر آغا

غنودگی

غنودگی کو اوڑھ کر وہ سو گئے
تو خواب پھڑ پھڑا کے جاگنے لگے
غنودگی کا سائباں جھکا ہوا تھا چار سُو
مگر وہ خواب بھی عجیب تھے
کہ سائباں کو تار تار کر گئے
عجیب گول ہیئتوں میں ڈھل گئے
زمیں سے اُڑ کے، آسماں کی سمت
دُور دُور تک گئے
کہاں گئے، پتہ نہیں
وہ خواب تھے
وہ آسماں کا رزق تھے...... چلے گئے

O

غنودگی کہاں ہے اب
غنودگی خمار تھی، خمار خواب لے گئے
غنودگی جو بچ گئی
وہ ہولے ہولے بجھ گئی
زمیں کا رزق بن گئی

OOO

شہزاد احمد

نا آشنا

کہاں تک ساتھ دے سکتی ہیں آنکھیں
یہ منظر کیسی تیزی سے بدلتے جا رہے ہیں
اگر ہم آنکھ جھپکیں
کتنے عالم بیت جاتے ہیں
اگر سو جائیں تو لگتا ہے
ہم نے اَن گنت صدیاں گنوا دیں
ہم نے وہ شمعیں بجھا دیں
روشنی جن کی کئی قرنوں سے آئی تھی

....

جہاں تک دیکھنے کی ہم میں طاقت ہے
وہاں سے بھی نئے افلاک کا آغاز ہوتا ہے
جہاں ہم تم ختم کرتے ہیں کہانی
اس جگہ بھی
اک نئے قصّے، نئی روداد کا امکان ہوتا ہے
جہاں کچھ بھی نہیں رہتا
وہاں تکوین کا سامان ہوتا ہے
کوئی ارمان ہوتا ہے
حقیقت جس کو بننے میں کوئی مشکل نہیں ہوتی

....

عجب اک سلسلہ ہے
سلسلہ در سلسلہ ہے
اور ہم چھوٹے سے سیّارے میں بیٹھے ہیں
سمجھتے ہیں کہ ان پہنائیوں کا مدعا ہم ہیں
مگر اُن وسعتوں کے سحر سے نا آشنا ہم ہیں

OOO

حسن عسکری کاظمی

دشتِ بے خواب

گل کی پازیب چھنکتی ہے سرِ راہِ خیال
مندمل ہو گئے سب زخمِ اسیری جیسے
پھر نہ یوں پہنے کوئی طوقِ گراں بار گیا
پھر نہ یوں خارِ مغیلاں پہ چلا آبلہ پا
پھر نہ زنجیر کی جھنکار فضا میں گونجی
دشتِ بے خواب کا منظر ہے نظر میں اب تک
پھر کوئی آیا نہ جھلسی ہوئی ویرانی میں

O

میں وہ دیوانہ کہ ہوں چاک گریباں کب سے
اپنی منزل کی خبر جس کو نہ رستے کا پتہ
میں سخنور ہوں فقط سوزِ دروں کا طالب
ایک خواہش کہ ملے نقشِ کفِ پا اس کا
سجدۂ شوق ادا کر کے میں ڈھونڈوں اس کو
دل یہ کہتا ہے مری راہ وہ تکتا ہو گا
اس کی پلکوں سے لہو آج بھی گرتا ہو گا
منزلِ درد میں وہ آج بھی تنہا ہو گا

OOO

انور سدید

نیا شہر

مجھے یاد ہے
رائیگانی کے گہرے سمندر میں
جب میں نے اکتارہ اپنا بجایا
تو اس نغمۂ جاں فزا سے
مقامات......آہ و فغاں کے ابھارے
مضامینِ نو کے شرارے جگائے
مٹا ڈالا......احساس سب رائیگانی کا
سمندر کی تہہ سے
نیا شہر اُبھارا

....

قطعہ

آفاتِ زمانہ کی یورش رہی ہے لیکن
آٹھ عشروں میں دنیا کے سب ذائقے ہیں چکھے
اب اپنے زبوں جسم کا کچھ فکر نہیں مجھ کو
ہر حال میں خوش ہوں میں، جس حال میں رب رکھّے

OOO

ناصِر زیدی

تین مصرعوں کی نظمیں

O

چال اُس کی عجب قیامت ہے
اُس کو جاتے ہوئے جو تکتا ہوں
اُس کے آنے کو بُھول جاتا ہوں

O

مرمریں نیلگوں ہے اُس کا بدن
پیاسی نظروں میں ڈوب جاتا ہے
کس قدر اشتہا بڑھاتا ہے

O

لال شلوار دھانی ہے چُنری
رُخ پہ اک سادگی نکھار کے ساتھ
سج رہی ہو بڑے وقار کے ساتھ

O

ایک سورج تھا میرے پہلو میں
دوسرا، دوسرے کنارے پر
آگ سی لگ رہی تھی پانی میں!

OOO

علیم صبا نویدی (انڈیا)

نظمیں

دیر و حرم کے بیچ
وہ فاصلہ ہے جس کو نہ طے کر سکا کوئی
کاغذ، قلم کے بیچ

O

صد چاک آرزو
لے جائیں گے کیا قبر تلک، پھینک دیجیے
ناپاک آرزو

O

سرسبز کونپلیں
موسم بہار کا ہے کہ کلیاں اُداس ہیں
تفریح کیا کریں

O

پوشیدہ صورتیں
اُتری ہیں آسمانی حدیں آج توڑ کر
نادیدہ صورتیں

O

وہ بڑا چالاک تھا
اُس کے ہر اک کھیل کی اونچی اُڑان
سینۂ صد چاک تھا

O

موجوں کا قافلہ
لے جائے گا بہا کے مُجھے
سنسان سلسلہ

OOO

سلیم شہزاد

اندر مویا رہتا ہے

اندر والے سارے جذبے
اندر والی باتیں
گِھن آتی ہے جن باتوں سے
وہ بھی ساری باتیں
گُھن کھاتا ہے جن باتوں کو
وہ بھی ساری باتیں
ایک آس کی ٹہنی پہ سب
چپکے چپکے چپکا ہے
آس کی تنہا ٹہنی بھی اب
روتے روتے کہتی ہے
اندر والی ساری باتیں
اندر والے سارے جذبے
سن ہو جاتا ہے
سب کچھ
گِھن بس آتی رہتی ہے
گُھن جو کھاتا رہتا ہے
تنہا روگ بتانے سے
جذبہ سویا رہتا ہے
اندر مویا رہتا ہے

OOO

سجاد مرزا

وہ اُداس شب تھی، عجیب شب

کبھی اپنا دل جو حزیں ہُوا
تری جستجو میں نکل پڑے!
کہیں ساتھ ظلمتِ شب چلی
کہیں سر پہ دُودِ غبار تھا!

کہیں دُور تارے بجھے بجھے
کہیں سایہ سایہ کھڑے شجر
کہیں ٹھوکروں میں پڑے حجر

کہیں بے کرانی کی وُسعتیں
کہیں موڑ موڑ پہ دہشتیں!

وہ اُداس شب تھی عجیب شب
ترے غم کی اوس میں بھیگ کر
تری یاد، سوچ میں ڈھال کر
کوئی درد دِل میں جگا لیا!
اسی تیرگی کے غبار کو
تیری رہ گزار بنا لیا!

OOO

سرور حسین (انڈیا)

''تو جو آ جائے تو......''

عمر کا سیلِ رواں ہے کہ ٹھہرتا ہی نہیں
وقت کے پنجۂ بے رحم سے ہے کس کو مفر
ایک بے رنگ سفر
میری آنکھوں کی سیاہی مرے چہرے کی شکن
ڈھونڈتی ہے
وہ نئی عمر، شرارت
وہ حسیں شام وسحر
وہ جواں خواب، وہ بے چین نظر
کوئی حسرت، کئی بے کار سوال
تیرے کوچے سے گزرنے کا خیال
دل دھڑکنے کے جو اسباب ہوا کرتے تھے
کب بھلا لوٹ کر آ پائے ہیں کہ اب
لوٹ بھی آئیں گے وہ بیتے ہوئے پل
پھر بھی کیوں دل میں وہ آتا ہے اک بے ربط خیال
وہ رُکی بات بیاں ہو جائے
کوئی صورت ہی کہیں اب جو عیاں ہو جائے
دل کے ویرانہ میں کچھ رنگ بکھر سکتا ہے
میری صورت نہ سہی دل تو سنور سکتا ہے
تو جو آ جائے تو پھر وقت بدل سکتا ہے

OOO

سلطان کھاروی

ماہیے

تتلی ہے چناروں میں
تجھ کو یاد کرے
ہر پھول بہاروں میں

O

کوٹھے پہ کاگ آیا
یاد جدائی میں
مجھے دیپک راگ آیا

O

پائل میں گیت نہیں
جب سے گھر مورے
وہ من کے میت نہیں

O

اک بلبل چہکے ہے
ساجن تجھ سے ہی
یہ گلشن مہکے ہے

O

ہنسی کی لے ماہی
تیرا ہونا ہے
میری اک اک شے ماہی

O

اک پھول کی پتیاں ہیں
اُجلا دن تو ہے
میری کالی رتیاں ہیں

OOO

خالد ناز

تڑپ

خالقِ کون ومکاں
تیری عظمت کے نشاں
بے حساب وبیکراں
کچھ بظاہر، کچھ نہاں
از زمیں تا آسماں
رنگ ہیں کوسوں یہاں
'مالکِ کون ومکاں'
ایسے بھی کچھ انس وجاں
جن کو ہوتا ہے گماں
تو کہ رہتا ہے کہاں
کس طرف تیرا مکاں
وسوسوں کے درمیاں
اس قدر ہیں بدگماں
گنگ ہے ان کی زباں
اور حیرت میں دھیاں
دیکھتے ہیں گو یہاں
موسموں کا یہ سماں
یہ بہاریں اور خزاں
چلچلاتی گرمیاں
'خوں جماتی سردیاں'
آتی جاتی بدلیاں
کڑکڑاتی بجلیاں
گنگناتی ندیاں
مضطرب ونغمہ خواں
مچھلیاں ان میں رواں
کشتیوں کے بادباں
باندھتے ہیں اک سماں
وادیوں کے درمیاں
لہلہاتی کھیتیاں
رنگ برنگی تتلیاں
آسماں پہ پرفشاں
اک ہجومِ طائراں
کچھ مکینِ آشیاں
بولتے اپنی زباں
گیت گاتے سارباں
چاند تارے ضوفشاں
مرغزاروں کی 'اذاں'
دھوپ، صحرا، چوٹیاں
رنگ برنگ پہاڑیاں
نیلی، پیلی دھاریاں
برف کی چنگاریاں
دلنشیں گلکاریاں
رنگ بدلتا آسماں
تندیِ آتش فشاں
چارسو پھیلا دُھواں
پیچ وتابِ ساحلاں
مستعد جہازراں
بحری سفروں پر رواں
اونچی اونچی چمنیاں
پھیلتا ان پہ دُھواں
آہنگِ سمندراں
نغمۂ بحروبیاں
سرسراتی آندھیاں
رُخ بدلتی دھوپ چھاں
ہر شجر ہے قصہ خواں
پھل اُٹھاتی ڈالیاں
شان میں رطب اللساں
ہر گھڑی اور ہر زماں
لے اٹھاتی ہے اذاں
'اِک وہی اللہ میاں'
کانپ اُٹھتا ہے رُواں
وَجد کرتے روح وجاں
منہمک پیر وجواں
حرمتوں کے پاسباں
فطرتوں کے رازداں
ان کے ماتھے پر عیاں
سجدہ گاہوں کے نشاں
سلسلۂ رت جگاں
نسخہ ہائے کاملاں
میٹھی میٹھی بولیاں
سب حقوقِ بندگاں
ہر طرف امن واماں
چرخِ نیلی کی کماں
اس کی بلندی 'الاماں'
جیسے اک گہرا کنواں
'تحت الثریٰ تا لامکاں'
فاصلے کوہ گراں
کہکشاں در کہکشاں
ان گنت 'سیارگاں'
جھمگٹوں کا کارواں
اپنے محور پر رواں
پیہم رواں، ہر دم جواں
عقلِ انساں گم یہاں
غور کر اے بے گماں
جو بھی شے ہے بے زباں
بولتی ہے ہاں کہ ناں!
تیرے اندر کا جہاں
رابطۂ جسم وجاں
اک مرتّب داستاں
خود ہی کرتا ہے بیاں
سب حقیقت ہے عیاں
تو کدھر ہے سرگراں
اب تو کہنے دے کہ ہاں
کوئی مشکل ہی نہیں پہچاننے کے
واسطے
تو تڑپتا ہے مگر، نہ ماننے کے واسطے

OOO

آفتاب خان

گزارش

کسی دن آ کے دیکھو تم
ہُوا ہے حال کیا دل کا
بہت دن سے لگے ایسا
کہ تم آنے ہی والی ہو
یہی کچھ سوچ کر میں بھی
بہت مسرور رہوتا ہوں
مرے اطراف کے منظر
بہت مسحور کن ہیں اب
مرے کانوں میں راتوں کو
تمہاری پائلیں چھنکیں
کوئی جھونکا ہواؤں کا
مری کھڑکی سے ٹکرائے
تو یہ محسوس ہوتا ہے
کہ تم نزدیک ہو میرے
مرے آنگن کا ویرانہ
ڈھلا جاتا ہے خوشبو میں
نئی کلیاں مہکتی ہیں
مری گلیاں لہکتی ہیں
خزاں میں بھی بہاراں ہے
نظارے مسکراتے ہیں
کسی ایسے ہی موسم میں
کیا تھا تم نے اک وعدہ
کسی دن آ کے ملنے کا
وہی وعدہ نبھا جاؤ
چلو تم اب تو آ جاؤ
بٹھا کر سامنے تم کو
فقط دیدار کرنا ہے
مجھے حد سے نہیں بڑھنا
نظر سے پیار کرنا ہے
مری بس یہ گزارش ہے
مجھے خود میں چھپا لو تم
مجھے اپنا بنا لو تم

OOO

اقبال گرامی (انڈیا)

قطعہ

کچھ دور جسے حسرتِ مقبول لے گئی
طوفانِ آرزو میں جواں بھول لے گئی
باقی تھی جس کے دم سے گلستاں کی آبرو
بادِ خزاں چُرا کے وہی پھول لے گئی

OOO

ثروت زہرا (شارجہ)

وہ جنہیں آسماں کھا گیا!!

ہر آہٹ اور ہر دستک پر
یوں لگتا ہے
وہ آیا ہے
ہانڈی میں مٹھی بھر چاول کم ہیں لیکن
سورج کے گھٹنے بڑھنے کی لک چھپ میں
آنگن میں یہ کس کا سایہ ہے؟
آئینے کی ہر سلوٹ میں
آنکھوں کے ہر اک دیپک میں
جلتی بجھتی کیا مایا ہے؟
جسم و روح کی ٹھنڈی مٹی
چپ سے لپی تیری اٹّی
میں جانوں! چوکھٹ سے چادر کے کونے تک
سارے منظر آس سمیٹے گُنگ کھڑے ہیں
بچے بالے گھر کے کونوں کھدروں میں سے
میری آس کے سنگ کھڑے ہیں
رنگوں رنگی باسی چُنری میں امیدوں کے سو سو رنگ
چڑھے ہیں
گم ہونے والے کے ہر سُو رنگ پڑے ہیں
ہاں سے نہیں تک!
دھرتی کے بازاروکوچے ننگ کھڑے ہیں

OOO

نیّر رانی شفق

نئے سال کا سورج

نئے سال کا روشن سورج
در پہ میرے دستک دینے آیا ہے
اُمیّدوں کے تحفے لے کر
ہر آنگن میں جائے گا
بجھی بجھی سی آنکھوں میں
پھر سے جوت جگائے گا
نفرت، غربت، آگ اور خون
پچھلے برس کی فصلیں تھیں
ان فصلوں کو آگ لگا کر
دولتِ دین اور مہر و وفا کی
اب فصلیں کاشت کرائے گا
نئے سال کا روشن سورج
سب کو کہنے آیا ہے
ارضِ وطن کے سچے لوگو!
علم و عمل کے پھولوں سے
اب ہر گھر کو مہکانا ہے
آنگن آنگن پھول کھلا کر
تن من کو مہکائے گا
شفق، دھنک، مہتاب، ضیا سے
دیس کی مانگ سجائے گا
نئے سال کا روشن سورج

OOO

مٹی کی مہک

ڈاکٹر رشید امجد

چار کمروں کا یہ گھر، گھر کہلاتا ہے لیکن گھر نہیں ہے، بس گھر جیسا ہے۔ پہلے ذرا بڑے کمرے میں بڑا بیٹا، اس کی بیوی اور تین سالہ بیٹی رہتے ہیں، دوسرے کمرے میں چھوٹا بیٹا، اس کی بیوی اور دو سالہ بیٹا ہے، تیسرے کمرے میں بیٹی ہے جو کسی یونیورسٹی میں پڑھ رہی ہے، چوتھے کمرے میں باپ اور ماں ہیں جو اب تیزی کے ساتھ عمر کی سیڑھیاں اتر رہے ہیں۔ درمیان میں چھوٹا سا لاؤنج ہے جہاں ٹی وی رکھا ہے۔ ایک طرف کھانے کی میز ہے۔ صبح یہاں خوب ہنگامہ ہوتا ہے، آگے پیچھے ناشتہ کرنا، اور دفتروں کی طرف بھاگنا، دونوں بہوئیں بھی اپنے اپنے خاوندوں کے ساتھ صبح صبح ہی گھر سے نکل جاتی ہیں۔ بیٹی ذرا دیر سے اٹھتی ہے۔ اس کی یونیورسٹی کی بس گھر کے قریب سے گزرتی ہے۔ کبھی ناشتہ کر کے، کبھی بغیر ناشتہ کئے وہ بس کے آنے سے چند لمحے پہلے سٹاپ کی طرف بھاگتی ہے، پھر شام تک باپ اور ماں دونوں بچوں کے ساتھ لاؤنج ہی میں رہتے ہیں۔ اخبار پڑھ لیا، ٹی وی دیکھ لیا یا بچوں کے ساتھ ہو ہا کر لی، بس ان کا یہی کام اور یہی مشغلہ ہے۔ دوپہر کا کھانا وہ لاؤنج ہی میں کھاتے ہیں۔ دوپہر کو بچے بھی سو جاتے ہیں اور میاں بیوی بھی، باپ تو صوفے پر ہی لیٹ جاتا ہے، ماں کبھی صوفے پر اور کبھی اپنے کمرے میں جا کر غنودلیتی ہے۔ شام کو پہلے بیٹی، پھر آگے پیچھے بیٹے اور بہوئیں آتی ہیں۔ بہوئیں آتے ہی پہلے اپنے بچوں کو دیکھتی ہیں پھر کچن میں گھس جاتی ہیں۔ کھانا اسی وقت پکتا ہے اور بچا ہوا دوپہر کو کام آتا ہے۔ کمروں اور لاؤنج کی صفائی ہفتہ میں ایک بار چھٹی والے دن ہوتی ہے۔ رات کے کھانے اور صبح ناشتہ کے برتن ماں دھو لیتی ہے۔

یہی اس گھر کا معمول ہے۔ ہفتہ میں دو چھٹیاں ہوتی ہیں ہر مہینے کی پہلی چھٹی کی شام سارے رات کا کھانا باہر کھاتے ہیں۔ ایک مہینے بڑا اور دوسرے مہینے چھوٹا میزبان ہوتا ہے۔ صبح ناشتے کے وقت اور رات کے کھانے کے دوران دو چار جملوں کی گفتگو، پھر اپنے اپنے کمرے، دن بھر بھی دونوں ماں باپ چند جملے ہی بولتے ہیں، البتہ بچے اپنی زبان میں غوں غاں کرتے رہتے ہیں۔ بیٹی سارا دن تو یونیورسٹی میں رہتی ہے، گھر آ کر موبائل یا اپنے کمرے میں رکھے ڈیک سے ہی اس کی توجہ نہیں ہٹتی۔

چار کمروں کے اس گھر میں رہنے والے لوگ، لوگوں جیسے ہیں، ان کی گفتگو، گفتگو جیسی ہے۔ عجب سحر زدہ سی فضا ہے۔ یہ لوگ نہ کسی کے یہاں جاتے ہیں نہ کوئی ان سے ملنے آتا ہے۔ ساتھ والے فلیٹ میں کون رہتا ہے، اوپر، نیچے کون ہے، انہیں کچھ خبر نہیں، زندگی کرنے کا یہ انداز اب اتنا معمول ہو گیا ہے کہ انہیں احساس ہی نہیں کہ اس میں کوئی غیر معمولی پن ہے۔ بیٹوں اور بیٹی نے اسی طرح کے ماحول میں آنکھ کھولی تھی اس لئے ان کے نزدیک کوئی شے غیر معمولی نہیں، البتہ باپ اور ماں کبھی کبھی اداس ہو جاتے ہیں۔ دونوں کا تعلق دیہات سے ہے، وہاں کی کھلی فضاؤں کے منظر ان کے اندر ابھی تک نہیں دھندلائے۔ شہر آئے تو بھی اڑوس پڑوس موجود رہا، گاؤں جیسی

رفاقت، قربت اور اجتماعی حِس تو نہ تھی لیکن پھر بھی کچھ نہ کچھ تو تھا، کئی برس اپنے فلیٹ میں رہتے ہوئے آس پاس کے فلیٹوں کی کچھ نہ کچھ خبر ضرور تھی، آتے جاتے سلام دعا، بچے مل کر نیچے گراؤنڈ میں کھیل آتے، بالکنی میں کھڑے ہو کر پڑوسن سے ایک آدھ مکالمہ بھی ہو جاتا، گاؤں کے مقابلے میں یہ خاصی اجنبی صورت حال تھی لیکن تھوڑی بہت گنجائش تو نکل ہی آتی تھی۔

پھر یوں ہوا کہ اچھے روزگار کی تلاش میں وہ اپنے ملک سے نکل کر یہاں آ گئے۔ ہاتھ تو کھل گیا لیکن دل بند ہونے لگا، ماں کبھی کبھی سوچتی کہ اپنے یہاں ہوتی تو دس لوگ بیٹی کی شادی کی طرف متوجہ کرتے لیکن یہاں کون تھا اور کسی کو کیا پڑی تھی۔ یہاں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ ساتھ والے فلیٹ سے جو جوڑا روز صبح نکلتا ہے، میاں بیوی بھی ہیں یا صرف ایک دوسرے کے ساتھ رہ رہے ہیں۔ یہاں کوئی سلام کا بھی روادار نہیں، لوگ ایک دوسرے سے بچنے اور دور دور رہنے کی کوشش کرتے ہیں، لگتا ہے کوئی طلسم ہے یہاں ہر فرد سحر زدہ ہے......ایک دوسرے سے خوف زدہ، خوف زدہ سا، ماں بیٹی کے درمیان بھی رشتہ، رشتوں جیسا تھا، بس واجبی سی گفتگو، باپ بیٹوں کے درمیان بھی صرف کام کے چند جملے، مہینے میں ایک بار سب گھر سے نکلتے تو راستہ بھر خاموشی رہتی۔ کھانے کا آڈر دیتے ہوئے چند جملوں کا تبادلہ ہوتا، کھانے کے دوران خاموشی، واپسی کا سفر خاموش اور پھر اپنے اپنے کمرے، روز کا معمول اور......!

ایک دن باپ کی خاموشی ٹوٹ گئی، صبح ناشتہ کرتے ہوئے اس نے کہا......''ہم نے کافی پیسے جمع کر لیے ہیں، واپس کیوں نہ چلیں''؟

لگا جیسے کائی زدہ تالاب میں کسی نے بڑا سا پتھر پھینک دیا ہو،

آنکھوں میں چمک سی آئی، لیکن اگلے ہی لمحے وہی پتھراؤ، بڑے بیٹے نے کہا......''ہمیں تو اب یہاں کی شہریت ملنے والی ہے۔''

بیٹی بولی......''میں تو کبھی نہ جاؤں؟''

چھوٹے بیٹے نے بھی اس کی تائید کی۔ باپ نے بے چارگی سے بیوی اور پھر بہوؤں کی طرف دیکھا۔ بہوؤں کے چہرے کسی بھی تاثر سے خالی تھے البتہ بیوی کے چہرے پر ایک عجب بے چارگی تھی، شائد اس کے اندر کا گاؤں ابھی زندہ تھا۔ وہ کچھ دیر تو چپ رہی پھر بولی......''اب تو ہم بچوں کے ساتھ ہیں، جہاں یہ وہیں ہم''

باپ دل مسوس کر رہ گیا، آنکھیں ڈبڈبائی گئیں، کہنے لگا......''مر جاؤں تو مجھے گاؤں لے جانا''۔

بڑے بیٹے نے رسمی سے انداز میں جواب دیا......''مرنے والے کو اس سے کیا کہ کس مٹی میں ہے، اور یہاں کے قبرستانوں میں بھی نفاست ہے، وہاں کے قبرستانوں سے تو وحشت ہوتی ہے۔''

باپ نے سوچا یہاں کے قبرستان بھی ان فلیٹوں کی طرح ہی ہوں گے، ساتھ والی قبر میں کون ہے اور آس پاس کیا ہے، اس کی بھی خبر نہیں ہوگی۔

''تو یہ لاؤنج ہی میری قبر ہے'' اُس نے سوچا......''کم از کم اس کے گرد چار کمرے تو ہیں نا''

چار کمروں کا یہ گھر، گھر جیسا ہے،
یہاں رہنے والے لوگ، لوگوں جیسے ہیں
ان کے رشتے اور محبتیں، رشتوں اور محبتوں جیسی ہیں۔

مزید گفتگو نہیں ہوئی، بیٹے، بہوئیں اور بیٹی آگے پیچھے باہر نکل گئے۔ لاؤنج میں باپ ماں اور بچے رہ گئے۔ دونوں نے ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں کی، باپ نے اخبار اٹھالیا، ماں برتن دھونے کچن میں چلی گئی۔ باپ نے اخبار پڑھتے پڑھتے دونوں بچوں کی طرف دیکھا...... ''معلوم نہیں یہ خوش نصیب ہیں یا بدنصیب''

چھوڑی ہوئی سطر کو ڈھونڈتے اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

چار کمروں کا یہ گھر، گھر کہلاتا ہے مگر......؟

◆◆◆

محترم لطیف احمد قریشی کی نادر تخلیقات

"مجھے لوگوں میں
مُنفرد بنائے...
میری نرم وملائم
اور شگفتہ جِلد"
تبت سنو کے تازگی بخش اجزاء
جِلد کو ریشم کی طرح نرم و مُلائم بنائے۔
جھائیاں، داغ دھبے دور کرے۔
چہرے کی زائد چکنائی کو جذب کرے۔
جِلد کو گرد و غُبار سے بچائے۔
جِلد کو عمر کے اثرات اور جھریوں سے عرصہ دراز تک محفوظ رکھے۔
Rs. 3/-
Tibet
Keeps skin soft and smooth
تبت سنو - ایشیا کی مشہور ترین بیوٹی کریم
TS/03/33/2K5

سہاگ سرائے

نجم الحسن رضوی

عروس البلاد کراچی کے صرف ایک علاقے شمالی ناظم آباد کی سب سے روشن شاہراہ پر قطار میں درجنوں بھر شادی گھر واقع ہیں۔ کبھی آپ نے ان کے مالکان سے یہ سوال کیا کہ انھیں شادی گھر بنانے کا خیال کیسے آیا؟ پھر میرا انٹرویو کس لئے؟ میں نے ایسا کون سا انوکھا کام کیا ہے؟ یہ ٹھیک ہے کہ اخباروں میں میرے شادی گھر کے بارے میں خبریں اور فیچر چھپے ہیں، مگر یقین کریں میں سستی شہرت کا قائل نہیں، اصل میں اسے نو بیاہتا جوڑوں کے ان بیانات کی وجہ سے شہرت ملی ہے جن میں اسے مثالی شادی گھر کہا گیا ہے۔

جی ہاں میرے شادی گھر کا نام ''سہاگ سرائے'' ہے۔ آپ کو یہ نام اچھا لگا، یقیناً اچھا لگا ہوگا۔ خود مجھے یہ نام بہت پسند ہے۔ ویسے سرائے سے ذہن میں سفر کا خیال اُبھرتا ہے اور سفر کے ساتھ پڑاؤ کی ضرورت کا احساس دل میں اپنی ٹانگیں پسارنے لگتا ہے۔ زندگی کے سفر میں شادی خانہ آبادی بھی ایک قسم کا پڑاؤ ہی تو ہے، کیا میں غلط کہتا ہوں۔ چلئے آپ نہ مانئے مگر میں تو یہی سمجھتا ہوں اور سہاگ رات ہے کیا...... بس ایک نئے سفر کی رات...... یعنی ''آگے چلیں گے دم لے کر''...... پھر جب ہم آگے چلے تو...... مگر نہیں میں اپنے شادی گھر کی بات کر رہا تھا۔

کیا کہا، اس شادی گھر میں نئی بات کون سی ہے؟

نئی بات کیا ہوگی جناب! شادی کون سا نیا کام ہے جس کے لئے کسی نئی بات کی ضرورت ہونی چاہئے۔ مگر میں آپ کو یہ یقین ضرور دلاؤں گا کہ 'سہاگ سرائے' میں آپ کو وہ ساری سہولتیں میّسر آئیں گی جن کی شادی کی کسی تقریب میں ضرورت پڑ سکتی ہے۔ بہترین سجاوٹ، روشنیاں، خوبصورت اسٹیج، تقریب کا ہال...... مردوں کے لئے الگ، خواتین کے لئے الگ...... اگر ملا جلا مجمع ہو تو بھی کوئی ہرج نہیں۔ کھانے کا بہترین انتظام، باجے گاجے کا بھی معقول بندوبست۔ غرض آپ جو طلب کریں وہ ملے گا۔ بس دولہا اور دلہن اپنے ساتھ لائیں اور وقت پر!

نہیں، حاشا و کلّا اس سے میرا مقصد یہ ہرگز نہیں تھا کہ میں اس بات کی طرف توجّہ دلاؤں کہ بعض دولہا اور دلہن دیر سے شادی گھر پہنچتے ہیں۔ ان کے دیر سے شادی گھر میں وارد ہونے کی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں، خود میری شادی بہت دیر سے ہوئی تھی، بھائی صاحب! نہ، نہ یہ بات نہیں تھی، دلہن عرصے سے میری نظر میں تھی...... اور میں اس کے خیالوں میں...... دیر کم بخت اس لئے ہوئی کہ میں جوان بڑی مشکل سے ہوا...... میری مراد ہے مالی طور سے...... اور میری بیوی نے پہلی ہی رات، یقین کریں پہلی ہی رات میری ساری پول کھول دی...... ''اپنا مکان ہے؟''

اوراس دن مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ میرے پاس تو اپنا مکان بھی نہیں تھا۔ مجھے میری بیوی نے مکان کی تمنّا ہی نہیں، اس کا پورا نقشہ بھی دیا۔ اونچے اونچے گیٹ، پائیں باغ، صحن میں فوارہ، فوارے میں کبوتر......!

میں نے اس نقشے کا کیا کیا؟ احتیاط سے اسے اپنے دل کے جُزدان میں لپیٹ لیا اور بیوی سے کہا۔ چلو اُٹھیں، آگے چلیں! یہ نئے سفر کی رات تھی اور ہمیں آگے جانا تھا۔

کیا کہا؟ اس سفر کا شادی گھر سے کیا تعلّق ہے؟ بہت گہرا تعلق ہے بھائی، مگر ذرا صبر سے کام لو، میں سفر کی بات اس لئے کرتا ہوں کہ اس میں عجیب مرحلے آتے ہیں اور ہم بھی ان مراحل سے گزر رہے ہیں۔ چلئے اگر آپ نہیں سننا چاہتے تو میں آپ کو اپنی داستانِ حیات نہیں سناتا،'سُہاگ سرائے' کے بارے میں بتاتا ہوں۔ اس کا ڈیزائن آپ کو سب سے جُدا لگے گا۔ عمارت تین منزلہ ہے......اور دور سے دیکھئے تو لگتا ہے کہ سرخ کھپریل کی ڈھلوان چھت والے مکان پر کوئی اُڑن طشتری اُتر آئی ہے۔ اُڑن طشتری جیسی گول چھت کے عین نیچے سب سے بڑا ہال ہے جس میں بڑا سا فانوس ہے۔ عموماً اس ہال کو بارات کی پذیرائی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ عمارت کے اندر اور بھی بہت سے بڑے بڑے کمرے ہیں جہاں مختلف تقریبات ہوسکتی ہیں۔

بڑے ہال کے نیچے زمین دوز لاؤنج میں کھانے کا انتظام ہوتا ہے لیکن فرمائش پر کھلی ہوا میں بھی ڈنر کا بندوبست ہوسکتا ہے۔ اس کے لئے عمارت کے آگے اور پیچھے بڑے بڑے لان ہیں۔ کراکری اعلیٰ درجے کی ہوگی اور انتظام فائیو اسٹار کی ٹکّر کا۔

سب سے اچھی بات'سہاگ سرائے' میں یہ ہے کہ یہ گھر لگتا ہے ہوٹل نہیں لگتا، نہ سنیما ہاؤس معلوم ہوتا ہے۔ ہوٹل کی ہر چیز نمائشی اور سنیما ہاؤس کی ہر زیبائش غیر حقیقی لگتی ہے۔

جی ہاں ہماری کوشش تو یہی ہوتی ہے کہ قمقموں کی سجاوٹ اور شادی کے اسٹیج کی تزئین میں بھی ایک فطری حُسن پیدا کیا جائے اور کوئی بھونڈا پن اور عامیانہ انداز نہ پیدا ہونے پائے۔

کیا کہا، ہاں شاید یہی وجہ ہے ہماری مقبولیت کی۔ مہینے میں ہماری بیشتر راتیں مصروف رہتی ہیں۔ ابھی کچھ دن پہلے ایک صاحب آئے وہ چند ہفتے پہلے ایک شام کی بکنگ چاہتے تھے، ولیمے کی دعوت کے لئے۔

کہا، بھئی بہت مشکل ہے، ساری تاریخیں بُک ہیں مگر قریب میں اور بہت سی جگہیں ہیں انھیں ٹرائی کیجئے! وہ بولے......نہیں صاحب، مجھے تو ہر قیمت پر آپ کے ہاں بکنگ چاہئے۔ آپ کا ہال مجھے اس لئے پسند ہے کہ اس میں گھر کا سا مزا ہے۔ اسکی سجاوٹ ایسی ہے کہ یہ نہیں لگتا کہ شادی آپ کے گھر میں نہیں ہورہی ہے۔ اپنا گھر کرائے کا ہے اور وہ بھی چھوٹا سا......سڑک پر تنبو بھی اب نہیں جچتا۔ آپ کچھ کریں، میں تو......

میں نے پوچھا......''شادی کس کی ہے، آپ کے بھائی کی''؟

بولے......''نہیں بھائی میری ہے، وہ بھی پہلی۔''

میں ہنس پڑا۔ اب دولہا میاں کو مایوس لوٹانا مجھے اچھا نہ لگا۔ یہ نوجوان سڑک پر تنبو لگانے سے شرمارہا تھا حالانکہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میرے بھائیوں نے میرے ولیمے کی دعوت کے لئے شامیانہ تان کے پوری گلی اس طرح گھیر لی تھی کہ وہاں دوپہر سے شام تک کوئی پرندہ اور بن بلایا مہمان پَر نہ مار سکا۔

جی آپ ٹھیک کہتے ہیں، وہ پرانی بات تھی اب گلیوں میں شامیانوں کا رواج کم ہو گیا ہے اور 'سہاگ سرائے' کی مقبولیت بڑھ گئی ہے اور صرف ''سہاگ سرائے'' پر کیا منحصر ہے، یہ جو شہر میں اتنے بہت سارے شادی گھر ہیں سب کے سب بہت مصروف ہیں۔ ابھی کل ہی کی بات ہے کہ بہت سے میرج ہالوں کے مالکان میرے پاس آئے تھے۔ وہ ''سہاگ سرائے'' کی مقبولیت سے متاثر ہو کے مجھے اپنی انجمن کا صدر بنانا چاہتے تھے۔

راز، کیسا راز؟ اچھا یعنی آپ چاہتے ہیں کہ میں آپ کو اپنے بزنس کی کامیابی کا راز بتاؤں۔ کمال ہے آپ اتنا بھی نہیں سمجھے، معمولی سی بات ہے۔ محنت سے سب کچھ ممکن ہے......ارے بھئی میں نے شروع میں بتایا تھا کہ میری بیوی نے شادی کی پہلی رات مجھ سے فرمائش کی کہ اپنا علیحدہ گھر ہونا چاہئے کیونکہ گھر پیار کی نشانی ہوتا ہے......آپ یقین کریں میں نے اپنی ساری جوانی اس خواب کو حقیقت بنانے میں صرف کر دی۔

پہلے میں کپڑے کی ایک دوکان میں ملازم تھا اور تھان سے کپڑا کاٹ کاٹ کے بیچتا تھا۔ پھر میں نے اپنی الگ دکان کھول لی۔ جب کاروبار بڑھا تو میں وطن سے باہر مال بھیجنے لگا اور اس طرح خوب پیسہ ہاتھ میں آ گیا اور جب ایک بار پیسہ ہاتھ میں آ جاتا ہے تو پیسہ بنانے کی اور ترکیبیں دماغ میں پھدکنے لگتی ہیں۔ پہلے ایک دکان ہوتی ہے، پھر دوسری دکان اور پھر تیسری۔

جی ہاں، ''سہاگ سرائے'' بھی ایک قسم کی دکان ہی ہے۔ ''بگ بزنس''! کیا فرمایا۔ اپنے گھر کے بارے میں بتاؤں، کیوں نہیں، کیوں نہیں، میں نے بھی گھر بنایا۔ پہلے اپنی بیوی کے بتائے ہوئے نقشے کے مطابق اس کے لئے تعمیر کا سامان جمع کرتا رہا۔ لوہا، سیمنٹ، ماربل اور کانچ جمع کرتا رہا اور شہر کے سب سے اچھے اور مہنگے علاقے میں کسی مثالی جگہ کی تلاش کرتا رہا۔ ویسٹ اوپن ہو، سڑک سامنے ہو، قریب میں پارک ہو، فضا کھلی ہو، ہوا بہت ہو، پانی صاف ہو، پڑوسی نام ور ہوں۔

پھر جب یہ ساری چیزیں یکجا ہو گئیں تو میرا گھر بن گیا اور خوب گھر تھا۔ میری بیوی کے دیئے ہوئے نقشے کے عین مطابق...... دلکش اور کشادہ......اور جس علاقے میں وہ گھر تعمیر کیا گیا تھا وہاں قطار میں بہت سارے خوبصورت گھر تھے۔

آگے کیا ہوا، ٹھہریئے بتاتا ہوں...... بڑا عجیب واقعہ ہے، اپنے خوابوں کے گھر میں منتقل ہوئے ہمیں ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا اور میں اپنی بیوی کے ساتھ گھر کے لان میں بیٹھا تھا کہ اچانک گیٹ کی گھنٹی بجی۔

میں نے گیٹ کھولا۔ ایک صاحب لمبی سی گاڑی کے ساتھ کھڑے تھے۔ وہ مکان کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھ رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر بولے۔ آپ کا مکان ہے؟ جی ہاں! میں نے جواب دیا۔

فرمایا ''بہت خوبصورت ہے!''

میں نے کہا...... ''شکریہ!''

پوچھا...... ''خود بنایا ہے؟''

جواب دیا۔ ''آپ کی دعا سے!''

بولا...... ''ایک دم پرفیکٹ!''

میں نے کہا۔ بس جی اللہ کی مہربانی تھی...... خاصی محنت کی گئی ہے اس پر...... برسوں کی کمائی صرف ہوئی ہے......محبت بھری

دعائیں اور پیار میں لپٹی تمنائیں اس کی بنیاد میں شامل ہیں!''

وہ لمحے بھر کو چپ رہے، پھر بولے..... ''بیچنے کا ارادہ تو نہیں؟''

''کیا؟'' میری چیخ نکل گئی..... ہرگز نہیں، میں اور اسے بیچ ڈالوں، اپنے خوابوں کے گھر کو؟ میں نے اندر جا کے بیوی کو یہ قصہ سنایا تو وہ ہنس پڑی..... ''کوئی خبطی ہوگا!''

یقیناً وہ خبطی تھا جناب..... کیونکہ وہ پھر آ دھمکا، دوسرے ہی ہفتے، اس بار میری بیوی میرے ساتھ ہی تھی۔

اس شخص نے کہا۔ تو آپ نے غور کیا میری تجویز پر؟

کس تجویز پر؟ میں غرّایا۔

''وہی مکان بیچنے والی بات!'' وہ اطمینان سے بولا۔

میری بیوی نے کہا..... ''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟''

اس نے کہا..... ''آپ کی مرضی، مگر میں پھر آؤں گا، دیکھئے یہاں'..... اس نے کچھ کہنا چاہا مگر پھر ہاتھ ہلا کے واپس چلا گیا۔

میری بیوی بولی۔ ''یقیناً یہ کوئی پاگل لگتا ہے!''

ایک دن وہ جنونی پھر آ ٹپکا۔ میری بیوی نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ ''ہمیں اپنا مکان نہیں بیچنا، نہیں بیچنا، نہیں بیچنا۔ پلیز آپ اپنا وقت ضائع نہ کریں!''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے'..... !وہ بولا ''میں جا رہا ہوں مگر آپ اس مکان میں رہ کر اپنا بے شمار پیسہ ضائع کر رہے ہیں.....!''

میں نے پوچھا..... ''وہ کیسے''؟

بولا..... ''اگر آپ یہ مکان مجھے فروخت کر دیں تو میں یہاں ایک میرج ہال شروع کر دوں گا۔ بہت پیسہ ہے اس میں..... میرا ایک میرج ہال پچھلی سڑک پر بھی.....!''

میری بیوی نے کھٹ سے دروازہ بند کر دیا۔

اس شام میری بیوی بڑی چپ چپ تھی۔ میں نے اسے خوش کرنے کے لئے کہا..... ''تم فکر مت کرو اگر وہ اب کے یہاں آیا تو میں اسے دھکے مار کے نکال دوں گا۔ آدمی ذرا ڈھیٹ معلوم ہوتا ہے مگر خطرناک نہیں۔''

میری بیوی نے چائے کی پیالی میز پر سے اٹھائی اور پھر ایک سوچ بھرا گھونٹ بھر کے بولی..... ''مگر وہ میرج ہال والی کیا بات تھی، سنو اگر یہ کوئی فائدے کی بات ہے تو کیوں نہ ہم خود.....''

جی ہاں جناب، تو آپ جان گئے ہوں گے کہ 'سہاگ سرائے' دراصل ہمارا اپنا گھر ہے جسے ہم نے..... اور یہ کوئی نئی بات نہیں، ذرا باہر نکل کے دیکھئے تو پتہ چلے گا کہ اس سڑک پر کتنے بہت سارے گھر اب باقی نہیں رہے۔

نہیں ہمیں کوئی پچھتاوا نہیں کیونکہ ہمیں یقین ہے کہ ہم بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔ میں بتاؤں، وہ نوجوان جس کا میں نے کچھ دیر پہلے ذکر کیا تھا ویسے کے بعد میرے پاس آیا اور تمام انتظامات کا شکریہ ادا کرنے کے بعد بولا۔ ''میری بیوی کو بھی یہ جگہ اتنی پسند آئی کہ کرائے کے گھر میں جاتے ہوئے وہ پھر سے اداس ہوگئی۔ اس کا کہنا ہے کہ گھر اپنا ہونا چاہئے۔''

◆◆◆

گھونسلے سے گری ہوئی چڑیا

ڈاکٹر ابدال بیلا

مجھے کیا پتہ تھا میرے گھر کے اندر کیا ہو چکا ہے۔

میں امریکہ کچھ ہفتے وائلڈ لائف سے متعلقہ ایک تعلیمی ورکشاپ سے پلٹ کے آیا' تو جہاز سے رات کے آخری پہر اترا۔ میرے گھر پہ تالہ تھا۔ چابی لگائی۔ اندر گیا۔ بھاری سوٹ کیس ایک طرف رکھے۔ لمبی فلائٹ کے ''ہینگ اوور'' سے برا حال تھا۔ گھر پہنچ کے مدتوں کی چہیتی کالی چیتے جیسی آنکھوں والی بلّی جو باہر بالکونی میں رہتی تھی کے لئے دودھ کا کٹورا ابھی نہ بھرا گیا۔ تھکن سے میں صوفے پہ گرا اور تازہ دم ہونے کے لئے سامنے پڑا ٹی وی آن کیا۔ مگر اسکی آواز بند رکھی۔ خاموش ٹیلی ویژن پہ اجڑی ہوئی لبنانی گلیوں میں کوئی کیمرہ لئے پھرتا ہوا گھروں کے کھنڈر بنے ہوئے دکھا رہا تھا۔ امریکہ میں رہتے ہوئے بھی کئی بار میں نے یہی منظر دیکھے تھے اور چینل بدل لیا تھا۔

میرا جہاز بھی لبنان کی فضائی حدود سے ہٹ کے محفوظ راہ سے آیا تھا۔

تھکن اور تساہل کی وجہ سے مجھ میں اُٹھ کے ریموٹ اٹھا کے چینل بدلنے کی ہمت نہیں تھی۔ میں جوتے اتارنے لگا۔ ابھی ایک تسمہ ہی کھولا تھا کہ بغلی کمرے سے مجھے چھر چھر کی معدوم سی عجیب آواز آئی۔ جیسے کوئی کاپی کھلی پڑی ہو اور کوئی پاس بیٹھا' آنے والے وقتوں کی تاریخ لکھتے ہوئے قلم گھسیٹ رہا ہو۔ پہلے میں سمجھا کوئی مغالطہ ہوا ہے۔ چند لمحوں بعد پھر ویسی ہی آواز آئی۔ اس بار جیسے کوئی کاغذ کا ٹکڑا کسی نے کھینچا ہوا۔ میں ہڑبڑا کے اس کمرے میں گیا۔ بتی جلائی۔ ادھر ادھر چاروں طرف دیکھا' کہیں کوئی نہیں تھا۔

پھر وہی آواز ابھری۔

میں آواز کی طرف پلٹا تو سامنے زمین پر ایک چڑیا کا بچہ ننگے ٹھنڈے فرش پر اپنے دونوں پروں کو کھولے، کچھ سمیٹے تھوڑی تھوڑی دیر بعد تڑپنے کے انداز میں زمین پر گھسٹنے کی کوشش میں لگا تھا۔ خدا جانے اس کا شعور چاہتا تھا کہ کوئی اسے دیکھے۔ یا وہ چاہتا تھا کہ وہ کسی کو نظر نہ آئے۔ اس کے بازو سوکھے ہوئے تھے۔ کھال کاغذ کی طرح چپکی ہوئی تھی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کے چڑیا کا بوٹ اٹھا لیا۔ وہ بے وزن سا تھا۔ اس کے پر مرجھائے ہوئے، پرواز سے عاری تھے۔ ٹانگیں ناتواں' سینہ پچکا ہوا۔ صرف اس کی چونچ کبھی کبھی کھلتی تھی۔ اور کھلی چونچ کچھ لمحوں تک کھلی ہی رہتی۔ جیسے اسے بند کرنے کی بھی اس میں سکت نہ ہو۔ میں احساسِ جرم سے سہم گیا۔

یہ چڑیا کا بوٹ میری عدم موجودگی میں یہاں بند رہا۔

میں تو چار ہفتوں سے گھر بند کر کے گیا تھا۔

گھر میں کھانے پینے کی چیزیں تھیں مگر الماریوں میں بند۔ واش بیسن اور باتھ روم کے نل سارے بند۔ کہنے کو باورچی خانے میں فرج چل رہا تھا۔ اس کے اندر کچھ کھانے پینے کی اشیاء بھی تھیں' مگر ذرا سا چڑیا کا بوٹ فرج کیسے کھولتا۔ اسے تو گرے ہوئے چند اناج کے

دانوں کی ضرورت تھی۔ ایسے بکھرے دانے شائستہ اطوار سلجھے لوگوں کے گھروں سے نہیں ملتے۔ پانی کی چند بوندوں کی تلاش کے لئے اس کی زندگی لڑتی رہی۔ پتہ نہیں کب وہ کہیں سے گرا اور پھر کبھی باہر ہی نہ جا سکا۔

یہ گرا کہاں سے؟

میں کمرے کی کھڑکیوں کا جائزہ لینے لگا۔

ایک کھڑکی کے اوپر مجھے اُکھڑے پروں اور سوکھی گھاس سے بنایا ہوا چڑیوں کا گھونسلا نظر آ گیا۔

بڑے گھر میں رہنے میں ایک عیب یہ بھی ہے کہ چھوٹے چھوٹے گھونسلے نظر ہی نہیں آتے۔

گھونسلے میں اب چوں چوں ہو رہی تھی۔ گھاس پھوس کا گھونسلا، دیواروں سے کچھ پرندے سر نکالے ایسے شور مچا رہے تھے، جیسے انہیں گرے ہوئے اپنے بوٹ سے زیادہ اپنے ٹوٹے ہوئے گھونسلے کی فکر ہے۔ اپنی جان کے لالے پڑے ہیں۔ مجھے گھونسلے کے مکین پرندوں کی آواز میں عجیب سہا ہوا خوف سنائی دیا۔

یہ کس سے ڈر رہے ہیں؟

کیوں سہمے بیٹھے ہیں؟

اچانک مجھے باہر بالکونی میں اچھل کے وار کرنے کے انداز میں بیٹھی ہوئی خونخوار بلّی نظر آ گئی۔ جس کے لئے عموماً میں دودھ بھرا کٹورا رکھا کرتا تھا۔

یہ ساری شرارت اس بلّی کی ہے۔

میں سمجھ گیا۔

مگر اس مرتے بوٹ کو کیسے بچاؤں؟

کیا پلاؤں؟

کیا کھلاؤں؟

اسے بچنا چاہیے۔

میں بھاگم بھاگ کچن سے چینی، شہد، نمک اور پانی بھرا گلاس لے آیا۔ کئی پیالے اٹھائے۔ کئی رنگ کے مشروب بنائے اور انگلی سے چھو چھو کے اس کی چونچ میں قطرے ٹپکانے لگا۔ پہلا قطرہ اس کے حلق میں گیا۔ قطرے کے جاتے ہی اس معصوم چھوٹے سے پرندے کے پورے جسم میں ایک عجیب سا ارتعاش ہوا۔ جیسے اس نے سر سے پاؤں تک کوئی عہد کیا ہو۔ کوئی فیصلہ کیا ہو۔ کسی کے لئے کوئی دعا کی ہو۔

وہ جاں کنی کی کیفیت میں تھا۔

ایسی حالت میں اپنے لئے دعا نہیں ہوا کرتی۔

شاید وہ اپنی قبیل کی بے بس چڑیوں کے لئے شریر بلیوں سے محفوظ رہنے کی دعا مانگ رہا تھا۔

اس کی زندگی کی موم بتی کا سارا موم پگھلا پڑا تھا۔ بتی کا شعلہ بجھنے کے لئے آخری ہچکولے لے رہا تھا۔ میں اسے اٹھا کے ہال کمرے میں لے آیا۔ جدھر میرا امریکہ سے آیا ہوا بند سامان پڑا تھا۔ خاموش ٹیلی ویژن پہ ابھی تک لبنان کی شہری آبادی پہ کی گئی مہذب دنیا کے بنے بمبار جہازوں کی بمباری کی خبریں چل رہی تھیں۔ کوئی گھر سالم نہ بچا تھا۔ کوئی بچہ ایسا نہ رہا تھا جو گھائل نہ ہوا ہو۔ جس کا حال میرے

گھر میں بلی کے ٹوٹے گھونسلے سے گرے چڑیا کے بوٹ جیسا نہ ہوا ہو۔ میں امریکہ کا پڑھا مہذب آدمی ہوں۔ میرا ذہن لبنان کے لہولہان بچوں کی نسبت چڑیا کے بچے پہ فوکس تھا۔ سوچنے لگا' پتہ نہیں یہ اس بند گھر کے کتنے چکر لگا تا رہا ہے۔ اس چڑیا کے بوٹ نے بند دروازوں پر کتنی ٹکریں ماری ہوں گی۔ کھڑکیوں سے باہر نکلنے کی کتنی کوشش کی ہوگی۔ خدا جانے اس بے شمار کمروں والے گھر کے اندر ہی اندر' کس کس کمرے میں وہ اڑتا پھرا ہوگا کہ کہیں سے اسے باہر جانے کی راہ ملے۔ تھک کے اس نے خوراک کے لئے تگ و دو کی ہوگی۔ پانی کی ایک ایک بوند کو ترسا ہوگا۔ مگر اسے میرے اتنے کمروں کے گھر سے کچھ بھی نہ ملا۔ میں کیسا بدنصیب بڑے گھر والا ہوں۔ جہاں ایک پرندے کا بچہ بھی ہفتوں بھوکا رہا۔

میں اس کی حالت دیکھ دیکھ کے خود کو لعنت ملامت کر رہا تھا۔ دکھ اور تاسّف سے ہاتھ ملتے ،نگہ ٹیلی ویژن کی طرف کی تو عجیب منظر نظر آیا۔ ایک ریڈ کراس کی گاڑی پہ بم گرا۔

زخمیوں کے پرخچے اڑ گئے۔

ریڈ کراس کا نشان بھی پچک گیا۔

زخمیوں کا خون ٹوٹی کراس کے سروں سے بہنے لگا۔

میں سر پکڑ کے بیٹھ گیا' یہ کیا ہو رہا ہے۔

اُدھر بے بس گھائل انسان چڑیوں کی طرح مارے جا رہے ہیں۔ اِدھر چڑیا کا بوٹ بے بسی سے مرنے والا ہے۔

میں نے بھاگم بھاگ اپنا میڈیکل ایمرجنسی بکس کھولا۔ سرنج نکالی' گلوکوس کی بوتل کیل سے لٹکائی اور پچکے ہوئے چڑیا کے بوٹ کی ٹانگوں سے چمٹے کالے کاغذی سے گوشت میں وریدیں ٹٹولنے لگا۔ بتیاں جلائیں۔ عینک لگائی۔ مگر ادھر کہاں ورید نظر آتی؟ آخر میں نے اس کی ہڈی میں سوئی گھپو کے ڈِرپ چلا دی۔ ساتھ ساتھ اس کی چونچ میں انگلیوں سے نمکول والے پانی کے قطرے ٹپکا تا رہا۔ مجھے پتہ ہی نہ چلا کب صبح آ گئی۔

دو گھنٹے گزر گئے۔

میں نے نہ جوتے اتارے۔ نہ اپنے اپیچی کیس اٹھا کے کہیں رکھے۔ اسی طرح ٹائی کوٹ پہنے میں بھاگم بھاگ ایک ایمرجنسی بھگتانے میں جتا رہا۔

ڈھائی گھنٹے بعد اس چڑیا کے بوٹ کے سانس رک رک کے آنے لگے۔ ایک بار وہ چونچ کھول لیتا تو کئی ساعتوں تک اس سے چونچ بند ہی نہ ہوتی۔ میں اس کے سینے کو سہلانے لگا۔ اس کے سانسوں میں وقفے بڑھنے لگے۔ اب وہ سانس لیتا تو پورا لرز جاتا۔ اور سانس لینے کے بعد اس کے پیر اندر کی طرف مڑ جاتے۔ میں خدا سے دعائیں مانگنے لگا۔ اللہ اسے بچا لے۔ میری غلطی ہے۔ میری ہی کھڑکی سے یہ گرا ہے۔ میں یہاں موجود نہیں تھا۔ پڑوسیوں کی بلی تو بہانہ ہے۔ ذمہ داری تو میری ہی ہے۔ اللہ اسے مرنے نہ دے۔ تھوڑی سی اُڑان دے دے۔ اس گھر سے باہر تک اڑنے کی اجازت دے دے۔

مگر میری نہ سنی گئی۔

کوئی دعا اس صبح میری پوری نہ ہوئی۔

وہ چڑیا کا بوٹ مر گیا۔ مرنے سے پہلے اس نے آنکھیں کھول کے مجھے عجیب طرح سے دیکھا تھا۔ مجھے سمجھ نہ آئی وہ کیا کہہ رہا

تھا۔شکریہ ادا کررہا تھا یا شکاری بلّیوں کو پالنے کا شکوہ کررہا تھا۔اس کی آنکھیں بند ہوگئیں۔اس کے پنجے الٹے ہوگئے۔چونچ ادھ کھلی رہ گئی۔ سینے کے پروں نے سانس کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا بند کردیا۔میرا ضبط بھی جاتا رہا۔میں کرب سے برف کی سل بن گیا اور اسی مرے پرندے کے پاس زمین پہ سر رکھ کے رونے لگا۔آنسوؤں سے چہرہ بھیگ گیا۔فرش گیلا ہوگیا۔

پتہ نہیں مجھے کیا ہوا۔مجھے ایسے لگ رہا تھا۔جیسے میرے ہاتھ میں ایک بچے نے دم توڑا ہے۔

بچہ تو بچہ ہی ہوتا ہے۔انسان کا ہو یا پرندوں کا۔

دکھ اور درد کی اس انتہا کو پہنچ کے میں نے اپنے آپ کو سنبھالنے کے لئے سامنے چلتے ٹیلی ویژن کی آواز اونچی کردی۔شاید ٹی وی کی تصویر اور آواز سے میرے اندر کا درد کم ہو۔ٹی وی کی تصویروں میں چیخ و پکار تھی۔لبنان کی کھنڈر شہری عمارتوں کے اوپر جنگی حملہ آور جہاز بم گراتے گزر رہے تھے۔ دھماکے ہو رہے تھے۔شعلے اٹھ رہے تھے۔دھواں ہی دھواں تھا۔چیخیں ہی چیخیں تھیں۔پکار تھی۔انسانیت بے گور وکفن پڑی تھی۔

چڑیوں کو توپوں سے مارا جارہا تھا۔

اکّا دُکّا لرزتی عمارتوں سے لوگ اپنے بچے اور سامان کی گٹھڑیاں اٹھائے بھاگ رہے تھے۔

پورا شہر ایسے لگ رہا تھا جیسے بچیوں کے گڑیا گھر میں کوئی پاگل ہاتھی گھس گیا ہو۔

ایسے میں کیمرہ ایک گھر کے ملبے میں مٹی میں لت پت پڑی' گولیوں سے چھلنی ہوئی' ایک گڑیا کے پاس' گری ہوئی کوئی سوا دو سال کی بچی کو فوکس کرتا ہے۔بچی کا معصوم فرشتوں جیسا چھوٹا سا چہرہ کسی بمبار جہاز کے بموں کی کرچیوں سے ادھڑا پڑا تھا۔زخموں سے بھرا۔خون سے لتھڑا اور مٹی سے اٹا۔وہ بچی ابھی زندہ تھی۔میرے گھر میں مرے چڑیا کے بوٹ کی طرح تھی۔بوٹ کو مرتے تو صرف میں نے دیکھا تھا۔لیکن اسے مرتے ہوئے ٹیلی ویژن پہ ساری دنیا دیکھ رہی تھی۔ دھیرے دھیرے موت بچی کی طرف جاتی ہوئی نظر آرہی تھی۔ٹیلی ویژن کی سکرین پہ اسی پس منظر میں ایک ''بریکنگ نیوز'' کی سرخی کے ساتھ ایک چوکھٹے میں ایک تصویر ابھری۔یہ تصویر بے ضرر چڑیوں کے گھونسلوں کو توڑنے والی میری بالکونی کی کالی خونخوار بلی کے خدوخال جیسی ایک سیاہ فام عورت کی تھی۔وہ مسکرا رہی تھی۔اس کے چہرے پہ کبھی اس کی اپنی قبیل کی سیاہ فام قوم پہ سفید بھیڑیوں کی یلغار اور ''کوکلکس کلان'' کی تاریخی حقیقت کا کوئی عکس نہ تھا۔الٹا وہ والہانہ انداز میں مظلوموں پر حملہ کرنے والے ظالم وزیر اعظم کا ہاتھ ہاتھوں میں لئے بیٹھی تھی۔جیسے اسے شاباش دے رہی ہو۔کہہ رہی ہو' ''گراتے جاؤ چڑیوں کے گھونسلے۔''

میں نے آنسو پونچھ ڈالے اور مٹھیاں بھینچ کے بیٹھ گیا۔مجھے ایک دم سے احساس ہوگیا۔چند ہی لمحے پہلے توڑے ہوئے گھونسلے سے گرا مرنے والا چڑیا کا بچہ میرے ہی گھر کا فرد تھا جس کے گھونسلے کو میں نے کبھی اپنے گھر کا حصہ نہیں سمجھا۔

مجھے خیال آیا۔

یہ چڑیوں کے بچے کبھی پرندوں کے غول میں شاہین ہوا کرتے تھے۔اپنی پرواز میں کوتاہی سے نیچے آکے جب سے انہوں نے الگ الگ گھونسلے بنائے' شکاری خونخوار بلّیوں کو خود پہ مسلط کرلیا۔

◆◆◆

حصار

ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش

وہ پیدا ہوتے ہی پورے محلّہ کے لئے حیرت اور تفریح کا باعث بن گیا۔ ماں باپ کی نظروں میں تو اس کا ننھا منا وجود خوشیوں کا گہوارہ تھا جب کہ دوسروں کے نزدیک اس کی غیر معمولی چھوٹی جسامت کسی عجوبۂ روزگار سے کم نہ تھی۔ پیدائش کے ہفتوں بعد بھی اس کو دیکھنے کے لئے گھر میں آ جا لگی رہی۔ آخر اس کی دادی نے اس ڈر سے کہ کہیں اس کے پوتے کو لوگوں کی نظر نہ لگ جائے، ماں اور بیٹے کو کچھ مدّت کے لیے اپنے ایک دُور کے رشتہ دار کے ہاں بھیج دیا۔ جب دو ماہ کے بعد اس کی ماں اسے لے کر دوبارہ گھر لوٹی تو لوگوں کی آمد و رفت پھر سے شروع ہوگئی، لیکن پہلے سے ذرا کم۔ اس کی ماں اور دادی کی خوشی جو اس کے پیدا ہونے کے بعد ناقابلِ بیان تھی، اب جیسے اسی خوشی کو گھن لگ چکا تھا۔ وہ دونوں اپنا اپنا ماتھا پکڑ کر گہری فکر میں ڈوبی رہتیں۔ اس کا باپ بھی گھر میں عموماً یوں چپ چاپ بیٹھا رہتا جیسے اس بات کو یاد کرنے کی کوشش میں ہو جو وہ کہتے کہتے بھول گیا تھا۔ بلکہ اس کے نزدیک تو شاید اس کے بیٹے کا وجود بھی ہونٹوں پر آ کر پلٹ جانے والی کی بات کی طرح ادھورا رہ گیا تھا۔ مگر خود اُس کا بیٹا اپنے وجود کی اس کوتاہی سے بے خبر لاتعداد ماہ و سال کی دوری پر اپنے پالنے میں، پڑا قلقاریاں مار رہا تھا۔ وقت اس کے ساتھ ساتھ ہاتھ پاؤں چلاتا بڑھتا رہا۔ اب وہ گھر آنگن میں لڑھکنے کے قابل ہوگیا تھا۔ البتہ اس کی ماں اور دادی کو ہر دم اس چیز کا دھڑکا لگا رہتا کہ کہیں کوئی چیل جھپٹ کر اسے مرغی کے چوزے کی طرح آناً فاناً اٹھا نہ لے جائے۔ سو وہ ہمہ وقت اس پر اپنے وجود کا سایہ کئے رکھتیں اور یہ بھی سچ ہے کہ سائے نیچے اگنے والے پودے اپنے فطری پھیلاؤ کے مطابق پنپ نہیں سکتے اور وہ تو پہلے ہی اتنا کہتر تھا کہ اس پر مزید سایہ کرنا، اسے حرفِ غلط کی صورت مٹا دینے کے مترادف تھا دوسری طرف اس کی ماں اور دادی بھی اپنی اپنی جگہ پر سچی تھیں وہ اور کر بھی کیا سکتی تھیں!

دیگر ہم عمر بچوں کے بڑھتے قد کی رفتار کے برعکس اس کا یہ سفر کچھوے کی سست روی کے ساتھ جاری تھا۔ ابتدائی بارہ سال تو اسے اپنے اس عیب کا سرے سے پتہ ہی نہ چلا اور غالباً اس کے سنگی ساتھیوں کو بھی اس کے چھوٹے قد کا بہت زیادہ احساس نہیں ہوا تھا۔ لیکن پھر جیسے جیسے اس کے اور اس کے ہمجولیوں کے بیچ خار دار تاروں کی ایک دیوار سی نمودار ہوگئی اور یہ جان کر اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں، موٹے موٹے آنسو امنڈ آتے کہ وہ اپنے چھوٹے قد کی بنا پر ان کے ساتھ کھیل کود میں شریک نہیں ہوسکتا تھا۔ اب اسے گھر سے اکیلا باہر جاتے ہوئے ہچکچاہٹ ہونے لگی تھی۔ مدرسے میں بھی ہم جماعت بچوں کے لئے وہ چابی کا کھلونا بن کر رہ گیا تھا۔ کوئی اس کے کان مروڑتا۔ کوئی اُس کا بازو کھینچتا اور کوئی زیادہ شرارتی بچہ اُسے گود میں اٹھالیتا، آخر نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ اس کی وجہ سے مدرسے کا نظم و نسق بھی متاثر ہونے لگا۔ لہٰذا ہیڈ ماسٹر صاحب کے کہنے پر اسے مدرسے سے اٹھالیا گیا اور گھر میں ہی اُس کی تعلیم و تربیت کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔

اُس کا قد بڑھانے کیلئے اس کے والدین نے ہزار جتن کیے۔ قسم قسم کے حکیموں، ڈاکٹروں اور سنیاسیوں سے اُس کا علاج کروایا اور کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہ ہونے پر مقبروں، درباروں اور درگاہوں پر حاضریاں دیں، منّتیں مانیں حتیٰ کہ تعویذ گنڈے اور جادو ٹونے سے بھی کام لیا، لیکن اس کا قد اپنی مرضی سے جو بڑھا سو بڑھا۔ مگر جو بھی اضافہ ہوا وہ زخم پر مزید نمک چھڑکنے کا موجب بنا۔ کاش قد چھوٹا رہ جانے پر انسان کی امنگیں اور آرزوئیں بھی اسی نسبت سے چھوٹی اور مختصر ہو جائیں تو شاید اسے وہ عذاب جھیلنا نہ پڑے جو جسم کے ساتھ روح کو بھی مسل دیتا ہے۔ اس کا جسم واقعی بیمار لاچار ہوتا تو کسی نہ کسی علاج معالجے کا اُس پر کچھ نہ کچھ اثر بھی ہوتا۔ درحقیقت اس کا وجود تو اپنے طور پر ایک مکمل اکائی تھا جو فقط دوسروں کی مقرر کردہ کسوٹی پر کھوٹا قرار دے دیا گیا تھا۔ جبکہ زمین پر رینگنے اور فضا میں اڑنے والے کیڑے مکوڑوں کے لیے تو شاید اس کا جسم کوہ ہمالیہ سے کم جسامت نہ رکھتا تھا، لیکن اسے ان کی معیت میں تو زندگی گزارنی نہیں تھیں، اُس کا واسطہ تو انسانوں سے تھا جو ایک خاص قد کاٹھ سے چھوٹے یا بڑے وجود کو ذہنی اور معاشرتی سطح پر بآسانی قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھے، بلکہ وہ تو ہر اس ہستی پر نشتر زنی کرتے جو اُن کے قائم کردہ پیمانوں سے مطابقت نہیں رکھتی تھی۔

وقت چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا گزرتا رہا حتیٰ کہ وہ عمر کے اعتبار سے جوان ہو گیا، لیکن گلی کوچے میں سے گزرتے ہوئے اس کے کانوں میں کٹیلے، نمک پاش اور تضحیک آمیز جملے گرم سیسے کی طرح انڈیل دیے جاتے۔ کوئی اسے ''کارٹون'' کہہ کر ٹھٹھہ لگاتا، کوئی اسے ''پدی پہلوان'' کا خطاب دیتا اور کوئی ''ٹڈی جوان'' کا آوازہ لگا کر اپنے اندر چھپے جذبۂ تحقیر کی نمائش کرتا اور اس کے بعد چاروں طرف سے ملے جلے قہقہوں کی آوازیں دانت نکوسے غرائی ہوئی اس وقت تک اس کا تعاقب کرتی رہتیں جب تک کہ وہ اپنے گھر کی دہلیز کو پار نہ کر جاتا۔ آئے دن کی اس چھیڑ چھاڑ اور ذلّت آمیز فقرے بازی کا مظاہرہ اِس کے لیے سوہانِ روح بن چکا تھا لیکن گلیوں محلوں میں سے گزرتے ہوئے اس کی ڈوبتی ابھرتی دھڑکنوں میں یہ صدائے بازگشت ضرور ابھرتی کہ ''شکر ہے میں نے ان ننگی ابلیسی آوازوں کے چہرے پہچاننے کے لیے کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا وگرنہ شاید میں بھی کسی داستان کے شہزادے کے مانند پتھر کا بُت بن گیا ہوتا''۔ اس سب کے باوجود جب لوگوں کے، تحقیر آمیز کلمات اُس کی سماعت سے ٹکراتے تو اس کے ہونٹ کپکپانے لگتے اور ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا موتیا اُتر آتا، مگر وہ ضبط کیے رکھتا اس حالت میں اُسے شاہ دولے شاہؒ کے چوہے اپنے سے ہزار گنا بہتر معلوم ہوتے۔ وہ سوچتا کہ کم از کم انہیں ذہنی طور پر تو کوئی دکھ جھیلنا نہیں پڑتا جب کہ وہ خود جسم اور ذہن کا دوہرا بوجھ اٹھائے ہوئے تھا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ اسے راہ چلتا دیکھ کر مخالف سمت سے آنے والوں کی آنکھیں ذو معنی مسکراہٹ سے سکڑ جاتیں اور ہونٹوں کے زاویے پھیل جاتے اور اس کے پاس سے گزرنے کے بعد بھی وہ چند بار پلٹ کر اُسے یوں دیکھتے جیسے وہ کسی غیر سیارے کی مخلوق ہو۔ بہرحال اس کا یا تو مضحکہ اڑایا جاتا یا پھر اُس سے تھوڑی سی ہمدردی جتائی جاتی جبکہ اُسے ان دونوں رویوں سے شدید نفرت تھی وہ تو اپنے ساتھ نارمل سلوک روا رکھے جانے کا متمنی تھا جبکہ نارمل اور ابنارمل میں حدِ امتیاز قائم کرنا بھی اپنی جگہ پر ایک گورکھ دھندہ ہے جو بآسانی سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ لیکن جب کبھی وہ کارٹون پروگرام دیکھتا تو اُسے وقتی طور پر بڑا حوصلہ ملتا۔ وہ دیکھتا کہ کمزور ترین اور حقیر ترین جانور اپنے سے سوگُنا قد آور درندوں کو تگنی کا ناچ نچاتے اور بالآخر انہیں شکستِ فاش سے دوچار کر دیتے...... شاید کارٹون فلمیں اور کامک لٹریچر لاچار، بے بس اور کمزور افراد کی ذہنی اور جسمانی تسکین یا ازالہ کی خاطر لکھا اور تشکیل دیا جاتا ہے تاکہ وہ کچھ دیر کے لیے سہی، احساسِ کم مائیگی اور بے چارگی کے چُنگل سے باہر آ کر خوشی کی چند گھڑیاں گزار سکیں، مگر ان طریقوں سے بگڑے زخم کیسے بھر سکتے ہیں، خاص طور پر وہ گھاؤ جو جسم سے زیادہ روح کے اندر موجود ہوں۔

دن رات کی تگ ودُو کے بعد آخر کار اسے ایک لمیٹڈ کمپنی میں ایک اوسط درجے کی ملازمت مل گئی۔مگر اسے دیگر اہل کاروں کے چہروں پر تمسخر، چھدری، نوکیلی، خم دار اور گھنی مونچھوں کے پیکر میں اگا ہوا نظر آتا رہتا۔ چنانچہ جواباًاس نے بھی گھنی مونچھیں رکھ لیں اور یوں وہ کسی دکان کے شوکیس میں ایستادہ سلولائیڈ کے ایک ٹھگنے قد کے مجسمے کے مانند دکھائی دینے لگا۔البتہ دونوں میں فرق بس اس قدر باقی ضرور تھا کہ شوکیس میں رکھا ساکت وصامت مجسمہ، بارونق بازار میں سے گزرتے ہجوم کو صبح سے شام تک، خالی خالی آنکھوں سے ایک تار دیکھتا رہتا تھا، جب کہ وہ خود کمپنی کے دفتر میں اپنی کرسی پر بیٹھا، ٹائپ رائیٹر کی ٹک ٹک کے ہروار کواور ارد گرد اٹھتے بیٹھتے ہونٹوں میں بھنچی کھلتی سرگوشیوں کو بخوبی سمجھ بوجھ سکتا تھا۔ بالآخر جب ترقیوں کا موسم آیا تو وہ اپنی بہتر کارکردگی کی وجہ سے دوسرے اہل کاروں کے مقابلے میں قد آور ثابت ہوا اور اسسٹنٹ منیجر کے عہدہ پر فائز کر دیا گیا۔البتہ اس کے آفس روم کی ریوالونگ چیئر اس کے فطری قد کاٹھ کے برعکس کافی بڑی تھی، چنانچہ وہ اس پر ایک موٹی سی گدی رکھ کر اور تن کر بیٹھتا تھا۔اُس کے اس اقدام کے باوجود ہر نیا ملاقاتی اُسے وہاں بیٹھا دیکھ کر پہلی نظر میں یہی باور کرتا کہ صاحب کسی دوسرے کمرے میں گئے ہوئے ہیں اور ان کی عدم موجودگی میں ان کا صحت مند گورا چٹا بیٹا شرارتاً ان کی جگہ پر قبضہ جما کر بیٹھ گیا ہے اور کرسی کو دائیں بائیں گھما پھرا کر لطف اندوز ہو رہا ہے لیکن اس ''بچے'' کے چہرے پر اگی گھنی مونچھیں، ملاقاتی کے چند لمحات پہلے کے تصور کو یکایک یوں اڑا دیتیں جیسے تالی بجانے سے درخت پر بیٹھی چڑیاں پُھر سے اُڑ جاتی ہیں۔

ترقی پانے کے کچھ عرصہ بعد اس کی یہ کیفیت ہوگئی کہ نیند کی حالت میں اُس کا پورا وجود ایک عجیب سے تناؤ کا شکار ہو جاتا اور پھر اُسے یوں لگتا جیسے دو نادیدہ قوتیں اسے دونوں ٹانگوں سے پکڑ کر پورے زور سے مخالف سمتوں میں کھینچ رہی ہیں، جیسے اس کو بیچ میں سے چیر دینا چاہتی ہوں۔تب وہ انتہائی سراسیمگی کے عالم میں اپنے دونوں بازوؤں سے پلنگ کی پٹی کو مضبوطی سے پکڑ لیتا۔شدید درد سے اس کی چیخ نکل جاتی اور سارا بدن پسینے میں شرابور ہو جاتا اور سانس دھونکنی کے مانند چلنے لگتا اور پھر یکبارگی اس کی آنکھ کھل جاتی اور وہ اُٹھ کر بیٹھ جاتا اور ہوش میں آتے ہی یہ اذیت ناک حالت از خود غائب ہو جاتی۔البتہ نقاہت کے باعث وہ مضمحل ہو جاتا اور تا دیر بستر سے پاؤں لٹکائے دم بخود بیٹھا رہتا۔دوبارہ سونے کی اسے ہمت نہ ہوتی اور بقیہ رات وہ سگریٹ پھونک پھونک کر گزار دیتا، گویا نیند اس پر حرام ہو جاتی۔آخر جب یہ دورے اُسے جلدی جلدی پڑنے لگے تو اپنی حالت سے خوف زدہ ہو کر وہ ایک شام شہر کے نامی گرامی اعصابی امراض کے ڈاکٹر کے پاس چلا گیا طویل مدت تک رنگ برنگ کیپسول، گولیاں، مکسچریں کھلانے پلانے کے بعد ڈاکٹر صاحب اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس کو کوئی جسمانی عارضہ لاحق نہیں ہے اور اُسے مشورہ دیا کہ وہ کسی نفسیاتی امراض کے معالج سے رجوع کرے تا کہ وہ اُس کے اندر کی گرہ کھول کر اسے جسمانی کرب سے نجات دلا دے......حالانکہ بعض گرہیں اگر کھل جائیں تو زندگی کا سارا شیرازہ ہی بکھر جاتا ہے اور پھر دوبارہ شیرازہ بندی کسی طور ممکن نہیں ہوتی۔ چنانچہ وہ اس ادھیڑ بن میں رہنے لگا کہ آیا اسے اپنے اندر کی گرہ کو کھولنے کی کوشش کرنا بھی چاہیے یا نہیں۔لیکن پھر وہ سوچتا کہ کوشش کر لینے میں آخر کیا حرج ہے! پہلی شرط تو گرہ ڈھونڈے کی ہے۔ بالفرض وہ مل گئی تو پھر دیکھیں کہ اسے کھولنا ہے یا نہیں۔ یہ فیصلہ کر کے اُسے یک گونہ اطمینان حاصل ہوا۔ ماہرِ نفسیات سے دو چار ملاقاتوں کے بعد ہی اُسے اندازہ ہو گیا کہ جس گرہ کی تلاش میں ماہرِ نفسیات متجسس اور وہ خود پریشان ہے، اس پر تو کئی دوسری گرہیں قابض ہیں۔مطلب یہ کہ اصلی گرہ کو کھولنے کے لیے خود کو دوسری گرہوں کے پنجوں سے نکالنا ضروری ہے، لیکن ساتھ ہی یہ ڈر بھی اُسے چمٹ گیا کہ اس کھینچا تانی میں وہ کہیں سارے کا سارا ہی نہ اُدھڑ جائے اور اصلی گرہ شاید پھر بھی ہاتھ نہ آ سکے۔اس ساری صورتِ حال نے اُسے ذہنی طور پر مزید گڑبڑا دیا اور اُسے دفتر میں فائلیں الٹتے پلٹتے، ان پر دستخط ثبت کرتے

اور نوٹ لکھتے ہوئے، گرہیں پھیلتی اور سکڑتی ہوئی دکھائی دینے لگتیں اور بعض اوقات وہ کسی کتاب یا رسالہ کی ورق گردانی کرتے ہوئے اس سوچ میں ڈوب جاتا کہ سارا بکھیڑا مدِ مقابل کے قد کاٹھ کو دیکھ کر پیدا ہوتا ہے اگر کسی طور موازنہ کرنے کی اس دائمی علّت کی بیخ کنی کی جا سکے تو پھر شاید کوئی مسئلہ ہی باقی نہ رہے لیکن مصیبت یہ تھی کہ یہ مسئلہ ہر جگہ موجود تھا لہٰذا سب کا ایک درجہ پر آ جانا ہی ان سارے تفرقات اور اختلافات کا واحد پائیدار حل ہوسکتا تھا۔ جب کہ حقیقت میں یہ چیز خلافِ فطرت تھی، کیونکہ نظامِ فطرت کے مطابق تو ہر جگہ طاقت ور کا راج ہے، چاہے اس کا قد چھنگلی برابر ہی کیوں نہ ہو اتب اُسے اپنی حیثیت کا اندازہ ہوتا کہ وہ ایک معروف لمیٹڈ کمپنی میں ایک مناسب عہدے پر فائز ہے اور مزید ترقی کرنے کے امکانات دونوں بازو کھول کر اس کا سواگت کرنے کو تیار ہیں۔ ان پہلوؤں پر غور کرتے ہوئے اُسے اپنا آپ لوہے کے وزنی باٹ کی طرح بظاہر چھوٹا مگر وزن میں کافی بھاری بھرکم محسوس ہوتا اور یوں ایک حد تک اس کا غم غلط ہو جاتا۔ تاہم دفتری اوقات کے دوران، دفتری اُمور کی انجام دہی کے سلسلے میں جب اُسے عملہ کے کسی ادنیٰ ترین ملازم سے بھی باز پرس کرنے کے لیے اپنا سر پوری طرح اُوپر اٹھانا پڑتا تو اس کا قوت اور برتری پر اُستوار سارا اعتماد پلک جھپکنے میں معدوم ہو جاتا اور وہ دوبارہ اپنے قد کے حصار میں سمٹ آتا۔

بچپن کے ایّام میں اپنی دادی امّاں سے جنّوں، پریوں اور شہزادوں، شہزادیوں کے قصے کہانیاں سنتے ہوئے اُسے بونوں کا ذکر خاص طور پر بڑا دلچسپ لگتا تھا اور بعدازاں اُس نے بونوں کے متعلق لکھی کہانیوں کو مزے لے لے کر پڑھا بھی تھا البتہ اس بات کی خبر اُسے بہت بعد میں ہوئی کہ وہ خود زندگی کی اصل کہانی میں سچ مچ کے بونے کا کردار بن کر رہ گیا ہے۔ تب اس کے اندر یہ خواہش شدت سے بیدار ہوگئی کہ کیا ہی اچھا ہو کہ کسی روز جب وہ سو کر اٹھے تو خود کو ایک ایسی نگری میں موجود پائے جہاں کے باسیوں کا قد کاٹھ اس کی چھنگلی کے برابر ہو۔ شومئی قسمت سے اُس کی آنکھ ہمیشہ غلط وقت پر اور غلط مقام پر ہی کھلتی تھی۔

اسسٹنٹ منیجر کے عہدہ پر ترقی پانے کے بعد اس نے اپنے لیے بطور خاص اونچی ایڑی کا جوتا تیار کرایا تھا، لیکن اسے پہن کر بھی اس کے قد میں کوئی فرق نہیں آ سکا تھا۔ الٹا بونے پن کا احساس اس کے دِل میں مزید گہرا ہو گیا تھا۔ دوسری جانب اس کی ماں کے لیے اس کا چھوٹا قد مسلسل کرب کا باعث بن چکا تھا۔ اس کا باپ تو کئی سال پہلے دل کا دورہ پڑنے سے چل بسا تھا۔ لے دے کر اب صرف ماں تھی جو کچھ دیر کے لیے اسے زندگی کی کانٹوں بھری ڈگر سے اٹھا کر سکون کی سرسبز وادی میں لے جاتی تھی، ہر چند کہ اس کی ماں کو کئی قسم کی بیماریاں گھیرے رکھتی تھیں، مگر اس سب کے باوجود وہ زندہ تھی اور بیٹے کی خوشیاں دیکھنے کی خاطر سب دُکھ درد پسِ پشت ڈال کر جی رہی تھی۔ اس نے کافی کوشش کی کہ اپنے بیٹے کے لئے کوئی مناسب رشتہ ڈھونڈ نکالے۔ اس سلسلے میں اس نے ملنے جلنے والوں اور شادی بیاہ کے اداروں کی وساطت سے بھی رشتہ تلاش کرنے کے جتن کئے مگر بات بن نہ سکی، ہر جگہ لڑکے کا قد آڑے آ جاتا اور جیتے جی کوئی ہوش مند، اپنی بیٹی کو ایک بونے کے ساتھ بیاہنے کو تیار نہ ہوتا۔ اس کی خاندانی نجابت، اچھی ملازمت اور روشن مستقبل...... کوئی چیز بھی اس کے ٹھگنے قد کا ازالہ نہیں کر سکتی تھی۔ آخر تنگ آ کر اس نے اپنی ماں سے کہا کہ وہ اُسے ذہنی اذیت پہنچانے کا یہ سلسلہ فی الفور بند کر دے، کہنے کو تو اس کی ماں اس معاملے میں ٹھنڈی پڑ گئی، لیکن درونِ خانہ اس نے اپنی تگ و دَو جاری رکھی۔ یہی تو ایک تمنّا تھی جس کو پورا ہوتا دیکھنے کے لئے وہ ابھی تک جئے جا رہی تھی۔

خود اُس کے اندر گھر بسانے کا جذبہ بظاہر سرد پڑ چکا تھا۔ مگر چنگاری راکھ میں اب بھی موجود تھی، سو جس دن ایک لڑکی اس کے دفتر

میں بطور لیڈی سٹینو ملازم ہوکر آئی، اُسے اپنے اندر یہ جذبہ دوبارہ سلگتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ وہ لیڈی سٹینو اگرچہ چھوٹے قد بت کی مالکہ تھی لیکن اونچی ہیل کا جوتا پہن کر اور بالوں کا اونچا جوڑا بنا کر ہنسی مذاق کا نشانہ بننے سے بال بال بچ گئی تھی۔ وہ جب بھی اس کو Dictation دینے لگتا تو یہ سوچ بنا نہ رہتا کہ اس کے اَور لیڈی سٹینو کے قد میں کم وبیش ڈیڑھ فٹ کا فرق ہے جسے وہ ذہنی ہم آہنگی پیدا کر کے پاٹ سکتا ہے۔ البتہ بعدازاں یہ سوال اُبھر آیا کہ وہ اسے اپنے ارادے سے کیوں کر باخبر کرے! ذہنی طور پر وہ اتنے چر کے سہہ چکا تھا کہ اسے دل کا حال، زبان پر لانے کا حوصلہ ہی کہاں رہ گیا تھا! ویسے اُسے کئی بار یہ شک گزرا کہ لیڈی سٹینو بات کرتے ہوئے اُسے گہری گہری نظروں سے ضرور دیکھتی ہے۔ وقت یونہی گزرتا رہا، دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں تبدیل ہو گئے۔ مگر لیڈی سٹینو سے اس کی بات چیت کا سلسلہ رسمی اور دفتری نوعیت کے سوال و جواب تک ہی محدود رہا۔ دراصل اسے ڈر اس چیز کا تھا کہ کہیں حقیقتِ حال زبان پر لانے سے اس کے سب اندازے غلط ثابت نہ ہو جائیں اور آس کی یہ ریشمی ڈور بھی کچے سوت کی ڈوری کے مانند کہیں درمیان ہی میں ٹوٹ نہ جائے! لہٰذا اس کے اندر کی کشمکش، تالاب میں گرنے والی کنکری سے پیدا ہونے والی لہروں کی طرح دائرہ در دائرہ پھیلتی ہی چلی گئی اور بے بسی نے اسے مضبوطی سے اپنے شکنجے میں جکڑ لیا۔

اُس روز صبح ہی سے موسم ابر آلود تھا اور جب وہ حسبِ معمول دفتر پہنچا تو پھوار شروع ہو چکی تھی۔ لیڈی سٹینو جب مقررہ وقت پر Dictation لینے اس کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ اُسے غیر معمولی طور پر خوش نظر آئی جس سے اس کے دل میں نجانے کیوں کھد بُد سی ہونے لگی! حتیٰ کہ Dictation دیتے ہوئے بھی وہ بار بار اٹک سا گیا اور کئی مرتبہ پہلے لکھائے ہوئے جملے کو کاٹ دینے کو کہا۔ دو تین بار تو وہ تقریباً آدھ پون فقرہ ہی بول کر گم صم سا ہو گیا، چنانچہ لیڈی سٹینو کو اُسے مخاطب کر کے کہنا پڑا کہ ’سر آگے کیا لکھوں! اُس کی آواز پر وہ چونک کر اُسے ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھنے لگتا، مگر پھر خود کو بمشکل سنبھالا دے کر اُسے ازسرِ نو عبارت پڑھنے کو کہتا۔ کافی دیر کے بعد جب اِس کام سے فراغت ہوئی تو لیڈی سٹینو نے جانے سے پہلے ایک شرمیلی مسکان ہونٹوں پر سجا کر اپنا پرس کھولا اور اس میں سے ایک تہ شدہ کاغذ نکال کر اس کے سامنے میز پر پھیلا دیا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے سٹینو کی جانب دیکھا تو اس نے مزید شرماتے ہوئے پلکیں جھکا لیں اور نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے کاٹتی ہوئی ذرا ہچکچا کر بولی۔ سر یہ چھٹی کی درخواست ہے، آئندہ ہفتے میری شادی ہونے والی ہے، اتنا کہہ کر وہ اپنی انگلی پر دوپٹے کے ایک سرے کو بل دینے لگی اور یکا یک لیڈی سٹینو کی انگلی میں جگمگاتی لال نگینہ کی انگوٹھی ایک دہکتا ہوا انگارا بن کر اُس کی آنکھوں کو بھسم کر گئی اور کئی لمحوں تک اس کے لئے گویا وقت کا دم گھٹ کر رہ گیا۔ پھر معلوم نہیں کہاں سے اس نے رہی سہی ہمّت مجتمع کر کے کپکپاتی اُنگلیوں سے قلم کو جنبش دی اور سامنے رکھے ہوئے سفید کفن ایسے کاغذ پر یوں قلم چلا دیا جیسے اپنی موت کے پروانہ پر دستخط ثبت کر دیئے ہوں اور اس کے ساتھ ہی دُکھ نے اس کے سینہ میں پوری قوت سے بھالا دے مارا۔ درد کی ایک تیز دھار ٹیس اُٹھی جس سے اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں، لیکن اس نے جلدی سے اپنی ریوالونگ چیئر کا رُخ دیوار کی جانب موڑ دیا۔ لیڈی سٹینو کب کمرے سے باہر گئی، اس کو اسے بالکل علم نہ ہو سکا اس کے تو اعصاب تک شل ہو چکے تھے اور وہ اس ساری صورتِ حال سے بے حال ہو کر کسی بے جان پتلے کے مانند خالی دیوار کو ٹکٹکی باندھے لگاتار دیکھتا جا رہا تھا۔ سکتے کا یہ عالم ٹوٹا تو اس نے بڑی اذیّت سے کراہتے ہوئے سوچا کہ وہ اس قدر اندھا کیسے ہو گیا تھا کہ اُسے لیڈی سٹینو کے ہاتھ میں اٹکھیلیاں کرتی اتنی بڑی انگوٹھی بھی دکھائی نہ دی تھی! باقی ماندہ دفتر کا وقت اس نے سخت بے قراری میں گزارا۔ کسی کام میں اِس کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ موسم کی اچانک خرابی کے باعث کوئی ملاقاتی نہ آ سکا تھا، کیونکہ اگر خدانخواستہ کوئی آ جاتا تو اس کے ذہنی

انتشار کو بھانپتے ہوئے نجانے کیا سوچتا کیا سمجھتا!

دوپہر تک بونداباندی کا سلسلہ جاری رہا۔ البتہ دفتر کا وقت ختم ہونے تک بونداباندی تھم گئی مگر اس نے گاڑی کی سہولت حاصل ہونے کے باوجود پیدل گھر جانے کا فیصلہ کیا۔ حالانکہ پیدل گھر جانا اُس کے لیے ہمیشہ ایک تکلیف دہ تجربہ ثابت ہوا تھا آج چونکہ اس کی طبیعت غیر معمولی طور پر بوجھل اور غمگین تھی سو اس نے سوچا کہ شاید گھر تک کا سفر طے کرنے سے طبیعت کچھ بہل جائے، چنانچہ وہ بریف کیس ہاتھ میں لیے تھکے تھکے قدموں سے گھر کو روانہ ہو گیا اور چلتے چلتے سوئے اتفاق سے اس کا گزر شہر کے اس مقام سے ہوا جہاں ایک بلند و بالا مینار آسمان کی بلندیوں کو چُھو رہا تھا۔ یک بیک اُس کے وجود کے اندر بونے پن کا انتہائی شدید احساس کسی کچے زخم کی صورت پوری طرح کھل گیا۔ کرب کی ایک لہر سی اٹھی اور اسے ریزہ ریزہ کر گئی۔ اتنی بڑی کائنات میں اسے اپنا چھوٹا سا وجود بالکل حقیر اور بے معنی لگا اور پھر اچانک اُس نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا فیصلہ کر لیا اور دوسرے ہی پل وہ مینار کی جانب تیزی سے بڑھنے لگا۔ مینار کے عین نیچے پہنچ کر اس کے پاؤں منوں وزنی ہو گئے لیکن جو فیصلہ اس نے کر لیا تھا وہ اس پر ڈٹا رہا۔ ٹکٹ خرید کر وہ مینار کی چوٹی تک جانے والی لفٹ میں سوار ہو گیا۔ جوں جوں لفٹ بلند ہوتی گئی، توں توں اُس کا دل بیٹھتا چلا گیا اور جب لفٹ اپنی منزل پر پہنچ کر تھم گئی تو وہ باہر آ گیا اور مینار کے آگے کو بڑھے ہوئے اس چھجہ نما حصّہ پر کھڑا ہوا جہاں سے پورے شہر کو دیکھا جا سکتا تھا تب اُس نے ایک گہرا اور ٹھنڈا سانس لیا اور اپنی آنکھوں میں آئی ہوئی نمی کو رومال سے پونچھ کر نیچے پھیلے ہوئے شہر پر ایک نظر دوڑائی، مگر دوسرے ہی لمحے ایک انوکھے انکشاف نے اُسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ موسم دُھندلا ہونے کے باوجود اس نے دیکھا کہ شہر کی بڑی بڑی عمارتیں، گُڑیوں کے گھروندوں میں تبدیل ہو گئی تھیں اور ان کے بیچوں بیچ سانپ جیسی بل کھاتی سڑکوں پر کاریں اور بسیں اور انسان کیڑے مکوڑوں کے مانند رینگ رہے تھے۔ اس وقت اُسے یوں جان پڑا جیسے اس کی آنکھ بونوں کی کسی بستی میں آ کر کھل گئی ہے اور تب وہ خوفناک ارادہ جس کا ہاتھ پکڑ کر وہ مینار کی چوٹی تک پہنچا تھا کسی چھلاوے کی طرح آنِ واحد میں غائب ہو گیا اور اُس کی جگہ ایک معنی خیز مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیلتی چلی گئی!!

◆◆◆

معروف سفرنامہ نگار، افسانہ نگار اور شاعرہ تسنیم کوثر کا شعری مجموعہ

''سرگوشی''

شائع ہو گیا ہے

قیمت-/200 روپے

رابطہ : سنگت پبلشرز، C-25۔ لوئر مال، لاہور (سیل:0333-4257755)

خالی گلدان

نجمہ عثمان (برطانیہ)

میری بیوی نے کچن میں جا کر برتنوں کو زور زور سے پٹخنا شروع کر دیا تھا۔ یہ گویا اس بات کا سگنل تھا کہ وہ غصہ کے انتہائی درجے پر پہنچ کر اسے پینے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ خود خاموش تھی لیکن اس کی ایک ایک حرکت شور مچا کر اعلان کر رہی تھی۔۔

'میں غصہ میں ہوں۔۔خون کے گھونٹ پی رہی ہوں۔۔مجھے چھیڑو گے تو پچھتاؤ گے۔۔'۔ میں حالات کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے انتہائی صبر وتحمل کا مظاہرہ کرنے پر مجبور تھا۔ نہ میں اسے سمجھانے کی لا حاصل کوشش کروں گا اور نہ ہی اس کے برتنوں پر زور آزمائی کے فن پر تبصرے کی جسارت کروں گا۔ مجھے باہر سے زیادہ گھر کے اندر کے موسموں پر کڑی نظر رکھنی پڑتی ہے۔ اور اس کے مزاج کے موسم کے لحاظ سے اپنی گفتگو اور حرکات وسکنات کو بدلنا پڑتا ہے۔ ایک اچھے پرسکون ماحول کے لئے یہ بہت ضروری ہے اور ایک عرصے سے یہ ہمارے گھر کے معمولات میں شامل ہو گیا ہے۔ میں نے ٹی وی پر بی بی سی چینل پر نو بجے کی خبریں لگا دیں۔ اور ڈرتے ڈرتے آواز بڑھا دی۔ مجھے معلوم ہے کہ ذرا بھی والیوم بڑھا اور اس نے کچن سے آواز لگائی۔۔'یہ محلے بھر کو خبریں کس خوشی میں سنائی جا رہی ہیں'؟

اگر اس وقت اس کے برتنوں کی زور آزمائی کے شور پر خبروں کی آواز حاوی ہو گئی تو وہ اسے بھی اپنے خلاف محاذ آرائی میں شامل سمجھ لے گی اور ابھی وہ جذباتی پسپائی کے لئے تیار نہیں۔ میں نے خبروں پر دھیان دینے کی کوشش کی۔ ریجنل خبریں شروع ہو گئی ہیں۔۔۔'' تین سالہ بچے کے قتل کے الزام میں دولڑکے پولیس کی حراست میں'۔۔۔۔'' امریکہ میں ایڈز کے بیمار بچے کی پیدائش۔۔۔۔۔۔لندن کی ایک کاؤنٹی میں دو نوجوان شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔۔۔۔ میں نے گھبرا کر چینل بدل دیا۔۔۔ میرے مولا! یہ خوفناک جرائم، بھیانک بیماریاں۔۔ یہ کیسی ترقی ہے۔۔۔۔ نئی نسل کہاں جا رہی ہے۔۔ یہ ذہنی تنزل اور کیا رنگ دکھائے گا۔۔؟

''کچھ پتہ بھی ہے وقت کیا ہوا ہے؟'' وہ نہ جانے کب کچن سے نکل کر میرے سامنے کے صوفے پر آ کر بیٹھ چکی تھی۔ گویا غصے کا طوفان گزر چکا تھا۔

''ساڑھے نو بجے ہیں۔'' میں ٹی وی کے کلاک کی طرف اشارہ کیا۔

''اور صاحب زادے ابھی تک غائب ہیں؟'' اس کا یہ معنی خیز جملہ کسی بڑے طوفان کی آمد کا پتہ دے رہا تھا۔

''بھئی اس نے فون تو کر دیا تھا کہ رات دیر سے آئے گا۔ اور ابھی تو صرف۔۔۔۔۔''

میرا جملہ پورا ہونے سے پہلے اس نے اپنے وسوسوں کی تمہید باندھ لی۔'جنید آج کل روز ہی دیر سے آتا ہے۔ کام کا بھی اچھا خاصا لوڈ ہے پھر اوپر سے یہ یاری دوستی۔۔ اور باہر کا کھانا۔۔ صحت کا ستیاناس ہو جائے گا۔ گھر آ کر بھی کون سا ہمیں وقت دے پاتا ہے۔

(وہ جان بوجھ کر 'ہمیں' کا صیغہ استعمال کرتی ہے۔حالانکہ ماں بیٹے کی لاڈ پیار کی گفتگو میں، میری شمولیت آٹے میں نمک کے برابر ہوتی ہے اور میں اکثر کسی دوسرے کام میں مصروف ہو جاتا ہوں)۔

'جوان لڑکا ہے۔کب تک لگام ڈالے رکھو گی۔کل کلاں شادی ہوگی۔اس کی اپنی زندگی ہوگی'۔

وہ بھڑک اٹھی۔' وقت آنے پر شادی بھی ہو جائے گی۔ابھی تو جاب شروع کی ہے۔تھوڑا آرام کر لے پھر ساری عمر ذمہ داری ہی نبھانی ہے۔مجھ سے کہہ رہا تھا میرے لئے لڑکیاں دیکھیں۔میں نے صاف انکار کر دیا'۔

' کیوں؟' میں حیران ہو کر اسے دیکھنے لگا۔' بیٹے کے لئے چاند سی بہولانے کا سپنا پورا نہیں کرو گی؟''

وہ میرے سوال کو نظر انداز کر کے اپنی دھن میں بولتی چلی گئی۔'لڑکیاں نہ ہوئیں بھیڑ بکریاں ہو گئیں۔ناپ تول کے پسند کیا اور حلال کر ڈالا۔ان کی اپنی بھی تو کوئی سوچ یا معیار ہوتا ہے۔اس پڑھے لکھے زمانے میں بھی یہ فرسودہ روایت چلی آ رہی ہے۔اور پھر ہر کام کے لئے وقت مقرر ہے۔۔''

''والدین اپنے بچوں کے لئے صحیح فیصلہ کرتے ہیں۔ہماری شادی بھی تو ایسے ہی ہوئی۔دیکھ لو۔۔کتنی کامیاب اور حسین جوڑی ہے''۔میں نے ڈرتے ڈرتے اسے چھیڑنے کے لئے کہا۔

''یہ ہماراذکر کہاں سے آ گیا؟'' وہ بات کو بدلنے میں یوں بھی خاصی مہارت رکھتی ہے۔

'جنید کو ابھی میچور ہونے کے لئے وقت چاہئے۔۳۲ سال کا ہو گیا اور باتوں میں اب تک بچپنا ہے'۔

مجھے دل ہی دل میں ہنسی آنے لگتی ہے۔ہر ماں کو اس کا بیٹا بچہ ہی نظر آتا ہے۔جنید ماں کو خوب بیوقوف بناتا ہے۔اپنی من مانی کرتا ہے اور اس کے آگے یتیموں کی سی صورت بنائے گھومتا ہے۔نماز روزے کا پابند،ٹوپی پہن کر جمعہ کی اور عید بقرعید کی نماز بھی پڑھنے جاتا ہے۔ماسٹرز کرنے کے بعد جاب بھی مل گئی ہے۔ پوری تنخواہ ماں کے ہاتھوں میں لا کر دیتا ہے اور پھر باتیں بنا کر اچھی خاصی رقم وصول بھی کر لیتا ہے۔جب چھوٹا تھا تو بات دوسری تھی۔اس کی چھوٹی سے چھوٹی خواہش ماں کے لئے دنیا کی اہم ترین چیز ہوتی تھی۔اسکول کی عمر تک تو اس کے کپڑوں کی ساری خریداری میری بیوی نے کی۔میرے لئے بھی ہر چیز وہی خریدتی ہے۔دیکھا جائے تو نہ مجھے بازار جانے کا شوق ہے اور نہ بیوقوفوں کی طرح بیوی کے پیچھے پیچھے شاپنگ کے تھیلے لادکر چلنے کا۔میرا یہ روّیہ دیکھ کر اب وہ تنہا شاپنگ کے لئے جاتی ہے۔یا کبھی کبھی جنید بھی اس کے ساتھ چلا جاتا ہے۔واپسی پر میری بیوی کی خوشی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے اور اس کا ''جنید نامہ'' شروع ہو جاتا ہے۔''بیٹا یوں سارے شاپنگ سینٹر میں اسے گھماتا رہا۔ریسٹورینٹ میں چائے پلائی۔اور اس کے لئے نہ جانے کیا کیا خرید ڈالا۔اور وہ بھی سب اس کی پسند کا۔بیٹا اس کی گود میں لاڈ سے سر رکھ دیتا ہے۔

'اماں یہ تو کچھ بھی نہیں۔یو آر دی بیسٹ مدر۔اگلی دفعہ میں آپ کو سینٹرل لندن لے جاؤں گا، وہاں زیادہ چوائس ہے'۔مجھے ماں بیٹے کا یہ پیار دیکھ کر بے حد خوشی ہوتی ہے اور نہ جانے کیوں ڈر بھی لگتا ہے۔لیکن میں اپنے خدشات اپنے تک ہی محدود رکھتا ہوں۔میں زندگی میں اتنی جذباتیت کا قائل نہیں ہوں۔جنید پھر دیر سے آیا اور ماں کی خفگی کو اس نے منٹوں میں دور کر دیا۔اب دونوں لاونج میں بیٹھے باتیں کر رہے ہیں اور بات بے بات اونچی آواز میں قہقہے لگا رہے ہیں۔کل سے ویک اینڈ کی چھٹی ہے۔اس لئے جنید تو بارہ بجے سے پہلے کیا اٹھے گا۔البتہ ہفتے کو میری بیوی مارکیٹ سے پھل اور سبزیاں لینے جاتی ہے اور وہ بھی بہت صبح۔میں ٹی وی بند کر کے ان کے

پاس جا بیٹھا۔

'کیا ساری رات گپ مارنے کا ارادہ ہے؟ مجھے تو نیند آرہی ہے'۔میں نے ماں بیٹے سے پوچھا جنید نے بڑے لاڈ سے ماں کی طرف دیکھا 'اماں! آپ کے ہاتھوں سے بنی کافی مل جائے تو۔۔۔اینڈ ون فور مائی ابو'۔

میرے کچھ کہنے سے پہلے میری بیوی کچن کی طرف چلی گئی۔

''بھئی کیا زبردستی ہے۔مجھے اس وقت کافی نہیں پینا۔''

ماں کے جاتے ہی جنید نے جلدی سے میرے قریب آکر سرگوشی کی 'ابو! مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔کل اماں کے مارکیٹ جانے کے بعد'۔

''مجھ سے؟ میں مکمل سوالیہ نشان بن گیا۔یعنی اپنے باپ سے۔۔۔تم تو۔۔'۔

جنید نے میرا ہاتھ دبا کر مجھے چپ کر دیا۔سامنے سے میری بیوی آرہی تھی۔

رات بھر میں الجھن کا شکار رہا۔جنید مجھ سے کیا کہنا چاہتا ہے۔اسے کیا پریشانی ہے۔کوئی ایسی ویسی حرکت تو نہیں کر بیٹھا۔

صبح جیسے ہی میری بیوی گھر سے باہر نکلی۔۔جنید میرے بیڈروم میں آگیا۔ بال منتشر۔۔آنکھیں سرخ۔۔جیسے ساری رات جاگتا رہا ہو۔وہ بڑی دیر بیڈ پر بیٹھا کچھ سوچتا رہا۔۔جیسے کوئی فیصلہ کررہا ہو یا کچھ کہنے کے لئے الفاظ ڈھونڈ رہا ہو۔میں اس کو غور سے دیکھ رہا تھا۔اس کی ذہنی کشمکش کو محسوس کر رہا تھا۔وہ بولا تو اس کی آواز کے سنجیدہ پن سے میں چونک پڑا۔

ابو! بات یہ ہے کہ۔۔۔مجھے۔۔یعنی میں۔۔آئی مین۔۔آئی ایم ان لو۔۔

میں ہونقوں کی طرح اسے دیکھ رہا تھا۔۔پھر ہنسنے لگا۔۔'تم مذاق کر رہے ہو۔۔یہ ڈرامہ بازی اپنی اماں کے ساتھ کرنا'

اس نے زخم خوردہ نظروں سے مجھے دیکھا' میں سچ کہہ رہا ہوں ابو۔۔پلیز!

اچانک ہی مجھے احساس ہوا کہ معاملہ واقعی نازک ہے۔ورنہ اتنا جذباتی ہوتے میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا۔

'او کے بیٹا!' میں اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس کے پاس بیٹھ گیا۔۔'اب بتاؤ'۔

'مجھے وہ اچھی لگتی ہے۔وہ بہت اچھی ہے۔۔وہ۔۔۔'' میرا بیٹا جو اتنا باتونی تھا۔اسے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔

'کس کی بات کر رہے ہو۔تفصیل تو بتاؤ۔اور ڈرومت'۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔

اب اس کی جھجھک کم ہوگئی تھی۔اس نے بتایا۔'' فرحانہ اس کے آفس میں کام کرتی ہے۔بہت غصیلی لیکن محنت کرنے والی۔آفس کے دوسرے مرد اس سے بات کرتے ہوئے ڈرتے ہیں۔جنید کی اس سے بہت کم بات چیت ہوتی ہے۔لیکن شاید وہ بھی اسے پسند کرنے لگی ہے۔''

''تمہیں کیسے پتہ؟'' میرا سوال بڑا قدرتی سا تھا:

''ابو! وہ میری پسند ناپسند کا بڑا خیال رکھتی ہے۔مجھے بغیر بتائے میرا کافی مگ دھوکر رکھ دیتی ہے۔میرے ڈیسک پر تازہ گلاب کے پھول سجے ملتے ہیں۔اسے صفائی بہت پسند ہے، پھولوں سے عشق ہے بالکل اماں کی طرح'۔پھر ہنس کر بولا' غصہ بھی ان کی طرح کا ہے۔کس مشکل سے میں نے اس کا موبائل نمبر حاصل کیا ہے۔اپنے دوست کے یہاں بیٹھ کر اس کو فون کرتا ہوں

اس لئے گھر بھی دیر سے آتا ہوں۔شروع میں تو وہ بات ہی نہیں کرنا چاہتی تھی۔اب بھی ڈرتے ڈرتے مختصر سی گفتگو کرتی ہے۔''

'مجھے یہ سب کرنا اچھا نہیں لگتا نہ اسے پسند ہے۔بتائیں ابو میں کیا کروں؟۔اماں کو کیسے بتاؤں؟

''وہ نہ جانے کیسے ری ایکٹ کریں گی۔۔آئی ایم سو کنفیوزڈ ۔میرا کسی کام میں جی نہیں لگتا۔'

تمہیں تو واقعی محبت وغیرہ ہوگئی ہے۔تم بھی اسے تحفے دیتے ہو۔یا معاملہ خشک چل رہا ہے۔' میں نے ماحول کو ذرا خوشگوار بنانے کی کوشش کی۔

'اسے کتابیں پڑھنے کا بہت شوق ہے۔دو تین اس کی پسند کے رائٹرز کی ناول خرید کر دیں۔اس نے لے تو لیں لیکن اندر کا صفحہ جہاں میں نے اپنا نام لکھا تھا پھاڑ کر پھینک دیا۔بہت ڈرتی ہے اپنے والدین سے'۔

'اس زمانے میں بھی؟'میں سخت حیران تھا۔

'اماں کو تو بتانا ہی ہوگا۔اس کے گھر والوں سے بھی ملنا ہوگا'۔جنید پھر بہت مضطرب ہو گیا۔' کہیں اس کی شادی کسی اور سے نہ ہو جائے۔وہ بہت ڈرپوک ہے۔کچھ نہیں کہے گی۔'

''بیٹا یہ اکیسویں صدی ہے۔اور یہ پیار محبت اس عمر کی نادانی ہے۔آج اس سے ہوا کل کوئی اور۔پھر سب غائب۔تم بھی بھول جاؤ گے اور وہ لڑکی بھی۔'میں اسے اس جذباتی سین سے نکالنے کی کوشش کی۔

'آئی نیو۔یو ول ناٹ انڈرسٹینڈ'۔جنید چیخ اٹھا۔اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

وہ دروازے میں نہ جانے کب سے کھڑی تھی۔میں جنید کو تسلی دینے کے لئے کھڑا ہوا تو وہ مجھے نظر آئی۔اس سے پہلے کہ میں اس سے کچھ کہتا۔وہ تیزی سے مڑی اور دھپ دھپ کرتی زینہ اتر گئی۔اب وہ کچن میں جا کر اپنا غصہ بے جان برتنوں پر نکالے گی۔ جنید نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔''اب کیا ہوگا''۔سوال ہم دونوں کے چہرے پر لکھا ہوا تھا۔

ہم باپ بیٹے نے کافی دیر انتظار کیا۔ہنوز خاموشی تھی۔۔ایک عجیب سناٹا۔وہ کچن میں کیا کر رہی تھی؟ میں نے نیچے آ کر جھانکا۔جنید اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔وہ چائے بنا رہی تھی۔اپنے لئے مگ میں بنا کر وہ اوپر جانے لگی۔اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔غصے سے یا رونے سے۔میں پہچان نہیں پایا۔

'اب ہوگا۔ماں بیٹے کا معرکہ۔اور مجھے جنید کی مدد کرنی چاہئے'۔یہ سوچ کر میں اس کے پیچھے چلا۔وہ جنید کے کمرے کے سامنے سے گزرتی ہوئی۔اپنے بیڈروم کی طرف مڑ گئی اور دروازہ بند کر لیا۔

شاید اس نے ہماری ساری باتیں سن لی تھیں۔ابھی شاک کی کیفیت سے گزر رہی ہے۔میں بیڈروم کے دروازے کے پاس کھڑا سوچتا رہا۔اسے ابھی اور وقت چاہیے ایسی دھماکہ خیز خبر کو ڈائجسٹ کرنے کے لئے۔میں جنید کے کمرے میں چلا گیا۔ابھی تو ہم دونوں نے کپڑے بھی نہیں بدلے تھے۔مجھے چائے کی طلب ستا رہی تھی اور جنید کمرے سے باہر آنے کو تیار نہیں تھا۔میری بیوی ہمیشہ مجھے چائے بنا کر دیتی ہے۔اور جب اسے غصہ آتا ہے تو کئی دفعہ نہ صرف چائے کافی ملتی ہے بلکہ کھانے میں بھی نئی ڈشز کا اضافہ ہو جاتا ہے۔آج یہ غیر معمولی بات ہوئی تھی۔ وہ میرے لئے چائے بنانا ہی بھول گئی تھی۔میں بیٹے سے ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔کافی وقت گزر گیا۔کھٹکا ہونے پر میں باہر آیا۔وہ نیچے جا رہی تھی۔یعنی اب بھی بات کرنے کا موقع نہیں تھا۔میں نے جنید سے کپڑے بدلنے کے لئے کہا اور اپنے بیڈروم

میں آ گیا۔ وہ یہاں اتنی دیر تک کیا کرتی رہی تھی۔۔ بستر سلیقے سے بنا ہوا تھا۔ ہر چیز اپنی جگہ پر تھی۔ وہ اکثر غصے میں الماریوں کی درازیں الٹ دیتی ہے اور ان کو پھر نئے سرے سے ترتیب دینے بیٹھ جاتی ہے۔ یا پرانے البم نکال کر دیکھنے لگتی ہے۔ جنید کی بچپن سے لے کر اب تک کی ڈھیروں تصویریں ہیں۔ ہم میاں بیوی کی ایک ساتھ بہت کم تصاویر ہیں۔ شاید اتفاق ہی ہے کہ مجھے کیمرے کی طرف دیکھ کر بلا وجہ مسکرانے کا کوئی شوق نہیں اور وہ وقت پڑنے پر دکھے دل کے ساتھ بھی مسکرا سکتی ہے۔

اسی سوچ میں کپڑے بدلنے کے لئے کھڑکی کے پردے برابر کئے تو پردے کے پیچھے رکھا ہوا گلدان نیچے گر گیا۔

ہمیشہ یہی ہوتا چلا آیا ہے۔ جب پردہ برابر کرنے یا کھولنے جاتا ہوں۔ گلدان پر ہاتھ پڑ جاتا ہے۔ سو مرتبہ بیوی کو سمجھایا کہ یہاں گلدان رکھنے کا کیا جواز ہے اور وہ بھی خالی۔ دوسرا خالی گلدان اس کی بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھا رہتا ہے۔

یہ دونوں خوبصورت نقشین پیتل کے گلدان ہمارے سامان میں لد کر پاکستان سے لندن آئے تھے۔ اس کے میکے کے تحائف اور بہت سے اوٹ پٹانگ سامان کے ساتھ۔

میں گھر کی سجاوٹ وغیرہ میں کبھی دخل نہیں دیتا۔ میری یہ عادت بھی شاید اور شوہروں سے مختلف ہے اور کم از کم اس بات پر ہمارے یہاں کبھی بھی اختلاف رائے کی نوبت نہیں آئی۔

بالوں میں کنگھا کرتے ہوئے سوچا۔ اب تو نیچے جا کر اس طوفان کا سامنا کرنا ہی ہے۔ میز پر سے اپنی گھڑی اٹھائی تو نیچے کی ادھ کھلی دراز پر نظر پڑی۔ اس میں درجنوں البم بھرے ہوئے ہیں۔ سب سے اوپر ایک بوسیدہ سا البم دراز میں پھنسا ہوا تھا۔ شاید وہ دھیان بٹانے کے لئے تصویریں لے کر بیٹھی ہو۔ البم کھینچ کر نکالا تو اس کا آدھا حصہ میرے ہاتھ میں آ گیا۔ یہ اس کی شادی سے پہلے کی تصویریں تھیں۔ درجنوں سہیلیوں، کزنز اور کنبے والوں کے ساتھ۔ میں بے خیالی میں البم کو الٹ پلٹ کے دیکھنے لگا۔

میری بیوی شادی کے وقت ایسی ہی خوبصورت اور اسمارٹ تھی۔ لیکن ان تصویروں میں جو اس کے ہونٹوں پر ہنسی تھی، شرارت بھری مسکان تھی۔ وہ بیوی بن کر غائب ہو گئی تھی۔ اکثر لڑکیاں شادی کے بعد سنجیدگی کا لبادہ پہن لیتی ہیں۔ میرے نزدیک یہ اچھی بات تھی خصوصاً مجھ جیسے شوہر کے ساتھ گزارہ کرنے کے لئے تو یہ بونس پوائنٹ تھا۔ پھر یہ بھی تھا کہ میں نے بھی اپنی بیوی کے بات بے بات غصہ کو برداشت کیا۔ ہوسکتا ہے وہ مجھ میں ایک تصوراتی، رومانٹک شخص کو ڈھونڈنے کی ناکام کوشش کرتی ہو جو میں کبھی بھی نہیں تھا۔

میرا دھیان پھر جنید کی طرف چلا گیا۔ صاحب زادے کو محبت ہو گئی ہے۔ اور دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔ لڑکی اسے دیکھ کر مسکراتی ہے۔ اس کی میز پر رکھے گلدان میں پھول سجاتی ہے۔ دونوں ایک ہی آگ میں جل رہے ہیں۔ انہیں سمجھانا کتنا مشکل ہوگا۔ ہوسکتا ہے۔ کوئی بات بن جائے۔ ان دونوں کی شادی ہو جائے۔

اور نہ ہوئی تو۔۔۔۔ جنید کچھ دن آہیں بھرے گا اور۔۔ وہ لڑکی۔۔ والدین کی خاطر کہیں اور شادی کے لئے تیار ہو جائے گی۔۔ اور بس۔۔۔ قصہ ختم۔۔۔ میں کچھ دیر البم میں اپنی بیوی کے ہنستے ہوئے چہرے کو تکتا رہا۔ پھر میری نظر ان دونوں خالی گلدانوں پر جا کر ٹک گئی۔ اتنے برسوں بعد میں نے ان کی موجودگی کو ایک نئے انداز سے محسوس کیا تھا۔ میں نے دکھی دل کے ساتھ اس البم کو واپس رکھ دیا۔ اب مجھے جنید کو جا کر تسلی دینی ہے کہ نہ صرف اس کی ماں بلکہ میں بھی اپنے بیٹے کی پسند کی شادی کے لئے ایک ساتھ مل کر کوشش کریں گے۔

◆◆◆

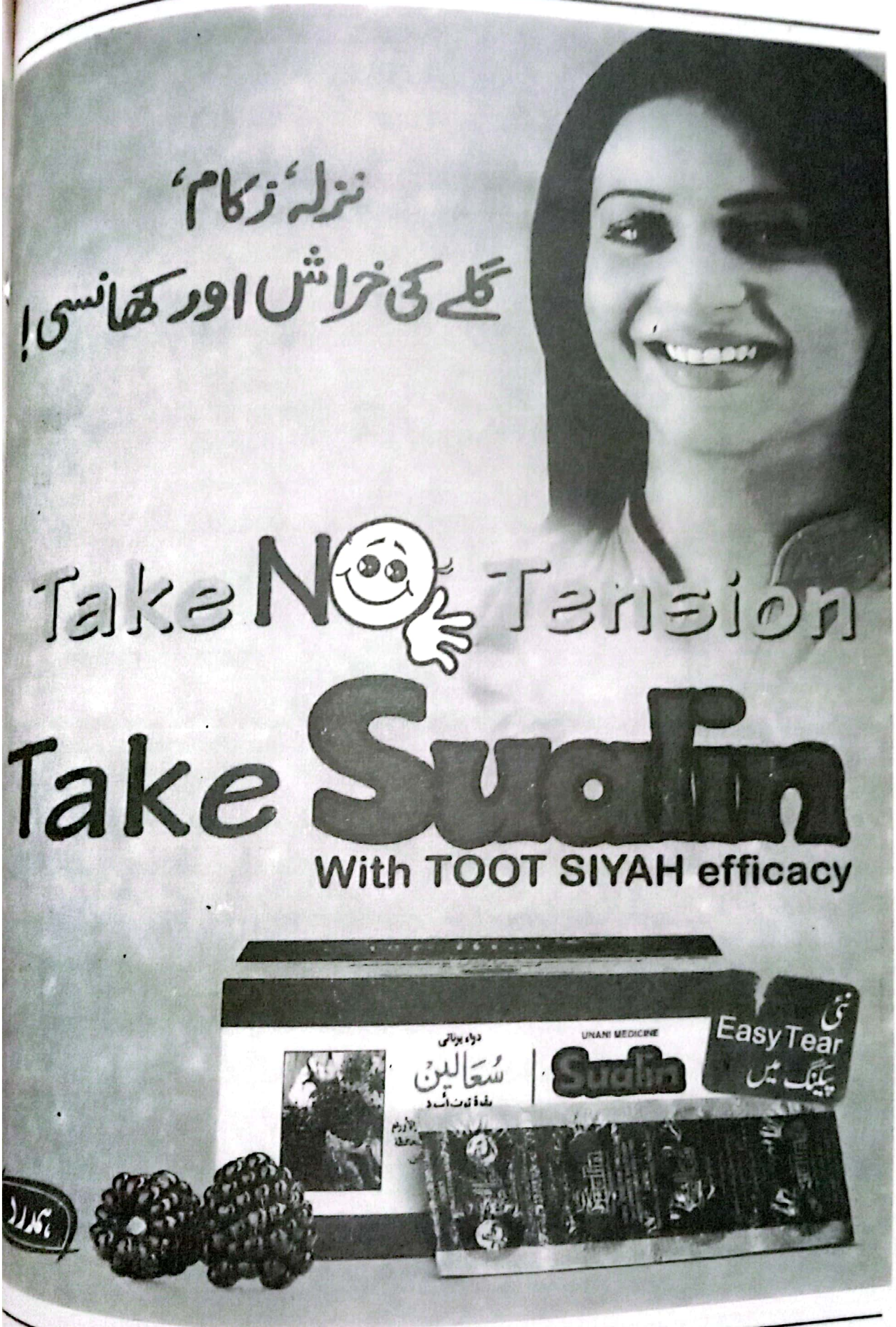
نزلہ، زکام،
گلے کی خراش اور کھانسی!
Take NO Tension
Take Sualin
With TOOT SIYAH efficacy
دواء یونانی
سُعالین
UNANI MEDICINE
Sualin
نئی
Easy Tear
پیکنگ میں
ہمدرد

غفورا خاکروب

حنیف باوا

وہ ہر روز ہماری گلی اور سڑک کی صفائی کے لیے آتا اور اُس وقت تک جھاڑو دیتا رہتا جب تک اُسے پورا یقین نہ ہو جاتا کہ اب گلی اور سڑک پر ایک تنکا تک موجود نہیں اور صفائی کرنے کے بعد وہ کبھی کسی کے دروازے کے سامنے کوڑے کرکٹ کا ڈھیر نہ لگاتا جو بھی گند مند ہوتا وہ اُسے اُٹھا کر کوڑا اسٹینڈ پر پھینک آتا۔ کوڑا اسٹینڈ ہماری گلی سے کچھ ہی فاصلے پر مغرب کی جانب سودھے قصائی کی دوکان کے عقب میں واقع تھا۔ وہ سٹینڈ بغیر کیس چار دیواری کے تھا۔ اسی لئے اُس کا کوڑا سامنے سے گزرنے والی سڑک تک آ جاتا۔ بعض لوگ تو کوڑے کو سڑک پر ہی پھینک دیتے۔ لیکن عبدالغفور عرف غفورا نے کبھی ایسا نہیں کیا وہ ہمیشہ کوڑے کی ریڑھی کو کوڑے سٹینڈ کے درمیان خالی کر کے آتا۔

عبدالغفور کو اکثر لوگ غفورا کہہ کر پکارتے حالانکہ اُس نے متعدد مرتبہ اُن لوگوں سے کہا بھی تھا کہ مہربانی کر کے اُسے اس کے اصل نام سے پکارا جائے لیکن لوگ ٹس سے مس نہ ہوتے۔ اُسے غفورا کہہ کر ہی بلاتے۔ شائد وہ اُس کے کام اور اُس کے سوشل سٹیٹس کو مدنظر رکھ کر اُسے غفورے کے نام سے ہی یاد کرنے پر بہ ضد تھے۔ چونکہ میں بھی تو اسی ناانصاف معاشرے کا حصہ ہوں اس لئے میں بھی اُسے غفورے کے نام سے ہی پکارتا تھا۔

غفورا تھا تو خاکروب لیکن دیکھنے میں ایسا نہیں لگتا تھا۔ وہ ہمیشہ صاف ستھرا لباس پہن کر آتا۔ بال ہمیشہ کنگھی کئے ہوتے۔ اگر چہ اُس کا لباس اتنا قیمتی تو نہ ہوتا لیکن اس قدر عمدہ ہوتا کہ وہ قیمتی کپڑوں کو مات دیتا دکھائی دیتا۔ جوتا چاہے کم قیمت کا ہوتا لیکن وہ سدا اُسے چمکائے رکھتا۔ وہ دو چار جماعتیں بھی پڑھا ہوا تھا۔ فارغ وقت میں وہ شہر کی میونسپل لائبریری جاتا۔ وہاں اخبار پڑھتا کئی ہفت روزہ رسائل کا بھی مطالعہ کرتا۔ اور جو لوگ پہلے سے موجود ہوتے اُن کے ساتھ سیاست پر بھی بات کر لیتا۔ جب کبھی معاشرے میں بکھری برائیوں پر بات چل نکلتی تو وہ اُس میں بھر پور حصہ لیتا۔ اُس کے اس مطالعہ اور لوگوں کے ساتھ اس گفتگو نے اُس میں کچھ خود کو پہچاننے کا بھی شعور پیدا کر دیا تھا۔ اسی لئے اس میں دوسرے خاکروبوں کے برعکس قدرے خود اعتمادی در آئی تھی تب ہی تو وہ کسی سے کچھ نہ لیتا تھا۔ کچھ نہیں مانگتا تھا۔ کبھی کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلاتا۔ اگر کوئی اُس کے اچھے کام کو دیکھ کر چند ٹکے دینے کی کوشش کرتا تو وہ فوراً انکار کر دیتا اور کہتا:

''نہیں صاحب جی! میں اپنے کام کے سرکار سے پیسے لیتا ہوں اور عمدہ صفائی کرنا میرا فرض بھی تو ہے۔''

ایک روز میں نے اُس کے جاذب نظر چہرے، لباس کی صفائی ستھرائی اور اُس کی بلند قامتی کو دیکھ کر اُس سے پوچھا۔

''تم اپنا فرض پوری دیانت داری سے ادا کر رہے ہو۔ دیکھنے میں خوب رُو بھی ہو۔ شرافت تمہارے اندر کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ ان خوبیوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے میں تم سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔ اُمید ہے اس کا جواب ضرور دو گے۔''

میری باتیں سُن کر اُس نے جھاڑو دینا چھوڑ دیا۔ پہلے تو اُس نے جھاڑو کو نیچے رکھا پھر گویا ہوا:

''جی صاحب جی۔ حکم کریں، پوچھیں۔''

''تمھاری شادی ہو چکی ہے یا نہیں؟''

''نہیں سرابھی نہیں ہوئی''......اُس نے بڑی عاجزی سے جواب دیا۔

کیوں، کیا وجہ کیوں نہیں ہوئی؟ اب تک تو تمھیں شادی کے بندھن میں بندھ جانا چاہیئے تھا۔ ماشااللہ تم خوبصورت بھی اور سلیقہ شعار بھی ہو اور پھر تمھاری عمر بھی شادی کے بندھن کی حدوں کو چُھو رہی ہے۔''

''سر آپ درست فرما رہے ہیں۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ میرے نکاح میں کوئی ایسی لڑکی آئے جو ناپسند ہو اور خود کو پہچاننے کے قابل ہو۔ فقیروں کی طرح ہاتھ نہ پھیلائے اور مانگے تانگے کے کپڑے نہ پہنے۔''

''اگر تم ایسے خیالات رکھتے ہو تو جاروب کشی سے کنارہ کشی اختیار کر لینی چاہیئے۔''

''سر اگر جاروب کشی سے مراد جھاڑو دینے کے پیشے سے ہے تو میں اس کو بُرا نہیں سمجھتا۔ ہاں یہ کام اُس وقت حقیر ہو جاتا جب انسان اس میں رہتے ہوئے ہاتھ پھیلانا شروع کر دے۔''

''غفورے! بے شک تمھارے خیالات بڑے بلند ہیں۔ پھر بھی تمھیں اب شادی رچا ہی لینی چاہیئے۔ وہ جو ساتھ والی گلی میں ایک خاکروبہ صفائی کرتی ہے وہ تمھاری طرح خوبصورت بھی ہے۔ لباس بھی اُس کا اتنا بُرا نہیں۔ کیا میں اس کے باپ سے بات کروں؟ وہ میری بات مانتا بھی ہے۔''

''نہیں صاحب جی! وہ ہاتھ پھیلاتی ہے۔ وہ خود کو نیچ سمجھ کر گھر گھر جاتی ہے۔ مجھے ایسی لڑکی قطعاً پسند نہیں۔''

اس کی یہ باتیں سن کر میں خاموش ہو گیا کیونکہ میرے لئے اب کہنے کو کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ میں چند لمحوں کیلئے اپنی دہلیز پر کھڑا رہا۔ اس دوران اُس نے جھاڑو اُٹھایا اور پھر سے صفائی میں مصروف ہو گیا۔ تب میں اُس کی بھرپور جوانی کے بارے میں سوچتا ہوا اندر چلا گیا۔ اس کے بعد میں نے اس موضوع پر پھر کبھی بات نہ کی۔ ''ہر روز آتا سڑک اور گلی کی صفائی کرنے کے بعد سیدھا گھر چلا جاتا۔

ہمارے گھر کے سامنے گلی کی دوسری جانب ایک عالی شان مکان تھا۔ اُس میں جہانگیر نامی ایک زمیندار رہتا تھا اُس کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا۔ ان میں جو بڑی تھی اُس کا نام نزہت تھا۔ نزہت ایف۔ اے کے بعد پڑھائی کو خیر باد کہہ کر گھر بیٹھ رہی تھی۔ اس سے چھوٹے دونوں بہن بھائی لاہور میڈیکل میں داخل تھے۔ چھوٹی بہن فوزیہ بھائی اسلم سے ایک سال پیچھے تھی۔ وہ دونوں کالج کے ہوسٹل میں رہتے تھے۔

زمیندار جہانگیر زیادہ تر زمینوں پر ہی رہتا تھا۔ مہینے میں ایک آدھ بار گھر کا چکر لگاتا۔ گھر پر نزہت اور اُس کی امّی رہتے تھے۔ نزہت بڑے دھیمے مزاج کی خاموش طبع لڑکی تھی۔ شکل وصورت تو اُس کی واجبی سی تھی لیکن اُس کے چہرے کا ہلکا سا میک اپ اور لباس کی سادگی اس میں جاذبیت پیدا کرنے میں ایک اہم رول ادا کر رہے تھے۔ وہ باتیں بھی بہت کم کرتی تھی۔ وہ کم آمیز تھی اسی لئے اُس کا اڑوس پڑوس میں آنا جانا بھی بہت کم تھا۔ وہ زیادہ وقت اپنے گھر میں گزارتی۔ دل بہلاوے کے لئے اُس نے کتابوں سے دوستی کر رکھی تھی۔ اُس کے مطالعہ میں زیادہ تر اردو فکشن کی کتابیں رہتی تھیں۔ کبھی اُس کے ہاتھ میں کوئی افسانوں کا مجموعہ ہوتا اور کبھی کوئی معیاری ناول اُس کے

ذوق کی تسکین کرتا۔ وہ ہمیشہ گلی کی جانب والی بیٹھک کا دروازہ کھلا رکھتی درمیان میں صرف مہین سا پردہ لٹکا ہوتا۔ جب غفورا گلی کی صفائی کرتا ہوا دروازے کے پاس سے گزرتا تو اچانک نزہت کی نظر اُس کی جانب اُٹھ جاتی۔ چند لمحوں تک اُس کی نگاہیں غفورے پر جمی رہتیں لیکن جلد ہی وہ پھر مطالعہ میں مستغرق ہو جاتی۔ غفورا بھی نزہت کو ایک نظر دیکھتا اور اس باریک پردے کے پیچھے سے مدھم سی جھلک دل میں اتار کر آگے بڑھ جاتا لیکن وہ لمحہ غفورے کے اندر ایک کسک سی چھوڑ جاتا جو کچھ دیر قائم رہنے کے بعد اُس وقت اُس کے اندر کہیں روپوش ہو جاتی جب وہ دوبارہ اپنے کام میں مگن ہو جاتا۔ لیکن دوسرے دن جب وہ کام پر آتا تو وہ کسک پھر سے جاگ اٹھتی اور نزہت کو پیار بھری نظروں سے دیکھتا ہوا آگے بڑھ جاتا۔

ایک روز جب غفورا صفائی کرتا ہوا نزہت کی بیٹھک کے دروازے کے پاس پہنچا تو نہ جانے نزہت کو کیا ہوا کہ وہ فوراً کرسی سے اُٹھ کر پردے کو ایک طرف سرکاتے ہوئے دروازے کے پاس آ کر بولی...... ''غفورے ہماری اس ڈیوڑھی میں بھی جھاڑو لگا دیا کرو۔''

''اچھا بی بی جی لگا دیا کروں گا'' غفورے کو تو جیسے چاچڑھ گئے۔

اس کے بعد وہ ہر روز پہلے نزہت کے گھر کی ڈیوڑھی صاف کرتا۔ جتنی دیر وہ جھاڑو دیتا نزہت اُس کے پاس کھڑی رہتی۔ وہ صفائی کرنے کے بعد بغیر کچھ کہے، کوئی بات کئے، نگاہیں جھکائے وہاں سے چلا جاتا۔

چند روز تک تو یہ سلسلہ حسبِ معمول چلتا رہا لیکن پھر غفورے کے دل میں کچھ کچھ ہونے لگا۔ نزہت کی موہنی صورت اور کھنکتی آواز اُس کے دل میں گھر کرنے لگی تھی۔ اب وہ کبھی کبھار اُس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھنے لگا تھا۔ جیسے ہی اُس کی نگاہیں اُس کے چہرے پر مرکوز ہوتیں تو فوراً اُس کی آنکھوں میں حیا سمٹ آتی۔ وہ بغل میں جھاڑو دبا کر جھٹ باہر آ کر گلی کی صفائی میں مصروف ہو جاتا۔

آخر وہ خوبصورت تھا، جوان تھا، لباس بھی صاف ستھرا پہنتا تھا جو اُس کے چھریرے بدن پر خوب سجتا تھا۔ جب سے وہ نزہت کے ہاں جھاڑو دینے لگا تھا اُس کے چہرے کی رونق میں اضافہ ہونے لگا تھا۔ وہ ایسی ہی لڑکی کو اپنانے کا خواہش مند تھا۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے اُس کے اور نزہت کے بیچ معاشرتی اونچ نیچ حائل تھی۔ اگرچہ کام کے دوران نزہت اُس کے پاس کھڑی رہتی اور مسلسل اُسے تکے جاتی لیکن غفورے میں اتنی جرأت نہ ہوتی کہ وہ اُسے نظر بھر کر دیکھتا۔ تاہم نزہت کے سانولے سلونے حُسن کی کشش اُسے اپنی جانب کھینچے چلی جا رہی تھی۔ لیکن وہ اپنے دل میں اُٹھتی ہوئی چاہت کا اظہار کرنے سے قاصر تھا۔ اگر کبھی وہ اُس سے بات کرنے کی سوچتا بھی تو اُس کی غربت اور جاروب کشی اُس کے آڑے آ جاتی تو اُس کی وہ سوچ اس کے اندر ہی کہیں دفن ہو کر رہ جاتی۔

اُس روز جب وہ نزہت کے مکان کے صحن کی صفائی کر رہا تھا تو اس وقت تو نزہت نے غفورے کے بارے میں ایک لفظ بھی نہ کہا لیکن جب وہ صفائی ختم کر کے جانے لگا تو نہ جانے نزہت کے دل میں کیا آئی کہ وہ اُسے روک کر کہنے لگی۔

''غفورے''؟

''جی بیگم صاحبہ۔'' غفورا رُک کر کہنے لگا۔

''غفورے تو بہت اچھا ہے'' یہ جملہ ادا کرتے وقت نزہت کے چہرے پر وہی سنجیدگی، وہی گھمبیرتا تھی جسے وہ اپنے پُرکشش چہرے پر ہمیشہ سجائے رکھتی تھی۔

غفورا اُس کے منہ سے اپنی تعریف سُن کر کچھ بوکھلا سا گیا۔ اسی لئے منہ سے کچھ نہ بولا۔ بس چہرے پر خوشی وانبساط سجا کر اُسے

ایسی نظروں سے دیکھنے لگا جس میں پیار ہی پیار تھا۔ چاہتوں کے کھلے پھول تھے جو وہ اُس پر نچھاور کر رہا تھا۔ چنانچہ چند لمحے اُس کی نظر نزہت کے چہرے کا لمس حاصل کرنے کے بعد واپس لوٹ آئی اور وہ فوراً وہاں سے پلٹا اور گلی میں آ گیا۔ اس کے بعد گلی کا باقی کام نپٹانے کو اُس کا جی نہیں چاہ رہا تھا چنانچہ اُس نے جھاڑو بغل میں دبایا اور گھر واپس آ گیا۔ آج وہ بہت خوش تھا اُسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے نزہت کے اُس جملے نے اس پر جادو کر دیا ہو۔ وہ تمام وقت مخمور سا ہو کر پھرتا رہا۔ اُسے ایسا لگنے لگا تھا جیسے اُس کے اندر اُس کے کہے ہوئے جملے کے تمام حروف ستاروں کی طرف جگمگا رہے ہوں اور وہ اُن کی روشنی میں وہ راستے ڈھونڈ رہا ہو جس پر چل کر وہ نزہت سے اپنے پیار سے مملو جذبات کا اظہار کر سکے لیکن وہ راستے اُس کی شرم وحیا کی دُھند میں چھپے ہوئے تھے۔

دن تو اُس کا سرشاری میں گزر گیا لیکن رات بیتنے میں نہیں آ رہی تھی۔ رات کا ایک ایک لمحہ اُسے پتھر کی طرح بھاری محسوس ہو رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ جونہی رات گزرے اور وہ پہلے اپنی نزہت کے سندر مکھڑے کے درشن کرے اور دیکھے کہ کیا وہ بھی اُس کے پیار میں اتنی ہی بے کل تھی جتنا کہ وہ تھا۔

خدا خدا کر کے رات اپنے انجام کو پہنچی جیسے ہی سورج نے دھرتی کو اپنا چہرہ دکھایا۔ وہ بستر سے اُٹھا۔ پہلے تو اس نے منہ ہاتھ دھو کر صاف ستھرے کپڑے زیب تن کئے، ناشتہ زہر مار کیا پھر جھاڑو اُٹھا کر نزہت کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ آج وہ نئے احساسات اور نئی سوچوں کے ساتھ نزہت کی طرف روانہ ہو گیا۔

جیسے ہی وہ وہاں پہنچا پہلے اُس نے دروازے پر دستک دی پھر وہ نزہت کو دیکھنے کے انتظار میں دہلیز سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ جب دروازہ کھلا تو دیکھا کہ وہاں نزہت کی جگہ اُس کی امی اُس کے سامنے تھی جسے دیکھ کر اُسے دھچکا سا لگا لیکن وہ جلد سنبھل کر اندر ڈیوڑھی میں چلا گیا۔ اُس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ بڑی بی بی سے نزہت کے بارے میں کچھ پوچھے۔ پھر اُس سے اس کا کوئی ایسا رشتہ بھی نہیں تھا جس کی بنا پر وہ اُس کی ماں سے بات کرنے کی جرأت کرتا۔

وہ مایوسی اور قدرے بے زاری کے عالم میں جھاڑو دیتا رہا۔ جب سارا کام ختم ہوا تو وہ جلدی سے ڈیوڑھی سے نکلا اور سیدھا اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا چونکہ اُس کا گلی کو صاف ستھرا کرنے کا موڈ نہیں رہا تھا اس لئے گلی کی صفائی کو ادھورا چھوڑ کر گھر پہنچ گیا۔

آج کی رات گذشتہ شب کی طرح اس کے لئے بھاری تھی۔ لیکن ان دونوں راتوں میں فرق تھا۔ گذشتہ رات نزہت سے جلد ملنے کی آرزو نے اُسے سونے نہ دیا تھا اور آج کی رات اُسے نزہت کے نہ دیکھنے کے دُکھ نے چین نہ لینے دیا۔ اُس کی یہ رات بھی کروٹیں بدلتے گزری۔ دوسرے دن جب سورج نے اپنا چہرہ دکھایا تو وہ جلد چارپائی سے اُٹھا اور کپڑے بدل کر ناشتہ کیے بغیر ہی نزہت کے گھر پہنچا تو اُس نے اسے بیٹھک میں کوئی کتاب پڑھتے ہوئے پایا۔ جب اُس کی نظروں نے اس کے چہرے کو نظر بھر کر دیکھا تو اس کے بے قرار دل کو قرار آ گیا۔ اُسے اس کے دوبدو ہونے میں زیادہ دیر نہ گی وہ جلدی ہی کتاب بند کر کے اُس کے سامنے آ گئی اور آتے ہی کہنے لگی:

''غفورے آج۔ اتنی جلدی۔ سورج کو تو ذرا اُبھرنے دیتے۔''

''جی میں نے سوچا کہ جلدی جا کر پہلے بی بی جی کا کمرہ صاف کر دوں۔''

نہیں غفورے میں نے تو اپنے کمرے میں جھاڑو دے لیا ہے۔'' اُس نے کچھ توقف کیا پھر گویا ہوئی ''غفورے آج تو نے بڑے

اچھے کپڑے پہن رکھے ہیں۔خیر تو ہے؟''

''ویسے ہی بی بی جی''۔غفورا تھوڑا سا جھینپ گیا۔

ویسے ہی۔کیا مطلب؟

''بی بی جی پرسوں آپ نے مجھے کچھ کہا تھا۔''

''کیا کہا تھا......کچھ یادنہیں آ رہا......ہاں یاد آیا۔یاد کرتے ہوئے۔کچھ اچھا کہا تھا میں نے''

''بس بی بی جی اسی خوشی میں آج میں آپ کے سامنے کچھ اچھا بن کر آیا ہوں۔بی بی جی کیا میں اچھا نہیں لگ رہا؟''

''لگ رہے ہو۔بالکل لگ رہے ہو۔''نزہت کا چہرے حسبِ معمول شانت تھا۔اُس کے اندر کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں تھی۔

''اچھا جی''......غفورے نے اچھا جی اس قدر زور دے کر کہا جیسے اُسے نزہت کی بات پر یقین نہ آ رہا ہو۔

''اچھا غفورے ذرا ٹھہر میں ابھی آئی۔''

اتنا کہہ کر نزہت اندر چلی گئی اور غفورے کے دل میں ایک سوچ اُبھری کہ شائد وہ اس کے لئے کوئی تحفہ لینے اندر گئی ہے۔اس سوچ نے اُس کے اندر کچھ بے چینی سی پیدا کر دی لیکن تھوڑی دیر بعد جب نزہت واپس لوٹی تو اُس کے ہاتھ میں کچھ نوٹ تھے وہ ان نوٹوں کو غفورے کی طرف بڑھا کر کہنے لگی۔

''غفورے یہ لو تیرے مہینے بھر کی محنت کا اجر۔''

یہ سُن کر غفورے کے اندر کے تمام خوشی دم بھر میں کافور ہوگئی۔وہ مایوسی کے عالم میں فوراً کہہ اُٹھا۔

''نہیں بی بی جی میں یہ پیسے نہیں لوں گا۔میں نے آپ کے گھر میں جتنا کام کیا وہ پیسوں کے لئے نہیں کیا۔''

''پھر کس کے لئے کیا؟''نزہت حیران ہو کر کہنے لگی۔

''آپ کے گھر کے لئے۔آپ کے لئے۔''

''میرے لئے کیوں؟''نزہت نے خفگی سے کہا۔

''اس لئے کہ آپ مجھے اچھی لگی تھیں۔جیسے میں آپ کو اچھا لگا تھا۔''

''اچھا چھوڑو ان باتوں کو''......نزہت نے مزید باتوں میں اُلجھنے سے اجتناب کرتے ہوئے مزید کہا۔

''رکھ لو یہ پیسے۔یہ تمھارے کام آئیں گے۔''

''نہیں بی بی جی۔غریب آدمی کا بھی دل ہوتا ہے۔عزت ہوتی ہے۔''

یہ کہتے ہوئے غفورے نے جھاڑو اٹھایا اور بے دلی سے قدم اُٹھاتا ہوا اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔نزہت اپنے گھر کی دہلیز پر کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

اس کے بعد غفورا پھر کبھی ہماری گلی میں صفائی کرتا نظر نہ آیا۔لیکن چند ماہ کے بعد سنا گیا تھا کہ وہ اب اُس گلی میں اس خاکروبہ کے ساتھ مل کر کام کرنے لگا تھا جو خوبصورت تھی،جوان تھی،کپڑے اچھے پہنتی تھی لیکن کبھی کبھار لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتی تھی۔

◆◆◆

رازِ اک مٹھی میں

سلمیٰ اعوان

سچی بات تو یہ ہے کہ میں زندگی میں رکھ رکھاؤ اور معیار کا بہت قائل ہوں۔ ''عشق نہ پُچھے ذات''۔ یہ مشہور زمانہ کہاوت قطعی بکواس۔ اب بھلا ایسا بھی اندھا عشق کیا کہ انسان مخمل میں ٹاٹ کے پیوند جوڑے اور جوڑ کر بڑا خوش ہو، جیسے وہ سٹوپڈ آصف بشیر متوسط طبقے کی ایک لڑکی کے پیچھے ایسا دیوانہ ہوا کہ شادی کی اور بچّے پیدا کیے۔ کبھی مِلو، حال احوال پُوچھو تو خود کو دُنیا کا خوش قسمت انسان سمجھتا ہے۔

بہر حال ایسی حماقتوں کی میری زندگی میں تو قطعی گنجائش نہیں۔

بڑی گرم دوپہر تھی۔ ڈرائنگ روم میں بڑے صوفے میں دھنسا ہیرالڈ The Herald دیکھ رہا تھا جب وہ پاگل سی میری ممیری بہن اُونچے اُونچے بولتی کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

''یہاں ایک میرا بے حد پیارا ممیرا بھائی رہتا ہے۔ بڑا نک چڑھا سا، بد دماغ سا، احمقانہ حد تک سٹیٹس کونشئس۔''

میری پیشانی شکن آلود ہوگئی تھی۔

جونہی وہ اندر داخل ہوئی میں نے بھی ہانک لگائی۔ ''ہے ایک میری کزن۔ نِری کریک پانڈا، ہیومن رائٹس کی علمبردار، مساواتِ انسانی کی قائل، دستر خوان پر گھر کے ملازموں کو ساتھ بٹھانے والی۔ مجھے سخت چڑ ہے اُس سے اور اُس کی فلاسفی سے۔''

میری پیشانی شکن آلود ہوگئی تھی۔ جونہی وہ اندر داخل ہوئی دفعتاً میں نے دروازے کی جانب دیکھا۔ ''ہیرالڈ'' میرے ہاتھ سے چُھٹ کر قالین پر ِگر گیا۔ ایک لڑکی دہلیز پر پردہ تھامے کھڑی تھی۔ کیسا چہرہ تھا۔ کیا قد بُت تھا۔ یوں لگا جیسے اُستاد اللہ بخش کا کوئی شاہکار دروازے پر آویزاں کر دیا گیا ہو۔

میری کزن صوفے کی بیک پر ہاتھ رکھتے ہوئی بولی:

''ارے تو تم گھر میں ہو۔ میں تو سمجھی تھی کہیں آوارہ گردی پر نکلے ہوئے ہوں گے۔''

اس کے اس مذاق کو میں نے قطعی پسند نہ کیا۔ میں جو اب اپنے باپ کے چھوڑے ہوئے ایک بہت بڑے پروجیکٹ کا مینیجنگ ڈائریکٹر ہوں۔ رُکھائی سے میں نے کہا۔

''جان چھوڑ دو میرے بچپن کی اب وہ کہیں بہت پیچھے رہ گیا ہے۔''

وہ ہنسی۔

''جناب نے غُصّہ کِیا ہے۔اچھا چھوڑو اِن سے مِلو''اُس نے اپنے ساتھ آنے والی لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

اور مجھے معلوم ہوا کہ تابناک چہرے والی وہ لڑکی جو بڑی آہستگی سے چلتی ہوئی داہنے ہاتھ والے صوفے پر بیٹھ گئی تھی اور جس نے آبی رنگ کا نفیس کشمیری کڑھت کا سُوٹ پہن رکھا تھا اور بڑی لیئے دیئے سی نظر آ رہی ہے ثالیہ ہے۔فزکس جیسے خشک مضمون میں ایم۔ایس سی ہے۔پشاور سے تبدیل ہو کر آئی ہے اور مقامی گرلز کالج میں لیکچرار ہے۔ایسی دھان پان سی لڑکی اور فزکس کی لیکچرار۔اچھے گھرانے سے ہے تو نوکری کی کیا ضرورت تھی؟ وہ بھی گھر سے اتنی دُور۔میں نے تنقیدی جائزہ لیا۔اُس کے چہرے پر چھائی بے نیازی اور غرور کا سا احساس۔مجھے احساس ہوا کہ اُس کا تعلق کِسی غریب گھر سے ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کا چہرہ اس کی امارت کا غماز تھا۔

اصل میں میری اِس سر پھری کزن جیسی ہی ہوگی جو کروڑ پتی شوہر کے ہوتے ہوئے بھی نوکری کرتی اور اُسے بہت اچھا سمجھتی ہے۔

آصفہ کے ساتھ ہی وہ بھی اُٹھ گئی تھی۔دونوں میری ماں سے ملنے چلی گئی تھیں۔''ثالیہ'' میں نے زیرِلب دُہرایا۔

یہ اُس کا نام تھا جسے دُہراتے ہوئے ذرا بھی غنائیت محسوس نہیں ہوتی تھی۔''بڑا فضول سا نام ہے۔''میں نے اپنے آپ سے کہا تھا مگر چند لمحے غور کرنے کے بعد مجھے یوں لگا جیسے یہ منفرد سا نام اُس کی شخصیت ہی کی طرح ہو۔

اپنی کزن کے ہاں مجھے اُسے دیکھنے کا اکثر اتفاق ہوتا۔اُسی کی زبانی مجھے پتہ چلا تھا کہ وہ بہت اُونچے گھر کی لڑکی ہے۔ماں کم عُمری میں مَر گئی۔باپ نے دوسری شادی کر لی۔وہ ہوسٹلوں ہی میں پلی بڑھی۔ہمارے گھر بھی اکثر آتی۔دو تین بار مجھے بھی اُسے چھوڑنے ہوسٹل جانا پڑا۔حُسن کیا تھا کہ جیسے گرما کی چاندنی رات کی فسوں خیزی کھیتوں کھلیانوں میں بکھری پڑی آنکھوں کو سحر زدہ سی کرے۔

ایسے ہی دنوں میں میری ماں نے مجھ سے کہا تھا۔

''تمہاری نخریلی ناک تلے کوئی لڑکی نہیں آتی۔گھمنڈی پَن کو چھوڑ دو اب۔سنجیدگی سے اِس ہیرا سی لڑکی کے بارے میں سوچ لو۔مجھے غصّہ آیا تھا۔

''نہ اَتہ نہ پتہ کِس خاندان کِس قبیل سے ہے جانتی ہیں۔''؟

''انسان کو پرکھنے کا شعور ہے مجھے۔''جواباً اُنہوں نے اُسی سختی سے کہا۔

اس کے لئیے ہمارے گھر میں میری ماں اہم تھی۔میں تو قطعی قابلِ توجہ نہ تھا۔اس کی اسی چیز نے میرے پندارِ غرور کو ٹھیس پہنچائی تھی۔

اب اگر یہ کہوں کہ مجھے اس سے محبت ہوگئی تھی تو غلط نہ تھا۔اس کا حُسن ،تہذیب اور شائستگی ایک مرد کو دیوانہ بنانے کے لیے کافی تھیں اور میں دیوانہ ہو چُکا تھا۔جب میں نے اس سے شادی کرنے کے ارادے کا اظہار اپنی کزن سے کیا تو وہ ہنس کر بولی:

''چلو خدا کا شُکر ہے تمہارا کُفر تو ٹوٹا۔''

''تو تم اُس سے بات کر کے اُس کا عندیہ تو لو۔''میں نے درخواست کی۔

''غلط بات۔شادی تم نے کرنی ہے۔تمہی پوچھو۔''میں کون؟ خواہ مخواہ۔''

آصفہ ان دنوں چھٹی پر تھی۔میں ہوسٹل کے دروازے کے سامنے کھڑا تھا۔میں نے اُسے بُلایا تھا آصفہ کا نام لے کر۔وہ آئی اور

خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ راستے میں بغیر کسی تمہید کے میں نے اُس سے کہا کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔

اُس نے عجیب سے انداز میں مجھے دیکھا اور رُکھائی سے بولی۔

''مگر میں تو نہیں چاہتی۔''

میں تو یکدم جیسے سناٹے میں آ گیا۔ کچھ بولا ہی نہ۔ کیا میں بھی ردّ کیا جا سکتا ہوں؟

انا پر جیسے ہتھوڑے پڑے اور اس سوال نے بڑی مکروہ صورت کے ساتھ میرے منہ پر تھپڑ مارا تھا۔

میری منّت سماجت پر آصفہ نے اُس کے ترلے کیئے۔ پھر اُس نے سوچنے کا وقت مانگ لیا۔ اس کی سوچ بہت لمبی ہو گئی تھی۔ ایک طرح ناک سے لکیریں نکلوانے والی بات ہو گئی۔ چھ ماہ گزر گئے۔ میں کئی بار ہوسٹل گیا مگر وہ مجھے نہیں ملی۔ بالآخر آصفہ نے ایک دن بتایا کہ وہ سخت تذبذب کا شکار ہے۔ اگر وہ اپنی مرضی سے شادی کرتی ہے تو اُس کا والد شادی میں شریک نہیں ہوگا۔ ''میری مانو تو نکاح پڑھا لو۔ ایسی اچھی لڑکی تمہیں زندگی میں نہیں ملے گی۔'' آصفہ نے مجھے گومگو کی کیفیت سے نکالتے ہوئے کہا۔

شادی سے پہلے اُس نے شرط لگا دی کہ وہ نوکری نہیں چھوڑے گی۔

''احمق''۔ میں نے قدرے غصّے سے آصفہ سے کہا۔ ''یہ عورتوں کو اپنی کمائی کی چاٹ کیوں لگ جاتی ہے؟''

''تمہاری کھوپڑی میں آخر سیدھی بات کیوں نہیں آتی۔ علم بانٹنے کی چیز ہے۔ بند کر کے زنگ لگانے کی نہیں۔''

پھر میں اُسے بیاہ لایا۔ بارات تو آصفہ کے گھر سادگی سے گئی مگر ولیمہ بڑا شاندار رہا۔ میری ماں نے اپنے دل کے خوب ارمان نکالے۔ وہ بے چاری تو مایوس ہو چکی تھی کہ میں کبھی شادی بھی کروں گا۔

میری زندگی میں آ کر وہ اتنی اچھی بیوی اور بہو ثابت ہوئی کہ انسان اپنے مقدر کی خوش بختی پر رشک کر سکتا تھا۔ میرا خوبصورت گھر اُس کے ہاتھوں کی محنت اور سلیقے نے اور خوبصورت بنا دیا۔ کھانوں میں لذّت آ گئی تھی۔ دفتر ہو یا گھر تقریباً ہر معاملے میں اُس کی رائے بڑی سوچی سمجھی ہوتی۔ میری ماں جو بیماریوں کا ملغوبہ تھی، اُس کی دیکھ بھال سے اُس کی حالت بہت بہتر ہو گئی تھی۔ مگر اُس کی ایک عادت سے مجھے شدید نفرت تھی وہ تھی شاگرد پیشہ لوگوں سے اُس کا میل جول۔ مالی، خانساماں، ڈرائیور اور چوکیدار کی گھر والیاں بلا روک ٹوک گھر میں آنے لگی تھیں۔ جب بھی میں نے اس کی اس روش پر تنقید کی، اُس نے جواباً کہا ''وہ انسان ہیں اور ہم سے اچھے سلوک کے مستحق ہیں۔''

''میں نے کب کہا کہ وہ جانور ہیں۔'' میں چیخ اُٹھتا۔ ''میرا کہنے کا مطلب ہے کہ تمہیں اپنے مقام کا خیال رکھنا چاہئیے۔'' گندی عادتیں میری ماں جیسی۔ سچ تو یہ ہے بوٹے پہ بوٹا لگ گیا ہے۔

میں نے اُس کی تنخواہ کے بارے میں کبھی نہیں پوچھا تھا کہ وہ کیا کرتی ہے اور کہاں خرچ کرتی ہے؟ شاید اس لیے کہ میں خوش حال تھا۔

ہاں البتہ جب تک وہ ماں نہیں بنی تھی، میں کبھی کبھی اُسے اُداس اور متفکر سا دیکھتا مگر جب سے اُس نے دو جُڑواں بچوں، ایک لڑکے اور ایک لڑکی کو پیدا کیا تھا وہ بڑی بدل گئی تھی۔ کالج سے بھی زیادہ تر چھٹّی پر رہنے لگی تھی۔

اپنے ماں باپ اور عزیزوں رشتہ داروں کے بارے میں مَیں نے اُسے بہت کم بات کرتے سُنا۔ میرا خیال تھا کہ سوتیلی ماں اور باپ کی عدم توجّہی نے اُسے دل برداشتہ کیا ہوا ہے۔ جبھی وہ اُن کا ذکر کرنا پسند نہیں کرتی۔

پچھلے دو تین دنوں سے میرے پیٹ میں درد تھا۔ ثالیہ کو میں نے نہیں بتایا۔ اصل میں وہ میری ذرا سی تکلیف پر اتنی پریشان ہو جاتی تھی کہ مجھے افسوس ہوتا۔ پروجیکٹ پر نیا ڈاکٹر آیا تھا۔ پشاور کی کسی نواحی بستی سے تھا۔ بڑا خوش اخلاق آدمی تھا۔ عُمر یہی پچاس پچپن سال ہوگی۔ تفصیلی معائنے کے بعد دوا دیتے ہوئے بولا:

''فکر کی بات نہیں۔ معمولی درد ہے۔ ٹھیک ہو جائے گا۔''

تولیے سے اپنے ہاتھوں کو صاف کرتے ہوئے اُس نے پھر کہا:

''شجاع صاحب یہاں گرلز کالج میں ہماری بستی کی ایک لڑکی ہے۔ ثالیہ نام ہے۔ اُس کے گھر والوں نے کچھ چیزیں میرے ہاتھ بھیجی تھیں۔ بہت دن ہو گئے ہیں۔ اگر آپ کسی وقت مجھے اپنا ڈرائیور گاڑی دے دیں تو مہربانی ہوگی۔''

میرا اُوپر کا سانس اُوپر اور تلے کا تلے رہ گیا۔ ''ثالیہ''۔ میں نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ''پڑھتی ہے کیا؟''

''نہیں پڑھاتی ہے شاید۔ فزکس کی لیکچرار ہے۔ بڑی ہونہار لڑکی ہے۔ باپ پنجاب میں کسی گرلز سکول میں چپڑاسی تھا۔ بیٹی کو پڑھنے کا شوق تھا۔ لہذا پڑھایا۔ برسرِ روزگار ہوئی تو باپ کی نوکری چُھڑوادی اور اُنہیں گاؤں لے آئی۔ دو بہن بھائی میڈیکل کے چوتھے سال میں ہیں۔ ایک بہن بیالوجی میں ایم۔ ایس سی کر رہی ہے۔''

وہ اپنی دُھن میں بولے جا رہا تھا اور نہیں جانتا تھا کہ اُس کا بولا ہوا ہر لفظ جیسے میرے سر پر کسی وزنی ہتھوڑے کی مانند پڑ رہا ہے۔ میرا رنگ پیلا پڑ گیا ہوگا جبھی تو ڈاکٹر نے حیرت سے کہا ''ارے آپ کو کیا ہو گیا ہے؟''

بمشکل اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے میں نے کہا۔

''یہی تو تکلیف ہے ڈاکٹر۔ ایکا ایکی درد اُٹھتا ہے اور بے چین کر جاتا ہے۔''

''پریشان نہ ہوں۔ جا کر آرام کیجیے، پھر کسی روز دیکھا جائے گا۔''

میں نہیں جانتا۔ میں گاڑی میں کیسے بیٹھا؟ مجھے تو بس ایک ہی بات یاد تھی۔ ''میری بیوی چپڑاسی کی بیٹی ہے۔ نچلے طبقے سے تعلق رکھتی ہے۔'' درمیان کی سب باتیں میں بھول گیا تھا۔

گھر آیا گاڑی پورچ میں کھڑی کی۔ خدا کا شکر تھا کہ میں کسی حادثے سے دوچار نہیں ہوا۔ وگرنہ جس ذہنی پریشانی سے میں ایکا ایکی دوچار ہوا تھا وہ کسی بھی خطرے کا باعث بن سکتی تھی۔

برآمدے میں نُور رہمارا نوکر کھڑا تھا۔ بریف کیس میرے ہاتھوں سے پکڑتے ہوئے اُس نے مجھ سے چائے لانے کا پوچھا۔

''وہ کہاں ہے؟'' میں نے حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھا۔

ڈیڑھ سال کی ازدواجی زندگی میں ایسا ایک بار بھی نہیں ہوا تھا کہ میری گاڑی رُکنے کی آواز پر وہ باہر نہ نکلی ہو، اُس کے ہونٹوں نے پیار بھری مسکراہٹ نہ بکھیری ہو۔

نُور شاید میری نگاہوں کا مفہوم سمجھ گیا تھا۔ بولا ''بیگم صاحبہ بڑی بیگم صاحبہ کے ساتھ گئی ہیں۔''

مجھے یاد آیا کہ آصفہ کے چچا کی بیٹی کی شادی تھی۔ ثالیہ نے دو تین دن پہلے اُس کا ذکر کیا تھا۔ آج صبح بھی اُس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ میرے آنے تک چلی جائے گی۔ ایک دن وہاں ٹھہرنے کا سُن کر میں بولا تھا۔

''کوئی ضرورت نہیں۔تم نے مجھے اپاہج بنادیا ہے۔ مجھے تو تمہارے بغیر کچھ نظر ہی نہیں آتا۔''

پر اب اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے میں نے سوچا''اچھا ہی ہوا وہ نہیں ہے۔ مجھے اِس وقت مکمل سکون کی ضرورت ہے۔''

اُس نے جھوٹ بولا۔ میرے ساتھ فریب کیا۔ خود کو وہ کچھ ظاہر کیا جو وہ نہیں تھی۔ ایسا اُس نے صرف مجھے پھانسنے کے لیے کیا۔ میں جو لاکھوں کی جائیداد کا تنہا وارث ہوں۔گزرے ہوئے وقت کا ایک ایک لمحہ میری آنکھوں کے سامنے آیا۔ میں ہی پاگل تھا۔عشق نے میری آنکھوں پر پٹّی باندھ دی تھی، وگرنہ اس کی عادتیں دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا،اس میں امیر زادیوں والی کوئی بات نہ تھی۔

پورا دن میں سُلگتا نہیں، جلتا رہا۔ وہ ابھی نہیں آئی تھی۔ باوجود شدید نفرت کے شعوری طور پر جیسے مجھے اُس کی آمد کا انتظار تھا۔ دوسری شام میں نے کلب میں گُزاری۔ وہیں حبیب الرحمٰن مِلا۔اس کا کاروبار سنگاپور، ملایا اور انڈونیشیا تک پھیلا ہوا تھا۔تقریباً سال بھر سے وہ باہر تھا۔خوب گلے لگ کر مِلا۔ یار دوستوں نے اُسے میری شادی اور جُڑواں بچوں کا بتادیا تھا۔خوب ہنسا اور بولا۔

''بھئی سُنا ہے تمہاری بیوی خوبصورت ہی نہیں پڑھی لکھی بھی بہت ہے۔''

میرے کلیجے پر جیسے چُھری چل گئی۔ ابھی کچھ بولا بھی نہ تھا کہ اُس نے خود ہی کہا۔''ارے شجاع تمہیں سلیمان تو یاد ہوگا۔''

''یاد کیوں نہیں وہی جس کا دیوالیہ ہوگیا تھا۔''

''ہاں ہاں ارے بھئی دیکھو نا انقلابِ زمانہ۔ وقت کا کروڑ پتی آدمی آج کا بھکاری۔ میں پچھلے دنوں لندن گیا تو اُس کی خستہ حالی دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ پانچ ہزار پونڈ اُسے دیئے کہ وہ چھوٹا موٹا کام کرے۔ زندگی میں واقعی کِسی چیز کا اعتبار نہیں۔''

وہ سلیمان کے عبرت ناک انجام سے بہت زیادہ متاثر تھا۔ دیر تک اس کی باتیں کرتا رہا۔

پھر طوفان آیا۔ میں نے اُس کے چیتھڑے کرڈالے۔ مکّار، دغا باز ایک امیرزادے کو پھانسنے،اس پر اپنے حُسن سے ڈورے ڈالنے کا الزام،خود اپنی سادگی اور حماقت کا اعتراف۔ میرے تو جیسے تلوں سے کھوپڑی تک آگ ہی آگ برس رہی تھی۔

اُس نے پیلے پڑتے چہرے اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ سب سُنا اور پھر جیسے ڈوبتی آواز میں بولی۔''میرا باپ چپڑاسی تھا،غریب ہے مگر حسب نسب والا ہے۔غریبی کوئی طعنہ نہیں،مہناں نہیں۔اور وہ تمہارے باغ باغیچوں کو ہرا بھرا کرنے والا اور تمہاری ماں کی خدمت پر مامور اس کی بیوی بھی بڑی عظمت والے تھے کہ جنہوں نے ایک گھنٹے کا اپنا لختِ جگر تیرے والدین کی گود میں ڈال کر تیرے باپ کے بانجھ پن کو اپنے بڑے پَن سے ہرا بھرا کردیا تھا۔''

جیسے ایکا ایکی زمین اپنے محور پر گھوم جائے۔ جیسے ہر چیز اُلٹی قلابازیاں کھانے لگ جائے، جیسے طوفان آجائے، جیسے ساحل پر بیٹھے خوش وخرم لوگوں کو سونامی دبوچ لے۔''تمہیں تمہیں۔۔۔''میں ہلکار ہا تھا۔الفاظ جیسے میرا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔

''اپنی ماں کے پاس جاؤ۔''

اور میں سرپَٹ بھاگتا دھڑام سے اُس کے کمرے میں داخل ہوا۔ میرے تعاقب میں وہ بھی بھاگتی ہوئی آموجود ہوئی تھی۔

میں نے سر اس کی گود میں پھینکا۔

''میں کیا سُن رہا ہوں؟ میری ماں نے تڑپ کر میرا سر اُوپر کیا اور جیسے چُھری میرے کلیجے میں اُتار دی۔جس راز کو تیرا باپ قبر میں لیئے اُتر گیا اور جسے میں اپنے سینے میں لیئے بیٹھی ہوں اُسے زبان مت دو۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔''

''تو پھر یہ تیسرے کے پاس کیوں پہنچا؟''

''تیرے علاج کیلئے۔نخوت وتکبّر میں تُو اپنے باپ سے بھی چار ہاتھ آگے چلا گیا ہے۔تین لفظوں کے ساتھ چار زندگیاں داؤ پر لگ جاتی تھیں۔''

میں نے کہا نا۔میں گھائل تھا۔خون اُترا ہوا تھا آنکھوں میں۔میں بھاگا اپنے کمرے میں آیا اور اُسے لاک کرلیا۔

خوبصورت آنکھوں میں خدشات کا طوفان تھا۔ہونٹ کانپتے تھے۔ہاتھ برف جیسے ٹھنڈے تھے۔

کہیں جوڈی۔این۔اے کے چکروں میں پڑ گیا تو؟

اور ساس نے بہو کے یخ ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا تھا۔

''حوصلہ رکھو میں نے اُسے جنا ہے۔جانتی ہوں کتنے پانی میں ہے؟''جوڈوز ہم نے دے دی ہے وہ بہت مؤثر ہے۔''

◆◆◆

باقی سب کو چھوڑ دو قُرآن سے ناطہ جوڑ لو

''کرپشن'' رائج الوقت سرمایہ داری نِظام کے درخت کا پھل ہے

کرپشن کی وجہ سے

قرضے،غُربت،غلامی ومحکومی اور ذلّت وخواری قوم کا مُقدر بن جاتی ہے

کرپشن سے مکمل نجات حاصل کرنے کے لیے قُرآنِ حکیم کی روشنی میں لکھا ہوا کتابچہ

کرپشن اور قُرآنِ حکیم

SMS کرکے، چٹھی لکھ کر،فون کرکے یا خود تشریف لا کر مفت حاصل کریں

دھوکا نہ کھایئے انقلاب یا تبدیلیِ نظام سے مراد اسلامی نظام کا نفاذ ہے۔

تحریکِ رحمت

E-155/A-1،غزنی لین،نیو سُپر ٹاؤن،لاہور چھاؤنی فون: 042-36621120-21

موبائیل:0323-4011616ای میل:tehreek-e-rehmat@hotmail.com

اجنبی شہر میں ایک اِنسان

نثار احمد صدیقی (انڈیا)

چلتے چلتے وہ بس سٹاپ کے ایک شیڈ کے نیچے ایک گوشے میں بیٹھ گیا۔ اُس نے چاروں طرف دیکھا۔ دور تک کوئی انسان نظر نہیں آ تا تھا۔ سون برج کے چوراہے پر آ کر ملتی ہوئی تینوں سڑکیں جیٹھ کی آتشی دوپہر میں بالکل سنسان تھیں۔ اس نے فیصلہ کیا تھوڑا آرام کر لینے کے بعد تلاش میں چلنا اچھا ہوگا۔ دونوں ٹانگیں جوڑ کر اس نے گھٹنے میں اپنا سر چھپا لیا، تیز لُو تھی۔ لیکن وہ بے فکر آرام سے بیٹھا رہا۔ یک بہ یک ایک موٹر کار زناٹے سے ہارن بجاتی ہوئی گزر گئی۔ اس کے خیالات منتشر ہو گئے۔ اس نے چاروں طرف پھر نظر دوڑائی۔ دُور ایک راستے سے ایک موٹر سائیکل اپنی پوری رفتار سے گزر رہی تھی اور ایک اپ ٹو ڈیٹ جوڑا چوراہے کی دوسری جانب سے سڑک پار کرتا ہوا بس سٹاپ کی طرف بڑھنے لگا تھا۔ وہ اس اپ ٹو ڈیٹ جوڑے کو غور سے دیکھنے لگا۔ ایسا محسوس ہُوا کہ جہاں وہ بیٹھا تھا وہاں سے اس جوڑے تک ایک سیڑھی بن گئی اور اس سیڑھی پر وہ جلدی جلدی چڑھنے لگا۔ جوڑا نزدیک آ گیا اور اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ یک بیک وہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا کیونکہ وہ حسین جوڑا بس سٹاپ کے شیڈ کے نیچے بالکل اس کی نظروں کے سامنے کھڑا تھا۔ ان دونوں کی آنکھوں میں اپنے لئے حقارت اور غصّہ دیکھ کر وہ اور بھی شیڈ کے آخری حصے کی دیوار سے چپک کر کھڑا ہو گیا لیکن اس کا دل دھڑک رہا تھا اسی طرح۔

کل بھی وہ اسی طرح ایک بس سٹاپ کے شیڈ میں دھوپ سے بچنے کے لئے کھڑا ہو گیا تھا۔ دو چار لوگ اور کھڑے تھے۔ انہوں نے بھی اس حسین جوڑے کی طرح اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھا تھا۔ اچانک ٹیڈی لباس میں ملبوس پندرہ بیس لڑکیاں بس سٹاپ پر ہنستے قہقہے لگاتی آ پہنچیں۔ لڑکیاں جب بس سٹاپ پر کھڑی ہو رہی تھیں اس وقت پیچھے والی ایک لڑکی اس سے ٹکرا گئی۔ ٹکرانے والی لڑکی چیخ مار کر اس سے دور ہو گئی تھی۔ جیسے اس کے سامنے کوئی زہریلا سانپ آ گیا اور پھر وہ خوف کے مارے وہاں سے بھاگ نکلا تھا۔ اسی وقت ایک سیٹی کے فوراً بعد آواز صاف سنائی دی۔ ''ابے ابے کہاں جانا ہے؟ رک جا'' اشارہ اسی کی طرف تھا۔ وہ خوف زدہ ہو کر رک گیا۔ ایک لال پگڑی والا اس کی طرف بڑھ رہا تھا وہ اور بھی خوف زدہ ہوا اور کانپنے لگا۔ جانے کیا ہو؟

''اے بنگڑو! باپ کی سڑک سمجھ رکھی ہے۔ بھاگتا چلا جا رہا ہے۔ دیکھتا نہیں لال بتی جل گئی ہے۔ اندھا ہے کیا، چل ہٹ پیچھے۔''

وہ پیچھے کھسک گیا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ بس ایک بات پر رہ رہ کر اسے حیرت ہو رہی تھی۔ وہ لال پگڑی والا اس کا نام کیسے جانتا تھا۔ اس کے گاؤں والے اسے بنگڑو ہی کہا کرتے تھے۔ یہ آدمی بھی...... اس اجنبی شہر میں اس لال پگڑی والے کے منہ سے اپنا نام سُن کر اس کی خشک ہونٹوں پر پہلی بار مسکراہٹ آئی تھی۔

آج بھی بس سٹاپ کے نیچے وہ اس جوڑے سے دور کھڑا تھا۔ اس کی ترچھی نظریں اس حسین جوڑے کی حرکت کو چپکے چپکے دیکھ رہی تھیں۔ عورت کا ہاتھ مرد کے ہاتھوں میں تھا۔ آنکھیں مرد کی آنکھوں میں تھیں۔ عورت کہہ رہی تھی۔

''تین بسیں گزر گئی ہیں۔ چوتھی بس سے میں ضرور چلی جاؤں گی۔ دیکھو بہت دیر ہوگئی ہے۔ پلیز!''اور عورت کی گھومتی ہوئی آنکھیں اسکی آنکھوں سے ٹکرا گئی تھیں۔''ارے ادھر کیا دیکھ رہا......؟ اس سے پہلے کہ عورت کچھ بولتی۔ وہ بھاگتا ہوا نظر آیا۔ اس حسین جوڑے نے بے ساختہ ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا۔ بھاگتے بھاگتے اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ پیچھے کوئی نہیں تھا۔ اتنا بڑا شہر بڑی بڑی بسیں، موٹریں اور آدمیوں کی بھیڑ۔ آج وہ تین دن سے بھوکا تھا۔ اپنا دُکھ درد کسی سے نہیں کہہ سکا تھا کیونکہ وہ شہری چمک دمک دیکھ کر بہت حد تک خوفزدہ ہوگیا تھا لیکن بھوک بھی اسے پریشان کررہی تھی۔ بھوک کا درد ایسا تھا کہ اس کا ہاتھ ایک دوجگہ پھیل ہی گیا۔ ایک نے کہا''بھلے چنگے ہو جاؤ کماؤ کھاؤ'' وہ بغیر سمجھے آگے بڑھ گیا۔ سڑک کے کنارے ٹیوب ویل پر ایک انسان کو پانی پیتے دیکھا پھر اس نے بھی اس ٹیوب پر جا کر پانی پیا۔ اسی طرح جہاں بھی خواہش ہوتی پانی پی لیا۔ نقاہت اور تھکن کے باعث اب اس کا چلنا بھی دشوار ہوگیا تھا۔ رات وہ بس سٹاپ کے ایک شیڈ کے نیچے قمیص کو سرہانے رکھ کر سویا۔ صبح اُٹھنے پر اپنی قمیص نہ پا کر وہ حیران ہوگیا تھا اور پھر وہ ننگے بدن ہی چل پڑا۔ اس کی کوئی منزل نہ تھی۔

وہ بڑھتے بڑھتے بہت دور تک پہنچ گیا تھا۔ اسے اپنی آنتوں میں درد سا محسوس ہونے لگا تھا۔ گلے میں کانٹے سے چبھ رہے تھے۔ وہ فٹ پاتھ سے اٹھا اور سڑک کے دونوں کنارے ٹیوب ویل ڈھونڈنے لگا۔ کچھ آگے بڑھ کر ایک ٹیوب ویل ملا۔ اس نے پھر پیٹ بھر کر پانی پیا۔ پانی پینے کے بعد اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیر کر تھپکی دی تو اس کا پیٹ ڈھولک کی طرح بجنے لگا اور پھر وہ سیدھا کھڑا ہوگیا۔ اس نے چاروں طرف اپنی آنکھ کی پتلی گھمائی تو سامنے اسے بڑی بڑی کوٹھیاں نظر آئیں۔ کوٹھیوں کی طرف اس کے قدم خود بخود اُٹھنے لگے۔ اس نے دیکھا اس نے کوٹھیوں کے سامنے ہری بھری بڑی گھاسوں کی دیواریں ہیں۔ اس کا دل خوف سے کانپنے لگا۔ وہ کسی کوٹھی میں داخل ہونے کی ہمت اپنے آپ میں نہیں پا رہا تھا۔ اسی طرح پانچ چھ کوٹھیاں طے کرتا ہوا وہ آگے بڑھ گیا۔ یک بیک اسے خوشبو محسوس ہوئی۔ وہ رُک گیا اس بڑے اجنبی شہر میں یہ خوشبو اسے جانی پہچانی سی لگی۔ وہ زور زور سے سانس لینے لگا اور اس کے منہ سے رال ٹپکنے لگی۔ وہ اس کوٹھی کی دیوار سے لگ کر بیٹھ گیا اور خوشبو سونگھتا رہا۔ بہت دیر کے بعد اس نے پردے کو اپنے گندے ہاتھ سے ذرا کھسکا کر دیکھا اس کی نظر ایک سفید وردی اور سفید پگڑی والے آدمی سے جا ٹکرائی۔''ارے کون ہے؟ یہاں کیا کر رہا ہے؟''سفید وردی والے کی آواز سن کر وہ خوف سے کانپنے لگا اور سمٹ کر گٹھڑی بن گیا۔ آہستہ آہستہ اُٹھ کر بھاگنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ ایک اور آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔''اے ادھر آؤ۔ وہاں کیا کر رہے ہو؟ وہ کھڑا ہوگیا۔''صاحب بلا رہے ہیں؟''اس نے دیکھا پگڑی والا کہہ رہا ہے۔ وہ کیسے بڑھے جانے کیا؟ وہ پس و پیش میں پڑ گیا تھا کہ ایک کڑک دار آواز پھر اس کے کانوں سے ٹکرائی۔''کیا چاہتے ہو؟''اس نے پلک اٹھائی اس کے ہونٹ ہلے۔''بھوک لگی ہے''؟ جواب میں گردن دو مرتبہ جھکی۔''تو دیکھ کیا رہا ہے اندر آ جا۔''کم، کم ان'' صاحب کی رعب دار آواز سن کر گھبرا گیا۔ اسے لگا اس کے پیر زمین میں دھنس گئے ہیں۔ جانے مونچھوں والا صاحب کیا برتاؤ کرے۔ اسے اس طرف نہیں آنا چاہئے تھا۔''اے بہرہ ہے کیا؟'' مونچھ والے صاحب کی کڑک دار آواز نے اس کے سارے جسم کو لرزا دیا۔ وہ خوف زدہ ہو کر آہستہ آہستہ قدم بڑھانے لگا۔ زمین کے چھوٹے چھوٹے ریزے اسے پتھر دکھائی دے رہے تھے۔''چلو اندر چلو'' اور وہ پیچھے پیچھے چلنے لگا۔''بیٹھ جاؤ!'' وہ اپنے بدن کو سمیٹ کر ڈرتے ڈرتے زمین پر بیٹھنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ کڑک دار آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔''نیچے نہیں۔ یہاں بیٹھو صوفے پر'' وہ پھر کھڑا ہوگیا اور کمرے میں چاروں طرف دیکھا۔ بڑی بڑی کرسیاں، ٹیبل، صوفے اور پردے!''میں کہتا ہوں بیٹھ جاؤ''

''سنتے نہیں صاحب کیا کہہ رہے ہیں؟'' نوکر نے کہا۔اس کی آنکھیں رحم کی بھیک مانگتی ہوئی لگ رہی تھیں۔ وہ اس گدّے دار صوفے پر کیسے بیٹھے گا۔ وہ......!

''بیٹھو'' آواز اور بھی کرخت ہو گئی۔''ہاں بیٹھو'' نوکر نے پھر دہرایا۔''اے تم یہاں کیا کر رہا ہے چلو کھانے کا بندوبست کرو۔'' صاحب نے نوکر سے کہا۔نوکر تیزی سے اندر چلا گیا۔ وہ ابھی تک اسی طرح کھڑا تھا۔ بالکل سمٹا ہوا۔''ارے تم ابھی تک کھڑے ہو۔ بیٹھو، سٹ ڈاؤن!!''

وہ خوف سے سہا ہوا گدی دار صوفے کے نزدیک آیا۔ایک منٹ کھڑا رہا۔ پھر اتنی تیزی سے اُچھل کر صوفے پر بیٹھا کہ اسے خود پتہ نہ چلا کہ وہ کیسے اور کب اس صوفہ پر بیٹھا ہے۔اس کی دونوں ٹانگیں ایک دوسرے پر چڑھ گئی تھیں۔اسے اس طرح بدحواس صوفے پر بیٹھا دیکھ کر صاحب نے زور سے قہقہہ لگایا اور پھر مسکرانے لگے۔ان کا جسم ہنسی سے دوہرا ہونے لگا۔ ہا...... ہا...... ہا......ایک دم کچھوے کی طرح 'وہاٹ اے بیوٹی فل سائٹ'۔ پھر نگاہیں دوسری طرف پلٹ گئیں اور نوکر کو سامنے کی دیوار سے پیٹھ لگائے کھڑے دیکھ کر ان کی بھنویں تن گئیں۔اس کی آنکھوں میں خوف کی لہر دوڑنے لگی۔''کریم'' صاحب چلاّئے۔''جی صاحب!'' اور نوکر فوراً ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔''تم نے ان صاحب کے لئے کھانا نہیں لگایا؟ نوکر دوبارہ اندر کی طرف دوڑا۔''صاحب''!اس کے لئے''صاحب''۔اس کا دل چاہا وہ کچھ کہے۔ ''صاحب تو آپ کا نام ہے صاحب۔ ہمارا نام تو بنگڑ و ہے۔'' اب اسے یہ صوفہ آرام وہ معلوم ہو رہا تھا اور خوف بھی تقریباً ختم ہو رہا تھا۔اب اسے پھر بھوک ستانے لگی تھی۔

''اے چلو کھانا کھا لو'' نوکر نے کہا۔اس نے ہاتھ پھیلا دیا بھیک مانگنے کے لئے۔اس کے پھیلے ہاتھ دیکھ کر صاحب ہنسنے لگے تھے۔ ہنسنے کی رفتار میں تیزی آ گئی اور پھر اس کی طرف ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔''بھیک منگا''۔ایک دم بھیک منگا۔ بھیک منگا!'' صاحب کی ہنسی سے وہ اور بھی سمٹ گیا تھا۔نوکر اندر باہر بھاگ رہا تھا۔میز پر سفید سفید پلیٹیں لگا رہا تھا۔کھانا میز پر لگ جانے کے بعد صاحب نے کہا۔''چل کھا''۔ وہ پس وپیش میں پڑ گیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو پھر اس نے ہاتھ پھیلا دیا۔اس کے منہ سے رال بہ دستور ٹپک رہی تھی اور اس کے ننگے پیٹ کو بھگو رہی تھی۔صاحب نے پھر ایک زوردار قہقہہ لگایا۔''کریم''''جی صاحب'' نوکر فوراً ہاتھ باندھ کر سامنے کھڑا ہو گیا۔

''ہمارا فوٹو کیمرہ لاؤ'' نوکر تھوڑی دیر بعد فوٹو کیمرہ لے کر حاضر ہو گیا۔ یک بیک کیمرہ کی فلش لائٹ چمکی اور اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

''یہ فوٹو بہت نیچرل آئے گا''۔سامنے بڑی سی میز پر کھانا لگا تھا۔اس کی آنکھوں میں بھوک کی پر چھائیاں تھیں اور رال ٹپکتی جا رہی تھی۔انگریز صاحب رال دیکھ کر پھر ہنسنے لگے۔''لائک اے ہنگری ڈاگ!''۔

اس کا جی چاہتا تھا کہ سامنے والی میز پر رکھے کھانے پر جھپٹ پڑے۔لیکن اسکے پیر بندھ سے گئے تھے۔ کیوں؟ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔انگریز صاحب درمیان میں مختلف گوشوں سے اس کی تصویر لئے جا رہے تھے اور اس کی آنکھیں فلیش لائٹ سے بار بار چوندھیا جاتی تھیں۔صاحب کی ان عجیب وغریب حرکات پر اسے خوف آ رہا تھا''ہیر۔ ہیر۔ ہیر۔'' انگریز صاحب نے کہا۔انہوں نے میز کے نیچے سے ایک کرسی کھینچی۔''یہاں بیٹھ کر کھاؤ۔لائیک اے مین'' اور وہ جلدی سے کرسی پر جا بیٹھا اور ایک ٹانگ دوسری پر چڑھا کر کھانے پر جھپٹ پڑا۔ اب اسے کیمرے کا خوف ذرا بھی نہیں تھا۔ وہ کھانا کھانے میں محو ہو گیا اور انگریز صاحب کرسی پر بیٹھے بیٹھے اسے دیکھ رہے تھے۔ مسلسل دیکھ

رہے تھے۔ان کی مونچھیں خوشی سے ہل رہی تھیں ۔ وہ بے فکر کھانے میں مگن تھا۔ساری میز گندی ہوگئی تھی لیکن وہ اسی طرح سب سے بے خبر کھائے جارہا تھا اور بہت تیزی کے ساتھ کھا رہا تھا۔ایک چپاتی کو صرف دو نوالے بنا کر صاف کر جاتا۔نوکر مستعدی سے کھانا کھلا رہا تھا۔ انگریز صاحب کے کیمرے کا فلش درمیان میں کبھی کبھی چمک جاتا۔صاحب یک بیک صوفہ سے اچھل کر چلا پڑے۔''فاؤنڈ ایٹ ہیرز ہینگر پر سافائیڈ۔ ہمارا جرنل کے لئے کتنا نیچرل مٹیریل ہے۔''ونڈرفل......!'' صاحب خوشی سے تالی بجانے لگے۔نوکر اتنا ہی سمجھ پایا تھا کہ اُس آدمی میں صاحب کو اپنے دیش کے اخبار کے لئے کچھ مٹیریل مل گیا ہے جس میں ان کی کھینچی ہوئی تصویریں شائع ہوتی تھیں۔نہیں تو اس آدمی کی اتنی تصویریں کیوں کھینچتے؟ صاحب اپنے ہونٹوں سے سگار لگائے اسے بغور دیکھ رہے تھے۔شاید کچھ ڈھونڈ رہے تھے۔

صاحب نے دیکھا اس آدمی کا منہ، پیٹ اور ہاتھ، دال سبزی اور شوربے سے سن گئے تھے۔اس پوز کو بھی انگریز صاحب کے کیمرے نے قید کر لیا تھا۔وہ چپ چاپ بیٹھا ہوا تھا۔''اور کھاؤ''۔صاحب کی آواز میں نرمی تھی۔ جواب میں اس نے ''نا'' کے لئے سر ہلا دیا۔صاحب اس کی طرف دیکھتے ہوئے بڑبڑائے۔''سیٹی ازفیکیشن پر سانو فائیڈ، وہاٹ اے بیوٹی فل سائٹ''۔اس درمیان وہ کھڑا ہو گیا تھا۔اس کی آنکھوں میں تشکر اور ندامت کی لہر دوڑ گئی۔صاحب مسکرا رہے تھے اور دلچسپی سے اسے دیکھے جارہے تھے۔نوکر میز صاف کرنے میں مشغول ہو گیا تھا وہ چپ چاپ کھڑے کھڑے کیمرے کا جائزہ لینے لگا۔''اے کیا دیکھ رہا ہے؟اس اچانک آواز کو سُن کر وہ پھر کانپ گیا۔ ''کو......کو......کچھ نہیں صاحب'' ''اور کچھ مانگتا؟ اپنی تھنگ؟'' ''نہیں''۔اس کے ہونٹ دھیرے سے ہلے صاحب اپنے ہونٹوں کو دانتوں سے دبائے کسی خیال میں غوطہ زن تھے اور اسے بغور دیکھے جارہے تھے۔پھر ایک بیک بولے''تمہارا نام کیا ہے؟ اُدھر بیٹھو صوفہ پر،ہم تمہارا ایک اور تصویر لینا مانگتا؟ سٹ ڈاؤن۔''انہوں نے کیمرہ اپنی بائیں آنکھ سے لگایا۔وہ وہیں کھڑا تھا۔ارے تم ابھی تک ادھر کھڑا ہے۔صوفے پر بیٹھنے مانگتا۔کم آن،ادھر بیٹھو۔وہ وہیں کھڑا تھا۔اُسی طرح'تم نہیں بیٹھے گا'' صاحب کی آواز میں غصہ تھا۔''نہیں''۔اس کی آواز میں ایک وقار تھا۔''وہاٹ! ہم تم کو کھانا کھلایا۔تم ہمارا بات نہیں مانتا۔کریم ابھی اس کو باہر نکالو۔ہم اس کو دیکھنا نہیں مانگتا۔'' صاحب کا سارا جسم غصہ سے کانپ رہا تھا۔نوکر اس کی طرف بڑھا اور ہاتھ پکڑ کر اسے انگریز صاحب کے گھر سے باہر نکال دیا۔وہ پھر سڑک پر آ گیا تھا۔آگے قدم سنبھل سنبھل کر بڑھا رہا تھا۔اس کی چال میں نزاکت اور وقار کی جھلک نظر آرہی تھی۔اس وقت بھی سڑک سنسان تھی۔بس سٹاپ پر اس وقت بھی ایک جوان حسین جوڑا کھڑا تھا۔جوڑے کو دیکھ کر وہ سہا نہیں بلکہ اس جوڑے کے نزدیک جا کر کھڑا ہو گیا۔جوڑے نے اپنے پاس اسے کھڑا دیکھ کر ناک بھنوئیں چڑھالیں اور دوسری طرف کھسک گئے!!!

◆◆◆

''اظہر جاوید، سچائی اور خلوص کا پیکر ہے۔اس نے مارشل لا کا ستم بھی سہا اور خود ساختہ اور انسان عظیم ہے خدایا، کہنے والے خود پسندوں کے جبر کا بھی ڈٹ کر مقابلہ کیا۔خوشامد میں سر نہیں جھکایا۔'' ڈاکٹر انور سدید

سیّد مشکور حسین یادؔ

O

شے کی تصویر کھینچ لی ہم نے
ہے کی تصویر کھینچ لی ہم نے

کوئی گانا کہاں سُنایا ہے
لَے کی تصویر کھینچ لی ہم نے

بات طے تو کبھی نہ ہو پائی
طے کی تصویر کھینچ لی ہم نے

پے بہ پے، بار بار، کچھ نہ کیا
پے کی تصویر کھینچ لی ہم نے

نَے سے کیسے؟ کہاں؟ نفس کے ساتھ
نَے کی تصویر کھینچ لی ہم نے

مے کہاں پی سکے مگر مشکورؔ
مے کی تصویر کھینچ لی ہم نے

OOO

شاہینؔ (کینیڈا)

O

یہ زندگی کہ رموز آشنائے قلزم ہے
سراب زار میں اک وقفۂ تیمّم ہے

اُتار دیکھے وہ اب اپنے لاؤ لشکر بھی
ہمارے دل کے قریں ایک قریۂ قُم ہے

ہنر سکھا دیئے جینے کے تیری یادوں نے
مرا شعار اب اِک زیرِ لبِ تبسّم ہے

بس ایک نیم نگاہی بس ایک چشمِ خلیق
یہی ہے قلقلِ مینا، مجھے یہی خم ہے

ہزار منطقے اس شہر کے ہیں زیبا تر
ہجوم میں دلِ بے چارہ آج تک گم ہے

یہ منکشف ہوا شاہینؔ ایک عمر کے بعد
سکوتِ لفظ کی ترتیب میں ترنّم ہے

OOO

حسن عسکری کاظمی

O

وہ دل زدہ ہوں کہ فرصت اُداس رکھتی ہے
نہ ہو تو اس کی ضرورت اُداس رکھتی ہے

کبھی تو ہجر کا موسم اُداس رکھتا تھا
ہجومِ یاس میں قربت اُداس رکھتی ہے

کہاں وہ چہرہ، وہ آنکھیں، وہ قامتِ زیبا
زوالِ حُسن کی صورت اُداس رکھتی ہے

قریب ہوں تو شکایت ہے دوستوں سے مجھے
جو دُور ہوں تو محبت اداس رکھتی ہے

بہت ہی صاف ہے آئینۂ نظر لیکن
مجھے تو دل کی کدورت اُداس رکھتی ہے

نشاطِ وصل کا لمحہ خیال و خواب ہوا
اب اعتبار کی زحمت اُداس رکھتی ہے

امیرِ شہر کو دھڑکا لگا ہے جاں کا حسنؔ
غریبِ شہر کو غربت اُداس رکھتی ہے

OOO

ناصِر زیدی

O

سامنے کوئی حسیں ہو، تو دیے جلتے ہیں
وصل کا دل کو یقیں ہو، تو دیے جلتے ہیں
اتنا مشکل تو نہیں حُسنِ تخیّل کو ثبات
ذہن میں ماہ جبیں ہو، تو دیے جلتے ہیں
روشنی بخش ہے اُس پیکرِ خوبی کا وجود
وہ مرے دل میں مکیں ہو، تو دیے جلتے ہیں
دیدنی ہے شبِ تاریک کی رخصت کا سماں
صبحِ فردا جو قریں ہو تو دیے جلتے ہیں
خود بچا لیتا ہے وہ مجھ کو بچانے والا
دام ہم رنگِ زمیں ہو، تو دیے جلتے ہیں
بجھتے جاتے ہیں سبھی خاص اُمیدوں کے چراغ
سلطنت زیرِ نگیں ہو، تو دیے جلتے ہیں
قُربتِ ماہ وَشاں بھی ہو میسّر دل کو
مضمحل ہو، نہ حزیں ہو، تو دیے جلتے ہیں
ابر و باراں بھی ہے رحمت کی نشانی یارو!
مہرباں عرشِ بریں ہو، تو دیے جلتے ہیں
کیا کہوں، کیوں ہے تغیّر پہ بھروسا ناصِرؔ
انقلاب اور کہیں ہو تو دیے جلتے ہیں

OOO

اسلم گورداسپوری

O

کوئی مکین نہ کوئی یہاں مکاں خوش ہے
وہ کون ہے کہ جو کہتا ہے یہ جہاں خوش ہے
کہاں بہار کو اتنی خوشی نصیب ہوئی
میں دیکھتا ہوں کہ جتنی یہاں خزاں خوش ہے
یہ کیسا عرصۂ طوفانِ بدتمیزی ہے
سفینے ڈوب گئے بحرِ بیکراں خوش ہے
یہ بات کم کسی شاعر کے افتخار کی ہے
کہ اس کے شعر سے دنیا کہاں کہاں خوش ہے
کسی جبیں کی خوشی کا کوئی خیال نہیں
یہاں تو ایک فقط سنگِ آستاں خوش ہے
یہ بات آج بھی میری سمجھ سے باہر ہے
لُٹا کے کارواں کیوں میرِ کارواں خوش ہے
یوں آسمان پہ شب کو چراغاں ہوتا ہے
زمیں کی تیرگی پہ جیسے آسماں خوش ہے
ہماری خانہ خرابی کا کچھ خیال نہیں
کہ اس خرابے پہ گویا وہ لامکاں خوش ہے
ہمیں تو دیکھ کے حالات، رونا آتا ہے
نہ جانے کس لئے اسلم وہ مہرباں خوش ہے

OOO

کرشن پرویز (انڈیا)

O

قیمت نہیں رہی کوئی وقعت نہیں رہی
لوگوں کے دل میں پیار کی عزت نہیں رہی

شکوے تھے ان سے کتنے ہی ملنے سے پیشتر
مِلنے کے بعد اُن سے شکایت نہیں رہی

پہلا سا اضطراب نہ پہلی سی بے کلی
کیا دل پہ تیری چشمِ عنایت نہیں رہی؟

یہ بھی نہیں کہ یاد کئے جا رہے ہیں ہم
یہ بھی نہیں کہ ان سے محبت نہیں رہی

نفرت کے سکّے جیب میں لے کر ہیں گھومتے
لوگوں کے پاس پیار کی دولت نہیں رہی

ایسی بھی کیا خطا ہے کہ محروم خط سے ہوں
پرویز کیا اب اتنی بھی فرصت نہیں رہی

OOO

انور سدید

O

وہ نکل آئی دل کے پتھر سے
جس کلی کو ہم عمر بھر ترسے

آنکھ نے دل کا بھید جان لیا
خون رِسنے لگا ہے اندر سے

صبح گلشن میں جو گری شبنم
اُڑ گئی ساری، دھوپ کے ڈر سے

دل میں شوقِ سفر سمایا تھا
پا برہنہ نکل پڑے گھر سے

حملہ آور ہے وقت کی دیمک
کھوکھلا کر گئی ہے اندر سے

کون سا دورِ جبر یاد آیا
درد چھلکا ہے دیدۂ تر سے

سر برہنہ ہے وقت کی بیٹی
اس کا سر ڈھانپ، اپنی چادر سے

ہے یہ انور سدیدؔ کی خواہش
برسے خوشبو، ہوائے صرصر سے

OOO

بسمل صابری

O

اب کہاں عارض و لب پھول کھلانے والے
اِک جھلک دیکھنے آتے تھے زمانے والے
جان کہہ کر یہ ہمیں لوٹ لیا ہے کِس نے
ہم کہاں تھے بھلا اُس دام میں آنے والے
میری سوچوں کی تو اب برف پگھلتی ہی نہیں
کیسے ممکن ہے کہ لوٹ آئیں وہ جانے والے
زیست کی ایک بھی تصویر نظر آتی نہیں
اب کہاں جائیں نئے خواب سجانے والے
وقت کی موج بہا لے گئی کل اُن کا وجود
اَن کہی بات پہ جذبات میں آنے والے
رات آنگن میں دبے پاؤں چلی آئی ہے
ظلمتِ شب میں نہ آئیں گے بچانے والے
زندگی جیسے بھی گذری ہے گذر جائے گی
ٹھہر جائیں گے یہ لمحات رُلانے والے
دن نکلتا ہے تو اب خُون اُگلتی ہے زمیں
اب کہاں لوگ ہیں ظلمت سے جگانے والے
جو بھی آیا ہے وہ اِک روز چلا جائے گا
وقت کی موج میں بہہ جاتے ہیں جانے والے
زندگی شامِ غریباں ہے تری بسملؔ جاں
یاد رہ جائے گی، ہوں گے نہ رُلانے والے

OOO

رشیدہ عیاں (امریکہ)

O

خدا سے دعا ہے مری زندگی میں کبھی تو کوئی ایک وہ وقت آئے
مدینے کی گلیوں میں آسانیوں سے مجھے میرے مولا، مرا بخت لائے

سنو، ہاں سنو، وہ ہماری سنیں گے، ہمارے سوا اور کس کی سنیں گی
نہ دیکھا، نہ ان کو سُنا، پھر بھی ایمان در بخت ہم اس قدر سخت لائے

یہ لغزش یہ لرزش یہ نادیدہ جادے میرا ہاتھ تھامو، پئے سرفرازی
ابھی ابتدائے سفر ہے ہمارا، نہ یوں مرحلہ سخت در سخت آئے

تعجب نہیں ایسے موسم میں ساقی، درِ میکدہ، جلد ہی، بند کر دے
جو کرنا ہے کر لو، حیاتِ دو روزہ میں ایسا نہ ہو کوچ کا وقت آئے

مری اشک شوئی مرض تو نہیں ہے یہ ہے انفعالِ خفی کی علامت
ہو آئینہ زنگار صیقل بہ تقویٰ تو رویت کی محبوب کی وقت آئے

گہِ عشق اور گاہ عاشق مزاجی کہ دونوں جہاں ہیں عجب امتزاجی
بہ ایں میکدہ از پئے فیض ساقی جو آئے وہ جان و جگر لخت لائے

نہ دولت، نہ ثروت نہ طاقت ہے کوئی، محبت میں دن رات ہے اشک شوئی
عیاںؔ ایسے در کی میں دربانگی ہوں کہ جس پر اگر لائے تو بخت لائے

OOO

ڈاکٹر محبوب راہی (انڈیا)

تضمین بر غزل اظہر جاوید

وہ جو باہمی تھے معاملے سبھی بجھ گئے سبھی سو گئے
وہ جو شکوے تھے وہ جو تھے گلے سبھی بجھ گئے سبھی مر گئے
جو مزے مزے کے تھے مشغلے سبھی بجھ گئے سبھی مر گئے
''وہ جو شوق تھے، جو تھے ولولے سبھی بجھ گئے سبھی مر گئے
مرے عشق کے کئی سلسلے سبھی بجھ گئے سبھی مر گئے''

وہ شعوری طور پہ اپنے آپ کو مشکلات میں ڈالنا
کبھی لڑکھڑانا قدم قدم کبھی گر کے خود کو سنبھالنا
دل و جاں کو اپنے جنونِ شوق میں نیزہ نیزہ اُچھالنا
''کبھی چاند دل میں اُجالنا، وہ کمندیں تاروں پر ڈالنا
وہ کمال کے مرے حوصلے، سبھی بجھ گئے سبھی مر گئے''

شب و روز کی وہ ہر اک گھڑی کہ سراپا سرور خمار تھی
مری زندگی کے ورق ورق پہ جو وقفِ نقش و نگار تھی
وہ جو پیکر رشک بہار تھی دل و جاں سے مجھ پہ نثار تھی
وہ جو آنچلوں کی قطار تھی وہ جو گیسوؤں کی بہار تھی
وہ جو جگنوؤں کے تھے قافلے سبھی بجھ گئے سبھی مر گئے

وہ سہانی سلونی سی ساعتیں جو تھیں بیتے ماہ و سال کی
کوئی ذکر عروج و زوال کا نہ تھی فکر جواب و سوال کی
وہ شکایتیں وہ حکایتیں ہمہ وقت ہجر و وصال کی
''وہ جو قربتیں تھیں کمال کی وہ جو صحبتیں تھیں جمال کی
وہ جو جسم و جاں کے تھے مرحلے سبھی بجھ گئے سبھی مر گئے''

وہ جو ساعتیں وہ جو روز و شب کہ جو آپ اپنی مثال تھے
ہمہ وقت جو تھے تصورات میں پیکرِ حُسن و جمال تھے
وہ محبتوں کے مکالمے مری فکر کا جو مآل تھے
''وہ جو چاہتوں کے غزال تھے وہ جو خواب تھے وہ جو خیال تھے
وہ جو شاعری کے تھے چونچلے سبھی بجھ گئے سبھی مر گئے''

وہ جو ذہن و دل میں تناؤ تھے رگ و پے میں وہ جو کھنچاؤ تھے
جو حسین خوابوں کے زخم تھے وہ جو آرزوؤں کے گھاؤ تھے
نہ گھماؤ تھے نہ پھراؤ تھے نہ وہ بھید تھے، نہ وہ بھاؤ تھے
''وہ جو خواہشوں کے الاؤ تھے وہ جو دھڑکنوں کے سبھاؤ تھے
وہ وصال و ہجر کے مرحلے سبھی بجھ گئے سبھی مر گئے''

جو صداقتوں کا حلیف تھا جو حقیقتوں کا تھا آشنا
جو غلط روی کا حریف تھا وہ جو دوستی کا تھا ہمنوا
وہ جو روشنی کا سفیر تھا جو تھا ظلمتوں پہ چراغ پا
''جو تھا ایک اظہرؔ خوش نوا وہ جو بات کہتا تھا برملا
وہ جو اس کے ہوتے تھے طنطنے سبھی بجھ گئے سبھی مر گئے''

OOO

نجمہ عثمان (برطانیہ)

O

کسی ٹوٹے ہوئے دل میں سمانا چاہتی ہوں
یہ خواہش مضطرب ہے، اک ٹھکانہ چاہتی ہے

عجب لڑکی ہے تعبیروں سے خائف ہی نہیں ہے
سنہرے خواب آنکھوں میں بسانا چاہتی ہے

ابھی بنجر پڑی ہے یہ زمیں، پر دیکھنا تم
نمو کی منتظر ہے لہلہانا چاہتی ہے

جو موسم کے کشاکش سے نہیں واقف ابھی تک
وہ کیوں سوکھے شجر میں آشیانہ چاہتی ہے؟

ہجومِ شادمانی میں کھڑی ہے اور پیہم
وہ رونے کے لیے کوئی بہانہ چاہتی ہے

کبھی آنکھوں میں اس کی اشک آتے ہی نہیں ہیں
کبھی چھوٹے سے دُکھ پر ٹوٹ جانا چاہتی ہے

جو ہونا ہے وہ دیکھا جائے گا، یہ سوچ کر وہ
دیئے کی لو ہوا کے رُخ پہ لانا چاہتی ہے

ہمیں پر ختم ہیں شعر و سخن کی محفلیں اب
پرانی نسل کیوں یہ بھول جانا چاہتی ہے

OOO

ڈاکٹر وصی مکرانی واجدی (نیپال)

O

جو قول و عمل میں کوئی سچا نہیں لگتا
وہ آدمی مجھ کو کبھی اچھا نہیں لگتا

رہتی ہے تری یادوں کی بارات مرے ساتھ
تنہا بھی رہوں میں، کہیں تنہا نہیں لگتا

نفرت سے تو جلتا ہے لہو دل کا ہمیشہ
ہاں پیار میں لیکن کوئی خرچا نہیں لگتا

ماں باپ کو جو چھوڑ دے غیروں کے سہارے
بیٹا وہ کسی کا بھی ہو، بیٹا نہیں لگتا

سستا ہے مگر پیسے بنا لگتا ہے مہنگا
مہنگا بھی ہے، پیسہ ہے تو مہنگا نہیں لگتا

بولے جو کوئی پیار سے وہ لگتا ہے اپنا
اپنوں میں نہ ہو پیار تو اپنا نہیں لگتا

جھوٹا ہے جو انسان وصیؔ واجدی مجھ کو
اچھا نہیں لگتا کبھی اچھا نہیں لگتا

OOO

خورشید بیگ میلسوی

O

میں نے تو دستک دی تھی اندازے سے
لپٹ گیا آ کر کوئی دروازے سے

کس نے میرے کانوں میں سرگوشی کی
خواب کا منظر ٹوٹ گیا آوازے سے

دستِ ہُنر کی کوزہ گری، سبحٰن اللہ
لفظ پرانے بھی لگتے ہیں تازے سے

اندر سے وہ لوگ کریہہ المنظر ہیں
روپ سجائے پھرتے ہیں جو غازے سے

جسم کو آخر ریزہ ریزہ ہونا ہے
بندھا ہوا ہے سانسوں کے شیرازے سے

سنگِ ملامت بن کر اس پر ٹوٹ پڑا
میں نے پتھر پھینکا تھا اندازے سے

یارب خیر ہو میری ساری بستی کی
جھانک رہی ہے وحشت ہر دروازے سے

عشق کمانا کھیل نہیں ہے بچوں کا
ڈرتا ہوں خورشیدؔ اس کے خمیازے سے

OOO

ناصرعلی سیّد

O

بلا کی دھوپ ہے شاید نہ تاب لائے ہوا
چلے گی، دیکھنا، ڈرڈر کے سائے سائے ہوا

عجیب موسمِ جاں ہے کہ دھڑکنیں رو دیں
زوال لمحوں کی رگ رگ میں سرسرائے ہوا

بہت ہی کھلتی سی رنگت کے شام لمحوں کو
نظر یہ کس کی لگی ہے کہ خوں اُڑائے ہوا

ذرا سی دیر کو رُکتی تو پوچھ بھی لیتا
لگا کے آگ تو بس بھاگتی ہی جائے ہوا

یہ خشک آنکھ میں دریا کہاں سے آیا ہے
یہ کون آگ کو دل کی دکھائے جائے ہوا

عجیب وادیٔ نفرت میں قافلہ اُترا
کہ شمعیں پیار کی پَل پَل بجھاتی جائے ہوا

مکانِ دل میں گھٹن ہے کہ بڑھتی جاتی ہے
دریچے سینے کے کھولو کہ آئے جائے ہوا

OOO

سوہن راہی (لندن)

O

مری نظر پہ اُس کی نظر بھی جائے تو
یہ ہوش، جوش کی حد سے گزر بھی جائے تو

مَیں اُلجھنیں بھی کبھی زندگی کی گن لُوں گا
کسی کی یاد کا موسم گزر بھی جائے تو

مَیں اُس پہ گیت کہوں یا کوئی غزل لکھوں
وُہ میرے سوچ کی بانہوں میں بھر بھی جائے تو

غمِ حیات کا پھر رنگ رُوپ کیا ہو گا
یہ وقت گر میرا دو پل ٹھہر بھی جائے تو

مرے اُداس شب و غم کہیں نہ جائیں گے
یہ آنسوؤں کی ندی اب اُتر بھی جائے تو

OOO

اکرام تبسّم

O

جو نہ تھا موجود وہ کردار بھی ڈالا گیا
اِس کہانی میں کہانی کار بھی ڈالا گیا

باغ بانوں میں چُھپے بیٹھے تھے کچھ نمرود بھی
آگ میں ہم کو سرِ گل زار بھی ڈالا گیا

مضحکہ میری غریبی کا اُڑانے کے لیے
میرے ویرانے میں اِک بازار بھی ڈالا گیا

قافلے بھی ارتقاؤں کی طرف بھیجے گئے
رہ نوردوں کو پسِ دیوار بھی ڈالا گیا

پاؤں آہستہ اُٹھانے کی اجازت بھی نہ تھی
اور کاندھوں پر تبسّم بار بھی ڈالا گیا

OOO

بی ڈی کالیہ ہمدمؔ (انڈیا)

O

کیا پتہ کیا سوچ کر انساں بنا دیتا ہے تُو
اور پھر کیا سوچ کر اُن کو مِٹا دیتا ہے تُو
کیا بھلا دیتا ہے تُو اور کیا بُرا دیتا ہے تُو
ہم کو سب منظور ہے جو بھی خُدا دیتا ہے تُو
خار کو بھی فیض سے اپنے ہنسا دیتا ہے تُو
پُھول کو بھی بارہا یارب رُلا دیتا ہے تُو
رُوٹھ جائے جانے سے ترے کشتی پھنسے گرداب میں
تیری مرضی ہو تو ساحل پر لگا دیتا ہے تُو
مانگنے پر بھی خوشی ملتی ہے کب خیرات میں
اور بن مانگے کبھی اس سے سِوا دیتا ہے تُو
بچ گیا قاتل جو اس دُنیا کے ہر قانون سے
ایسے قاتل کو پکڑ کر خود سزا دیتا ہے تُو
اور ہی ہوتا ہے پھر مُرشد! پرستش کا مزا
جامِ وحدت بندگی میں جب ملا دیتا ہے تُو
کس زباں سے ہم ترے رحم و کرم کی داد دیں
بُغض و نفرت کا بھی اُلفت سے صلہ دیتا ہے تُو
درد وغم جو بانٹ لے دُنیا میں خاص و عام کا
دولتِ فیض و کرم اُس پر لُٹا دیتا ہے تُو

OOO

عرش صہبائی (جموں وکشمیر)

O

زندگی کچھ سوز ہے کچھ ساز ہے
دُور تک بکھری ہُوئی آواز ہے
خامشی اُس کی ہے مثلِ گفتگو
ہر نظر جذبات کی غمّاز ہے
کس طرح زندہ ہوں مجھ کو دیکھ کر
زندگی مجھ پر تبسّم ساز ہے
جانفزا نغمات کا خالق ہے یہ
دل اگرچہ اک شکستہ ساز ہے
اس طرح قائم ہے رقصِ زندگی
ساز اُس کا ہے مری آواز ہے
کیا بتاؤں آج کے اس دَور میں
آدمی کتنا زمانہ ساز ہے
اس لئے رکھتا ہُوں مَیں اس کو عزیز
حق پرستی رُوح کی آواز ہے
بافتن(1) ہے پتھّروں کی سرزمیں
پھر بھی مجھ کو اس پہ کتنا ناز ہے
منزلِ مقصود تک پہنچے گی عرشؔ
درد میں لپٹی مری آواز ہے

(1) مقامِ پیدائش

OOO

زمان کنجاہی

O

یہ دوریوں کا تعلّق مجھے عجیب لگا
وہ کوسوں دور تھا مجھ سے، مگر قریب لگا

کِیا ہے پیکرِ جاں کو لہو لہو اِس نے
مزا تو یہ ہے کہ قاتل مجھے طبیب لگا

ہر اک صدا ہے یہاں پر صدائے پُر اسرار
یہ شہر مجھ کو طلسمات کا نقیب لگا

میں سوچتا ہوں کہ آخر یہ کیا تماشہ ہے
جو میرا دشمنِ جاں تھا وہی حبیب لگا

پتہ چلا ہے تجھے پا کے اپنی قیمت کا
وہ خوش نصیب ہوں جو سب کو غم نصیب لگا

میں جس کو چاہوں اُسی کو یہ چاہتا ہے زمانؔ
زمانے بھر میں مجھے دل میرا رقیب لگا

OOO

مظفر حسن منصور

O

نظر وہ پیکرِ گلفام بھی نہیں آتا
گرفت میں دلِ ناکام بھی نہیں آتا

دلوں کو کرتی ہے برباد اس قرینے سے
نگاہِ یار پہ الزام بھی نہیں آتا

ہمارے کام نہیں آتی خوبیِ تقدیر
علاجِ گردشِ ایّام بھی نہیں آتا

متاعِ ظلم پہ نازاں ہے اِس قدر دُنیا
کسی کے ذہن میں انجام بھی نہیں آتا

لگاؤ عرضِ ہُنر سے ہے، علم وفن سے ہے
خلافِ طبع کوئی کام بھی نہیں آتا

میں اُس کی چشمِ فسوں گر پہ ہوں فدا منصورؔ
وہ شخص جس کا مجھے نام بھی نہیں آتا

OOO

آفتاب راجا

O

ہماری آنکھ کو کیا کیا دکھائی دیتا ہے
زمیں پہ چاند کا سایہ دکھائی دیتا ہے
سمٹ کے آنکھ کو ذرّہ دکھائی دیتا ہے
جو پھیل جائے تو صحرا دکھائی دیتا ہے
ہے موجزن مرے من میں ضمیر کی آواز
ابھی تو مجھ کو یہ زندہ دکھائی دیتا ہے
دھڑکتے دِل نے بنائیں لکیریں کاغذ پر
یہ جسم و روح کا رشتہ دکھائی دیتا ہے
چراغ لے کے چلے ہیں ہوا کے دوش پہ ہم
یہ آندھیوں میں بھی جلتا دکھائی دیتا ہے
نمازِ فجر ادا ہو جو صحن مسجد میں
تو مسکراتا سویرا دکھائی دیتا ہے
خلا سے جھانک کے دیکھا تو یہ ہوا معلوم
زمین جیسے ستارا دکھائی دیتاہے
غروب ہوتا ہو سورج تو وقت مغرب کا
عشاء سے پہلے اُجالا دکھائی دیتا ہے
زمین اپنے خزانے اُگلتی رہتی ہے
تباہ حال زمانہ دکھائی دیتا ہے
اس آفتاب کی کرنوں سے چاند روشن ہے
فضا میں نور کا ہالہ دکھائی دیتا ہے

OOO

تسنیم کوثر

O

رنگ بھرنا کبھی خاکوں میں کہانی لکھنا
داستاں غم کی کوئی یاد پرانی لکھنا

دیکھنا جو بھی پرو دینا اسے لفظوں میں
کبھی اوروں کی کبھی اپنی زبانی لکھنا

کھولنا جب کبھی گزرے ہوئے لمحوں کے کواڑ
صبح ارمان بھری، شام سہانی لکھنا

پہلے رکھ دینا چراغوں کو سرِ راہگزر
پھر کسی بھٹکے مسافر کی کہانی لکھنا

یاد میں اس کی جو تکیے کو بھگو دیتے ہیں
ان کو موتی ہی نہیں لعل یمانی لکھنا

درد اور پیار میں کیا رشتہ ہے اس کو بھی کبھی
دے جو مہلت تمہیں اشکوں کی روانی لکھنا

چند اشعار سے کیا ہو گی تسلّی تسنیم
لکھنے بیٹھی ہو تو اب ساری کہانی لکھنا

OOO

اطہر جعفری

O

زخم اپنا نشان چھوڑ گیا
اِک کسک بدگمان چھوڑ گیا

دل میں ویرانیاں ہیں خوف زدہ
کون خالی مکان چھوڑ گیا

اُڑ گیا گھونسلہ ہوا میں مگر
خار و خَس کا جہان چھوڑ گیا

گھر کی دہلیز رو رہی تھی، جہاں
کوئی اک بے زبان چھوڑ گیا

پردۂ شب اُفق کے پار تھا، جب
آفتاب آسمان چھوڑ گیا

اپنے سائے سے جا ملا تھا بدن
جب پرندہ اُڑان چھوڑ گیا

تیر اطہرؔ ہدف کو چُھو نہ سکا
خوف لیکن نشان چھوڑ گیا

OOO

آفتابؔ خان

O

کبھی قرار نہ دے گا یہ اضطراب مجھے
چلا گیا وہ دکھا کر بہت سے خواب مجھے

مرے سوال کا اُس پل ملا جواب مجھے
وہ مسکرا کے جونہی دے گیا گلاب مجھے

مَیں آسمان سے بچھڑا ہُوا ستارا ہوں
خلا میں ڈھونڈتا پھرتا ہے ماہتاب مجھے

مَیں شکر جتنا بھی رَب کا ادا کروں کم ہے
قدم قدم پہ کیا اُس نے کامیاب مجھے

مجھے قبول نہیں بھیک ان اُجالوں کی
مرے خدا نے بنایا ہے آفتاب مجھے

اگر مَیں آج اندھیروں سے دوستی کر لوں
تو کل کہے گا بھلا کون آفتاب مجھے

OOO

مسرت رعنا

O

غرورِ ضبطِ فرقت میں کرم ایسا ہے آخر کیوں؟
وہ اوروں کے حوالوں سے مجھے ملتا ہے آخر کیوں

ابھی تو راہ میں اُس کی فروزاں ہیں مری آنکھیں
وہ اوروں کے چراغوں سے ضیا لیتا ہے آخر کیوں

دفعہ نافذ تمہاری ہے صنم میرے رویّوں پر
تو پھر بے اعتنائی کا گلہ کرتا ہے آخر کیوں

تھکن کے خوف سے عہد سفر جو توڑ دیتا ہے
اُسے ہی رہبرِ منزل بنا رکھا ہے آخر کیوں

کیا جب مصلحت پر فیصلہ باہم جدائی کا
پھر اس کے لوٹ آنے کا یقیں رہتا ہے آخر کیوں

تری دھڑکن کی جس دل تک رسائی ہی نہیں اے دل
تو اُس کے ہجر میں خود کو لہو کرتا ہے آخر کیوں

مکیں کوئی نظر آتا نہیں جب اس خرابے میں
دیا اک رات بھر اس طاق میں جلتا ہے آخر کیوں

جسے خوشبوئے صدہا گل عبارت کر دیا تم نے
اُسے تسخیر کرنے پر بضد رعنؔا ہے آخر کیوں

OOO

ریاض ندیؔم نیازی

O

حسنِ خلوص دیکھ کر میرے بیان میں
تلوار اس نے ڈال لی واپس میان میں

حالات میرے شہر کے آتش فشاں سے ہیں
جیسے الاؤ کھول رہا ہو چٹان میں

فرشِ زمیں پہ گویا قیامت کا تھا سماں
شعلہ دہک رہا تھا کہیں آسمان میں

سمجھیں گے لوگ نیند سے بہتر نماز کو
شامل ہو دل کا سوز جو تیری اذان میں

اپنا وطن جو چھوڑ کے پردیس جا بسے
دھرتی کو بھول بیٹھے ہیں اونچی اُڑان میں

اے ماں مجھے جلائے گی کیا حادثوں کی دھوپ
تیری دعا کے رہتا ہوں میں سائبان میں

وہ بھی ندیؔم ذہن سے معدوم ہو گیا
اک نام رہ گیا تھا ہمارے گمان میں

OOO

فوقیہ مشتاق (امریکہ)

O

تو ہی تو بس مرے اندر ہوتا
رقص میں کوئی قلندر ہوتا

عمر بھر سوچتی رہتی تجھ کو
تو مری سوچ سے باہر ہوتا

میں بھی تحریر میں لاتی اس کو
کوئی دُکھ تو مرے اندر ہوتا

روز آتا مرے ساحل پہ کوئی
میری آنکھوں میں سمندر ہوتا

میں بھی تعبیر کا رستہ تکتی
خواب گر میرا مقدر ہوتا

وار کرتا کوئی شیشہ بڑھ کر
سانس روکے ہوئے پتھر ہوتا

OOO

محمود رحیم

O

مری تاریخ لکھی جا رہی ہے
فضا میں چیخ لکھی جا رہی ہے

ہر اک منظر کو بے چہرہ ہے ہونا
بڑی تنسیخ لکھی جا رہی ہے

ہمیں تحسین کی اُمید دے کر
کڑی توبیخ لکھی جا رہی ہے

غزال آنکھوں کی ویرانی کی خاطر
طلائی سیخ لکھی جا رہی ہے

ہماری دید طے ٹھہری تھی اُس سے
یہ اب تنسیخ لکھی جا رہی ہے

OOO

یاد نگاری

کرنل مجید ملک

......5......

شفیع عقیل

ملک صاحب اپنی یادداشتیں لکھنے پر راضی تو ہو گئے تھے اور انہوں نے لکھنا بھی شروع کر دی تھیں مگر یہ ان کا تساہل تھا، طبیعت کا خاصہ تھا یا پھر مصروفیات کہ وہ باقاعدہ تسلسل سے نہیں لکھتے تھے یہی وجہ تھی کہ ان کے مضامین کا یہ سلسلہ تواتر سے شائع نہیں ہوا تھا بلکہ اس میں وقفہ آ جاتا تھا۔ یادداشتوں کی یہ چند قسطیں 1968ء اور 1969ء کے عرصہ میں شائع ہوئیں تھیں۔ ہمارا خیال تھا کہ کیونکہ ان کے مشاہدات و تجربات کی دنیا بڑی وسیع ہے، اس لیے بھرپور انداز میں زیادہ دورانیے تک لکھا کریں گے لیکن انہوں نے اپنے مضامین میں خود کو تقسیمِ ہند کے حالات و واقعات تک محدود رکھا تھا۔ اگر چہ اس میں سیاق و سباق کے حوالے سے تحریکِ آزادی کا تذکرہ اور بیان ہوتا تھا تاہم انہوں نے اپنا فوکس تقسیم ہند ہی رکھا تھا۔ شاید اس لیے کہ تاریخ آزادی کا یہ باب ان کی آنکھوں کے سامنے رقم ہوا تھا اور وہ آزادیٔ ہند کے مذاکرات کی ہر اونچ نیچ سے آگاہ تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اس مرحلے پر کیا کیا رکاوٹیں درپیش تھیں اور مسلمانوں کے مطالبات منوانے کے لیے قائداعظم نے کس ثابت قدمی اور پُرعزمی کا کردار ادا کیا تھا اور کانگریسی رہنماؤں نے کیا کیا چالیں چلی تھیں۔ یہی نہیں بلکہ وہ تو برطانوی حکومت کی شاطرانہ حکمت عملی سے بھی پوری طرح آگاہ تھے اور تاجِ برطانیہ کے نمائندوں کی در پردہ جانب داریوں کا پسِ منظر بھی جانتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر چہ ان کی یادداشتوں کا سلسلہ زیادہ طویل نہیں تھا لیکن جتنا بھی تھا وہ تاریخی حقائق اور چشم دید واقعات پر مشتمل تھا۔ اس میں انہوں نے بعض ایسے واقعات بھی لکھے تھے اور ایسے مشاہدات کا اظہار بھی کیا تھا جو تاریخ آزادی ہند کے مورخین سے اوجھل تھے۔ انہوں نے اپنے مضامین کے آخری حصوں میں اثاثوں اور املاک کی تقسیم کے پہلو پر بھی خاص طور پر لکھا تھا اور بتایا تھا کہ کس طرح ماؤنٹ بیٹن نے دونوں ملکوں کا گورنر جنرل بننے کے لیے تگ و دو کی تھی اور کیسے قائداعظم نے اس کے منصوبے کو چکنا چور کر دیا تھا۔ یہاں ان مضامین کی تفصیل بیان کرنا مقصود نہیں ہے، بتانا صرف اتنا ہے کہ مجید ملک صاحب نے اگر چہ مضامین کا یہ سلسلہ طویل تحریر نہیں کیا تھا لیکن جتنا بھی لکھا تھا اس میں بہت سے تاریخی حقائق رقم کر دیے تھے جو ہماری جدوجہد آزادی اور تحریکِ پاکستان کا حصہ ہیں۔ ایک بار پھر میں نے ان سے کہا تھا۔

''ملک صاحب! آپ اپنی یادداشتوں کو قدرے تفصیل سے لکھ کر کتابی صورت دیں؟''

سامنے فضا میں گھورتے ہوئے بولے۔

''پھر کیا ہوگا......؟''

اس پر میں نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''یہ تو جدوجہد پاکستان کی ان کہی تاریخ ہے۔اسے رقم ہونا چاہیے!''

میری یہ بات سُن کر انہوں نے ایک بھرپور نظر سے میری طرف دیکھا اور خاموشی اختیار کر لی۔ گویا وہی بے نیازی اور لاپروائی جو وہ اپنی تحریروں کے بارے میں برتتے تھے۔ میری بات یا تجویز کو بھی انہوں نے اسی طرح نظرانداز کر دیا تھا۔

ملک صاحب کی ریٹائرمنٹ کے ساتھ ہی میرا ان سے رابطہ ٹوٹ گیا تھا جس وجہ سے ان سے ملنا ملانا ہوتا تھا، وہ سلسلہ ختم ہو گیا تھا اس لیے صرف ایک دو بار علیک سلیک کا موقع ملا۔ ویسے بھی ان کی زندگی جو ایک مقررہ روش پر چلی آ رہی تھی، اس میں یک دم تبدیلی آ گئی تھی۔ پہلے وہ روزنامہ ''امروز'' اور ''پاکستان ٹائمز'' کے مینجنگ ڈائریکٹر ہو گئے، پھر وہ کولمبو پلان سے منسلک ہو کر سری لنکا چلے گئے تھے اس لیے ان سے ملاقات ہونے کا موقع ملنا ممکن نہیں تھا البتہ جب وہ 1962ء میں کولمبو سے واپس آئے تو اردو مرکزی بورڈ کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے جس کا دفتر لاہور میں تھا۔ اس وقت میری ان سے ایک ملاقات ہوئی تھی۔ میں لاہور گیا تھا اور انہیں سلام کرنے کے لیے ان کے دفتر چلا گیا تھا لیکن اس وقت وہ بے حد مصروف تھے۔ کسی میٹنگ وغیرہ کی تیاری میں تھے لہٰذا یہ ملاقات حال احوال پوچھنے تک محدود رہی تھی۔ میں اپنے دوست حنیف رامے سے گپ شپ کر کے چلا آیا۔

یہ غالباً 1964ء کے شروع کی بات ہے کہ میں نے ملک صاحب کو ایک خط لکھا جس میں تحریر کیا تھا کہ اردو بورڈ میں کوئی لکھنے لکھانے کا کام ہو تو مجھے یاد رکھیے گا۔ میں جانتا تھا کہ وہ میری تحریر سے بھی واقف ہیں اور انہیں میری صلاحیت کا بھی اندازہ ہے بلکہ اس وقت تک میری جو کتابیں چھپ چکی تھیں ان میں سے مجید لاہوری کی سوانح حیات ''مجید لاہوری'' انہوں نے خاص طور پر مجھ سے طلب کی تھی کیونکہ ان دونوں میں بہت اچھے دوستانہ تعلقات تھے۔ جب مجید لاہوری کا انتقال ہوا تھا تو ملک صاحب نے ایک مضمون بھی لکھا تھا جس کا عنوان تھا ''مجید اور مجید''۔ یہ مضمون جون 1957ء میں روزنامہ ''جنگ'' میں شائع ہوا تھا۔ میں خط لکھ کے انتظار میں تھا کہ ملک صاحب کا جواب آئے لیکن خاصے عرصے بعد ان کا مجھے خط ملا جو 8/جولائی 1964ء کا لکھا ہوا تھا اور جو یہ تھا :

برادرعزیز!

کتابیں لکھ لکھا کر دوسرے پبلشرز کے حوالے کیں اور اب کس اطمینان قلب سے کہتے ہو کہ اگر آپ کے بورڈ میں کوئی تالیفی یا تصنیفی کام ہو تو مجھے ضرور یاد رکھیں۔

میں ۱۰ جولائی کو رخصت پر کراچی پہنچ رہا ہوں۔ میرا ٹیلی فون نمبر ۲۰۴۹۷ ہے۔ وقت مقرر کر کے ملاقات ہونی چاہیے تا کہ میں تمہاری اور تم میری سُن لو۔ والسلام

(مجید ملک) ڈائریکٹر

میں نے ملک صاحب کی ہدایت کے مطابق ان کے تحریر کردہ نمبر پر ٹیلی فون کیا، پہلے روز تو پتا چلا کہ وہ کہیں گئے ہوئے ہیں لیکن

جب دو تین دن بعد رِنگ کیا تو ان سے رابطہ ہو گیا۔ کہنے لگے۔

''دو روز بعد اتوار ہے، تم اتوار کی شام کو ہوٹل میٹروپول کے لان میں آ جانا۔ وہاں بات ہو گی۔''

اس زمانے میں میٹروپول ہوٹل کی یہ حالت نہ تھی جو اب ہے بلکہ اس کی بڑی آن بان اور شان ہوا کرتی تھی۔ آج جو کراچی شہر میں بڑے بڑے اور بلند و بالا ہوٹل نظر آتے ہیں، اس دور میں ابھی وجود میں نہیں آئے تھے اس لیے بہت سے صاحبِ حیثیت لوگ اپنی شامیں میٹروپول، پیلس ہوٹل یا پھر بیچ لگژری ہوٹل میں گزارا کرتے تھے یا پھر بوٹ کلب تھا، کراچی جمخانہ کلب تھا، سندھ کلب اور کراچی کلب ہوا کرتے تھے۔ میں ملک صاحب کے کہنے کے مطابق میٹرو ہوٹل گیا تو وہ لان میں ایک طرف دو دیگر اصحاب کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان دو اصحاب میں ایک مشہور ادیب جلیل قدوائی تھے جن کا ملک صاحب سے ساتھ علی گڑھ کے زمانے سے چلا آ رہا تھا اور جو پاکستان میں بھی وزارتِ اطلاعات و نشریات سے وابستہ تھے۔ میرے بھی ان سے اچھے خاصے مراسم تھے البتہ دوسرے صاحب کو میں نہیں جانتا تھا۔ تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد ملک صاحب اپنی کرسی سے اٹھے اور مجھے کلائی سے پکڑ کے ایک طرف لے جا کر بولے۔

''بتاؤ! تم نے کس موضوع پر مسودہ تیار کیا ہے......؟''

میں نے جواب دیا۔

''ملک صاحب! مسودہ تو کوئی تیار نہیں کیا۔ میں نے تو سوچا تھا، شاید آپ کوئی موضوع دیں گے؟''

یہ سُن کر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ہنستے ہوئے کہا۔

''تمہاری مثال بھی وہی ہے کہ سو کوس پر دریا اور شلوار اتار کے کندھے پر رکھ لی۔''

یہ جملہ دراصل ایک پنجابی زبان کی ضرب المثل کا ترجمہ تھا۔ ''سو کوہ دریا تے تنبا موہڈے تے۔'' چونکہ ملک صاحب پنجابی میں بات چیت نہیں کیا کرتے تھے، ہمیشہ اردو ہی بولتے تھے اس لیے انہوں نے پنجابی کی مثل کا ترجمہ کر کے استعمال کی تھی، اس طرح وہ اپنی روش پر بھی قائم رہے تھے اور بات بھی کر لی تھی حالانکہ میں حسبِ معمول پنجابی ہی میں بات کر رہا تھا، جیسے ہمیشہ ان سے کرتا تھا۔ پھر میرے کندھے کو تھپتھپاتے بولے۔

''پہلے کوئی مسودہ تیار کرو اور پھر مجھے بتانا!''

بہرصورت ہماری یہ ملاقات چائے تک ہی محدود رہی کیونکہ ہم جولائی 1964ء میں ملے تھے اور اگلے سال یعنی 1965ء میں مجید ملک صاحب اردو ترقی بورڈ سے الگ ہو گئے تھے اور ان کی جگہ معروف دانش ور اور ہدایت کار اسلم اظہر کے والد اے ڈی اظہر بورڈ کے ڈائریکٹر بن گئے تھے ان سے بھی میرے تعلقات تھے کیونکہ وہ طویل عرصہ تک کراچی میں رہے تھے اور پھر ان کے بعد مشہور افسانہ نگار اشفاق احمد بورڈ کے ڈائریکٹر ہوئے چنانچہ انہوں نے میری کتاب ''پنجاب رنگ'' چھاپی اور دوسرے مسودے کے متن کی ترتیب پر ہمارا اتفاق نہیں ہو سکا تھا۔ اس کا ذکر میں نے اس لیے کیا ہے کہ اس کی تحریک ملک صاحب نے کی تھی۔

مجید ملک صاحب نے ایک بھرپور زندگی گزاری۔ عہدے اور منصب کے لحاظ سے بھی، دوست احباب کے نقطۂ نظر بھی، اور معاشرے میں عزت و توقیر حاصل ہونے کی وجہ سے بھی تاہم ان کی زندگی کا یہ پہلو بڑا دلچسپ ہے کہ وہ ابتدا میں ایک صحافی، افسانہ نگار،

ڈراما نویس اور ایک شاعر کی حیثیت سے سامنے آئے تھے اور آزادی سے قبل ان کے ڈراموں کا ایک مجموعہ بھی ''جواب'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا لیکن انہوں نے اس شعبے میں اپنی صلاحیتوں کو بڑی حد تک نظرانداز کر دیا تھا۔ شاعری اور خصوصاً ایک نظم کی وجہ ہی سے وہ ادبی دنیا میں مصروف ہوئے مگر جب وہ عملی زندگی کے میدان میں آئے تو انہوں نے صرف ایک شاعری ہی کو نہیں بلکہ ادب ہی کو سنجیدگی سے نہیں لیا۔ اس میں جہاں ان کی پیشہ ورانہ بے پناہ مصروفیات کو دخل تھا وہاں ایک وجہ ان کی بے نیاز اور لاپرواطبیعت کا بھی عمل دخل تھا۔ اسی بے نیازی اور بے توجہی ہی کا نتیجہ ہے کہ موجودہ دور کے بہت کم قارئین ان کی ادبی شخصیت سے واقف ہوں گے کیونکہ انہوں نے اپنی شعری اور نثری تحریروں کو مرتب ہی نہیں کیا تھا۔ اس سلسلے میں نئی نسل کے قاری تو بہت ہی کم ہوں گے جو ان کے نام اور کام سے آگاہی رکھتے ہوں۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ انہوں نے جو کچھ لکھا وہ آزادی سے پہلے لکھا۔ ان کی ساری شعری تخلیقات انیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی کے دوران کی ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد ان کی دو چار نظمیں ہی سامنے آئیں البتہ ''چند یادیں'' کے عنوان سے انہوں نے اپنی یادداشتوں کا ایک سلسلہ ضرور تحریر کیا تھا جس کا ذکر میں اسی مضمون میں کر چکا ہوں۔ جہاں تک ان کی شاعری کا تعلق ہے، ایک تو وہ روایت سے جُڑی ہوئی تھی اور دوسرا وہ زیادہ تر رومانی انداز کی ہے۔ میں نے صرف دو تین نظمیں ایسی دیکھی ہیں جو رومان سے ہٹ کے ہیں۔ اگرچہ ان میں بھی ان کا اُسلوب اور طرزِ اظہار کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے، اس کے باوجود وہ موضوع کے لحاظ سے الگ نظر آتی ہیں۔ ایک نظم دیکھیے جس کا عنوان ہے ''تب اور اب''۔

کبھی وہ دن بھی تھے ہمدم کہ میں بے تاب ہو ہو کر
خدا کی بارگہ میں التجا کرتا تھا رو رو کر
کہ اے عرشِ بریں پر رہنے والے اپنی رحمت سے
مجھے حوروں کے عفت دے ستاروں کی بلندی دے
اگر میں اپنے دل کا حال کہتا تھا دعاؤں میں
تو معصومیتیں پرواز کرتی تھیں فضاؤں میں
ازل کے دن ملی تھی پاک بازی اس قدر مجھ کو
مگر اس وقت میں ہوں اور دُنیا کی بُری باتیں
خوشامد، جھوٹ، چالاکی، لگاوٹ، دور کی گھاتیں
دروغِ مصلحت آمیز، ظاہر کی رواداری
تملق، بزدلانہ دُور اندیشی، ریاکاری
قدح آشامیاں، عفت فروشوں سے ملاقاتیں
غرض حرص و ہوا و آز کے دن، عیش کی راتیں
مری قسمت نے رسوا کر دیا ہے کس قدر مجھ کو

غالباً یہ نظم زندگی کے طویل اور تلخ تجربات کا نتیجہ تھی۔

لاہور میں پیدا ہونے والی اس منفرد اور اپنی ذات میں انجمن، شخصیت نے کراچی میں انتقال کیا اور اسی شہر کے فوجی قبرستان میں مدفون ہوئے۔ قبرستان میں ان کی قبر سے تقریباً تیرہ چودہ گز کے فاصلے پر ایک طرف معروف قانون دان اے کے بروہی کی آخری آرام گاہ ہے اور گیارہ بارہ گز کی دوری پر دوسری جانب مشہور عسکری مصنف میجر جنرل اکبر خان کی آخری آرام گاہ ہے۔ مجید ملک صاحب کی قبر پر مندرجہ ذیل کتبہ ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحی

کل من علیها فان ویبقیٰ وجه ربك ذوالجلا والاکرام

مجید ملک

پیدائش......لاہور......1901ء

وفات......کراچی......1976ء

(ختم شد)

◆◆◆

ماہنامہ **تخلیق** لاہور

تخلیق......وہ شبنم ہے جو فطرت کی بے ساختگی کی مظہر ہے!

تخلیق......وہ صبح کا تارا ہے جو تیرگیوں کے چھٹنے کی نوید ہے!

تخلیق......وہ اذان ہے جو سلامتی اور تقدّس کی علامت ہے!

تخلیق......وہ ماہنامہ ہے جو ادب وثقافت کی نئی اقدار کا پیامبر ہے!

تخلیق......وہ آواز، وہ تحریک ہے جو اظہر جاوید کے نام سے پہچانی جاتی ہے!

میری کہانی

......5......

فرخندہ لودھی

حافظ جی کا گھرانا، نانا جی کے گھرانے کی بہت قدر کرتا ہے۔اس گھر سے صرف میں ہی ان کے یہاں قرآن شریف کا سبق لینے جاتی ہوں۔ایک میں ہی بچی تھی گھر کی، باقی دولڑکیاں بڑی ہوگئیں۔میرے علاوہ یہاں اور بہت سی لڑکیاں پڑھتی ہیں۔

جولاہوں کی لڑکی زینت میری ہم سبق اور بہت پکی سہیلی ہے مگر وہ سکول نہیں جاتی۔میں اسلامیہ سکول میں جاتی ہوں۔زینت صاف ستھری اور مہذب لڑکی ہے۔ماں کی لاڈلی، بھائیوں کی چہیتی۔کبھی کبھی ہم ایک دوسرے کے گھر میں بھی آتی جاتی ہیں۔

زینت ہی کے گھر میں پہلی بار میں نے جوان مرد اور جوان عورت کو ایک خاص انداز سے ایک دوسرے کے قریب دیکھا ہے جو ایک دوسرے کو پیار بھری وحشت سے دیکھ رہے تھے۔میرے دل اور دماغ میں ایک آنکھ سی کھلتی ہے۔عجب مترنم سا احساس جاگتا ہے اور تھوڑی حیا سی مجھے وہاں سے بھاگنے میں مدد دیتی ہے۔

زینت کے گھر میں سوائے اس کی بھابھی کے کمرے کے کسی میں کچھ نہیں۔سارے کمرے ڈھانڈ پڑے ہیں۔البتہ سُوت کی انٹیاں، چیرواور دوتین چرخے اِدھراُدھر پڑے ہیں۔زینت کا ابّا اور بھائی باری باری کھڈی پر بیٹھتے اٹھتے رہتے ہیں۔یہ کھڈی یا کپڑا بننے کی مشین گھر کی سب سے نچلی منزل پر بنی ہوئی ہے۔یہ گھر تین منزلہ ہے۔نچلی منزل کاروبار اور کارخانے کے لیے۔دوسری منزل رہائشی اور تیسری منزل گرمی سردی کے حساب سے استعمال ہوتی ہے۔زینت فطری طور پر نہایت شریف اور پاکیزہ مزاج لڑکی ہے۔مجھے اس کی ہنسی اور مسکراہٹ بہت اچھی لگتی ہے۔اُس کے موتی جیسے دانتوں کو ہمیشہ چھوکر دیکھنے کو جی چاہتا ہے اور میں کبھی کبھی چھوبھی لیتی ہوں۔

زینت اور میں ہمیشہ ہم سبق رہنے کی کوشش کرتی ہیں۔دونوں آواز ملاکر رٹا لگاتے ہوئے اتنا چیختی ہیں کہ ہماری کنپٹیاں بجنے لگتی ہیں اور ہم ہانپ ہانپ کر ہنسنے لگتی ہیں مگر دبا دبا کر...... بی بی جی مسکراہٹ آلود تیوری چڑھا کر ڈانٹتی ہیں:

''اتنا مت چلاّیا کرو، کم بختو! پھٹ جاؤ گی کسی دن۔''

ہم ایک دوسری کی طرف دیکھ کر کھل کر ہنسنے لگتی ہیں۔روز کا معمول ایسا ہی ہے۔

بی بی جی نے گھر میں بہت سی مرغیاں پال رکھی ہیں، ایک میاں مٹھو بھی ہے جو سارا دن سعیدہ اور پنی کو آوازیں دے کر چوری مانگتا رہتا ہے۔

''سعیدہ! چوری کھانی ہے۔''

''پنّی! امرود دو...... پنی! امرود دو۔''

جب سعیدہ باجی ڈانٹ پلاتی ہیں تو پنجرے میں لٹکتے جھولے میں بیٹھ کر جھولنے لگتا ہے:

''ٹیں......ٹیں......میں بھولا......میں بھولا۔''

حافظ جی کا صحن پختہ اور بہت کشادہ ہے۔ بی بی جی صفائی ستھرائی کا بے حد خیال رکھتی ہیں۔اس لیے گاہے گاہے لڑکیوں کو حکم ملتا رہتا ہے:

''فلاں......اٹھو، بیٹھ صاف کرو۔''

لڑکی فوراً اُٹھ کر، رمبا اور جھاڑو لے کر بیٹھ پر راکھ ڈالتی ہے اور صاف کر دیتی ہے۔

''دیکھو، دیکھو! ہاتھ اچھی طرح پاک کر کے سیپارے کو لگانا۔''

بی بی جی کچن میں بیٹھے بیٹھے ہدایت کرتی ہیں۔

میری اماں کا آنا جانا نانا جی کے گھر کے علاوہ صرف دو گھروں میں ہے۔ حافظ جی کا گھر، جو چوک کی گلی مڑ کر پاس ہی ہے اور ہمارے گھر کے سامنے ڈاکٹر بسمل کا گھر۔

ڈاکٹر بسمل ہوشیار پور سنٹرل جیل میں ڈاکٹر ہیں۔ شعر و شاعری ان کا مشغلہ ہے اس لیے ''بسمل'' تخلص ہے۔ بسمل صاحب اگرچہ میرے نانا جی سے عمر میں چھوٹے ہیں لیکن ان کا ملنا جلنا صرف نانا جی کے ساتھ ہے۔ نانا جی بھی شاعر ہیں۔ اماں نے بتایا کہ ان کا تخلص 'زخمی' تھا۔

گلی میں زیادہ تر ہنرمند مگر ان پڑھ لوگ رہتے ہیں۔ چوک والے اونچے مکان میں للاری (رنگریز) رہتے ہیں۔ عیشاں للارن سوکھی کالی، جسمانی طور پر پھرتیلی سی عورت۔ گھر میں کم کم نظر آتی ہے۔ اس کے گھر میں ایک جوان لڑکی بھی ہے۔ ایک دن عیشاں نے اُس جوان لڑکی کو صحن میں گرا لیا ہے۔ خود اُس کے سینے پر سوار ہے جیسے گھوڑے پر سوار ہو۔ وہ طمانچوں، گھونسوں سے جوان لڑکی کو پیٹتے اور ہانپتے ہوئے کچھ بک بھی رہی ہے۔ جوان لڑکی چیخ تو رہی ہے، کہتی کیا ہے؟ سمجھ میں نہیں آتا۔

یہ منظر میں للاریوں کے گھر کے باورچی خانے کی کشادہ موری پر آنکھیں رکھے دیکھ رہی ہوں۔ یہ موری ہمیشہ خشک اور صاف ستھری رہتی ہے۔ جانے کس مقصد کے لیے رکھی گئی ہے۔ اس موری سے پختہ صحن میں کھڑے بیری کے پیڑ کا تنا بھی نظر آتا ہے۔ محلے کے بچے گھر کے اندر کا نظارا اس موری سے اکثر کرتے نظر آتے ہیں۔

ہمارے گھر کے نل سے پانی لینے آئی بالاں کی ماں کو امّاں نے روک کر کچھ پوچھنا شروع کیا ہے۔ میرے کان کھڑے ہو گئے ہیں۔ بالاں کا اصل نام اقبال بیگم ہے لیکن اُس کی ماں سمیت سب اُسے بالاں بالاں کہتے ہیں۔ بالاں کا باپ شیخ مہتاب کسی فیکٹری میں کام کرتا ہے۔ بالاں کبھی کبھی میرے ساتھ سکول جاتی ہے لیکن کئی دنوں سے نہیں گئی نہ کہیں نظر آئی۔ اماں نے پوچھا تو اُس کی ماں بتا رہی ہے۔

''کی دساں للاریاں دی موری چہ مونہہ دے کے کھڑی سی اندروں للاریاں دے منڈے نے سیخ تا کے اوہدی اکھ چہ گھسیڑ دتی۔ بھین! بالاں دی اکھ ضائع ہو گئی۔ سکولے کتھوں جانا۔ عمر بھر لئی بجل ہو گئی۔ اُتوں دھی دا دھن۔ اوہ تے شکر آ۔ دوجی اکھ بچ گئی۔''

بالاں کی آنکھیں پونچھتی چلی گئی ہے۔ ماں نے افسردگی سے ہانپ کر مجھے ڈانٹا ہے۔

''پتا چلا! نا۔''

آج گھر میں پھر تین دن کا فاقہ ہے۔ ابا کی افیون بھی نہیں۔ وُہ صبح سے کمرے کے فرش پر لوٹ پوٹ ہو رہے ہیں اور گالیاں بک رہے ہیں۔ دونوں بڑی بہنیں حسبِ معمول پچھلی کوٹھڑی میں دبکی بیٹھی ہیں۔ اماں چارپائی پر بیٹھی ہیں۔ پاؤں فرش پر اور موٹی ململ کا دوپٹہ تقریباً پورے چہرے کو چھپائے ہوئے ہے۔ صرف ناک نظر آ رہی ہے۔ ناک کی پھننگ پر آنسو اٹکا ہُوا ہے۔ میں گلی میں دوسری لڑکیوں کے ساتھ کھیلتے کھیلتے آئی ہوں۔ ''اماں کیوں رو رہی ہیں۔'' میں نے پوچھا نہیں۔ نہ دالان میں گئی ہوں نہ پچھلی کوٹھڑی میں۔ پھر گلی ہی میں نکل گئی ہوں۔ دراصل مجھے اس ٹیکے کی تلاش ہے جسے میں کل شام اپنے ماتھے پر سجا کے ایک ہم جولی شمیم کے ساتھ کلکلی ڈالتی رہی تھی۔ ناچتے گھومتے پیتل کا ٹوٹا ہوا آویزہ جسے میں ٹیکے کے طور پر ماتھے پر لٹکائے خوشی سے ناچ رہی تھی۔ نہ جانے کب اور کس ''گھمن گھیری' میں اُچھل کر کہیں گر پڑا۔ رات دن ڈھونڈا مگر نہیں ملا۔ اب تک نہیں ملا۔

دوپہر بہت گرم، چلچلاتی دھوپ، گھر کے تمام لوگ دالان کا فرش ٹھنڈا کر کے کھری چارپائیوں پر لیٹے کروٹیں بدل رہے ہیں۔ کوئی کب تک کروٹیں بدل سکتا ہے۔ میں دبے پاؤں چھت پر چلی گئی ہوں۔ شیشم کی ٹہنی توڑ کر چھجّے میں لے آئی۔ میرے ہاتھ میں بادام کی موٹی سی گری نہ معلوم کہاں سے آ گئی؟ میرے ذہن نے اُسے نہ معلوم فاختہ کیوں جانا؟ میں نے اپنی اس فاختہ کو شیشم کی ٹہنی سے بنی تکون میں پھنسا دیا ہے۔ اب جی چاہتا ہے میری فاختہ بولے بھی۔ ہُو ہُو...... ہُو ہُو...... پر وہ بولتی نہیں۔ میرا دل اُداس ہو گیا ہے۔ بہت اُداس، بھلا بادام کی خیالی فاختہ کیسے بولے۔

کنیز فاطمہ۔ بڑی بہن جوان ہو گئی ہیں۔ بہت گوری چٹی، نین نقش بھی کھڑے کھڑے ہیں۔ وہ گھر میں سب سے خوبصورت مانی جاتی ہیں۔ ان کو خود شدید احساس ہے کہ وہ بہت حسین ہیں۔ گھر کے کام کاج سے فارغ ہوتے ہی ولایتی صابن مل مل کے منہ دھوتی ہیں۔ چُنا ہُوا ململ کا دوپٹہ جس کو انھوں نے خود ہی رنگا ہے، ابرک لگائی ہے۔ چاولوں کی پیچ کی کلف بھی دی ہے۔ پھر منجھلی بہن کو پکڑا کر سکھایا اور چُنا ہے۔ انہیں بننے سنورنے کا جنون ہے۔ ابا انہیں کڑوی تیکھی نظر سے دیکھتے ہیں۔ مجھے ابا جی کی یہ نظر اچھی نہیں لگتی۔ پتا نہیں کیوں؟

ڈاکٹر بسمل کی تین بیٹیاں اور تین بیٹے ہیں۔ ڈاکٹر بسمل کا تعلّق شہر کی معزز اور اقتصادی طور پر مستحکم فیملی سے ہے۔ اس فیملی کے بیشتر افراد ملازمت پیشہ ہیں یا وکالت کرتے ہیں نئی پود کو اعلیٰ تعلیم کی غرض سے لاہور کے بجائے علی گڑھ بھیجا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ اس خاندان کی لڑکیاں بھی علی گڑھ سے تعلیم حاصل کر کے آتی ہیں۔

اماں کے ان لوگوں سے گزشتہ دو پشتوں سے مراسم ہیں۔ اماں نے ہی بتایا کہ یہ قانون گو شیخ فیملی ہے جو ہندوؤں سے مسلمان ہوئی۔ یہ فیملی ہمیشہ سے فارغ البال اور متوازن ہے۔ ڈاکٹر بسمل کا مکان بہت بڑا اور جدید طرز کا بنا ہُوا ہے۔ اُس گھر کا رقبہ اتنا کشادہ ہے کہ ان کا ایک دروازہ ہماری گلی میں کھلتا ہے اور دوسرا پچھلی گلی میں۔ پچھلی گلی کے سامنے کھیت ہیں اور باغ ہیں۔ ایک طرف محنت کشوں کے مکانات ہیں تو دوسری طرف میونسپل کمیٹی کا دفتر اور ہسپتال ہے۔

ڈاکٹر بسمل کی بیوہ بہن اقبال آپا جی میری اماں کی بچپن کی سہیلی ہیں۔ بیوہ ہونے کے بعد وہ انجمن حمایتِ اسلام کے حال ہی میں کھلے پرائمری سکول میں ٹیچر لگ گئی ہیں۔ اماں نے مجھے اسی سکول میں آپا جی اقبال کے پاس کچی پہلی جماعت میں داخل کروایا ہے۔ اس لحاظ سے آپا جی اقبال میری پہلی استاد ہیں۔

آپا جی نہایت سرخ وسپید۔صاف ستھری۔سادہ مزاج،سنجیدہ اور کم گو خاتون ہیں۔کلاس کے سرے پر تختۂ سیاہ سے ذرا ہٹ کر، چھوٹا سا ڈیسک سامنے رکھے، چھوٹی سی چٹائی فرش پر بچھائے بیٹھی آج بھی میرے تصور میں موجود ہیں۔ان کے ڈیسک پر رکھا لکڑی کا چمکتا ہُوا رول (شرارتی بچیوں کو سزا کے طور پر مارنے والا ڈنڈا) پڑا رہتا ہے۔لڑکیاں آپا جی سے نہیں اس ڈنڈے سے بہت ڈرتی ہیں۔میں نے ایک بار آپا جی کو یہ ڈنڈا پکڑے ہوئے ایک شرارتی لڑکی کو مارتے ہوئے دیکھا۔پھر میں نے دیکھا کہ وُہ اپنی چٹائی پر سر نیوڑہائے بیٹھی چپ چاپ آنسو بہائے جارہی ہیں۔ان کے آنسو کتنے شفاف اور موٹے موٹے ہیں۔

آپا جی مجھے اپنی چٹائی کے قریب بٹھاتی ہیں۔کیوں؟ شاید میں ان کی سہیلی کی بیٹی ہوں۔

کچھ ہی دنوں میں میں نے اور میری ایک اور ہم جماعت نے پکی کا قاعدہ فرفر آپا کو سنا دیا۔آپا جی نے کہا۔اب تم کتاب پڑھو گی،کل کتاب لے کر آنا۔انھوں نے ہم دونوں کو،اپنی کاپی سے دو صفحے پھاڑ کر،ان پر کتاب کا نام لکھ کر،دے دیئے اور تاکید کی کہ اپنی ماؤں کو دے دینا۔یہ ''بھلے دی'' یا ''ہانڈے دی ہٹی'' ☆ سے مل جائیں گی۔کتاب کا نام ہے''اسلام کی پہلی کتاب''۔کتاب کے شوق نے مجھے رات بھر وقفے وقفے سے جگایا۔

اگلے دن میری ہم سبق نے چہکتے ہوئے کتاب آپا جی کو دکھائی ہے۔آپا جی نے مجھ سے بھی پوچھا:''فرخندہ! تمھاری کتاب کہاں ہے؟''......میں جھینپ کر رہ گئی ہوں۔آپا جی نے ہم دونوں لڑکیوں کو ایک ہی کتاب سے سبق دے دیا ہے:

''اللہ تعالیٰ ایک ہے۔حضرت محمد مصطفیٰؐ اُن کے آخری نبی ہیں۔ہم سب مسلمان اللہ کے بندے اور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہیں۔''

مگر میرا ذہن ایک فقرہ دہرانے پر مصر تھا۔''اللہ تعالیٰ ایک ہے۔پاک اور نیک ہے۔''اگلے دن سبق سناتے وقت یہی مصرعہ فٹ سے آپا جی کو سنا دیا۔آپا جی نے ننھی سی ڈانٹ پلائی اور کہا:

''کتاب میں ایسا تو نہیں لکھا۔تم نے سبق صحیح طرح یاد نہیں کیا۔کل کو پکا کے لانا۔ابھی کچا ہے۔''بعد میں پتا چلا کہ رٹا لگانے کو سبق پکانا کہتے ہیں۔

میری ہم سبق بلقیس ایک مزدور کی اکلوتی بیٹی تھی۔وہ صاف ستھرے کپڑے پہنتی جو جھالروں،فیتوں سے سجے ہوئے ہوتے۔شکل کی بھی اچھی۔مزاج کی تو بہت ہی اچھی تھی۔اپنے ہم عصر ناول نگار فرزند علی سے جب بھی کبھی ملی مجھے بلقیس یاد آئی۔شدھ دیہاڑی دار مگر ذوق نہایت ادبی۔قدرت اور قسمت پر گلا بھی ہوتا ہے۔ مجھے بھی کسی نہ کسی طرح اماں نے کتاب منگوا دی ہے۔اب میں اگلا سبق اماں سے پڑھ کر کلاس میں جاتی ہوں۔بلقیس مجھ سے سبق سن لیتی ہے۔ہم دونوں ہم سبق رہنے کی کوشش کرتی ہیں۔

☆ 1995ء میں جب میں اور فرخندہ ہوشیار پور فرخندہ کا آبائی گھر دیکھنے گئے تو فرخندہ ان دونوں دکانوں پر بھی گئی اور پرشوتم داس حکیم کی دکان میں بھی داخل ہوئی۔ان دکانوں پر بیٹھنے والے پوتے اور نواسے فرخندہ کے حافظے پر حیران رہ گئے۔ایک نوجوان نے کہا۔''ہم تو اپنے دادا پرشوتم جی کا نام مدتوں بعد سن رہے ہیں۔'' (صابر لودھی)

آج،سکول میں،صحن میں بنے ہوئے کنویں میں تیسری جماعت کی ایک طالبہ گر گئی۔سکول کی ایک استانی نے جلدی جلدی تھی

گھما کر ڈول کے ذریعے باہر نکال لیا ہے۔ استانی، جس کا نام حمیدہ ہے نہایت معمولی شکل اور کالی رنگت والی ہے، اُسے سب نہایت محبت اور عزت سے دیکھ رہے ہیں۔ ساتھ لپٹا رہے ہیں۔ سلائی کڑھائی کی ماہر اور پیار سے دیکھنے اور گفتگو کرنے والی آج ہم سب کی محبوب ترین شخصیت ہے۔ بہادر اور ہمدرد آپا حمیدہ۔

اس سکول میں استانیوں کو آپا جی کہا جاتا ہے۔ چھوٹی آپا جی، بڑی آپا جی، سب سے بڑا آپا جی......سکول کیا ہے؟ ابابیلوں کا مسکن اور چمگادڑوں کی گپھا ہے۔ دن کے وقت ابابیلیں آتی جاتی رہتی ہیں۔ ان کے آنے کی وجہ سے چمگادڑیں کلبلاتی اور لڑکیوں پر بیٹھیں کرتی رہتی ہیں۔ اچھا خاصا مشغلہ ہے۔ کراہت بھی آتی ہے۔ یہ کسی رئیس کی بہت ہی پرانی حویلی ہے۔ چھوٹی چھوٹی مانک چندی اینٹوں کی بنی ہوئی۔ موٹی موٹی دیواریں جو بہت ہی بلند ہیں۔ لمبے چوڑے کشادہ دالان اور منقش چوبی دروازوں والی اندھیری ڈیوڑھیاں۔ سنا ہے عمارت میں تہہ خانے بھی ہیں حویلی کا مالک خود جانے کہاں رہتا ہے۔ اُس نے یہ حویلی لڑکیوں کا سکول کھولنے کے لیے انجمن کو دے دی ہے۔ سُنا ہے کرایہ بھی نہیں لیتا۔

اُس کے گھرانے کی خواتین کبھی کبھی ہیڈ مسٹریس کے دفتر میں آکر بیٹھتی ہیں۔ اُن کا بڑا رُعب اور ٹھسا ہے۔ کبھی کبھی جلسہ بھی ہوتا ہے۔ برقع پوش بیگمات اور ممبر خواتین لباسِ فاخرہ زیب تن کیے مچان پر بیٹھتی ہیں اور باری باری تقریریں کرتی ہیں۔ میری سمجھ میں بس اتنی بات آتی ہے۔ ''ہم مسلمان دنیا میں خدا کی سب سے اعلیٰ مخلوق ہیں۔ اچھے ہیں، بہت اچھے ہیں ہم لوگ۔'' مجھے اپنے مسلمان ہونے کا احساس یوں تو اماں ہر وقت دلاتی رہتی ہیں لیکن اب بہت زیادہ ہونے لگا ہے۔

سکول میں ایک افواہ سی اُڑتی پھرتی ہے۔ ہماری ہیڈ مسٹریس رخشندہ شیخ کے بارے میں جیسے کوئی تشویش ناک بات ہے۔ مس رخشندہ نئی نئی علی گڑھ سے تعلیم مکمل کر کے آئی تھیں۔ بہت گوری اور سرخ رنگت۔ چہرے کے نقوش بے حد تیکھے، سنہری بال، لمبی چوٹی۔ ریشمی گہرے رنگ کے کپڑے پہنتی تھیں۔ میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار اُن کے ہاتھ پاؤں کے ناخنوں پر گہرے سرخ رنگ کا پالش لگا ہُوا دیکھا جواب تک دل میں گڑا ہُوا ہے۔ گھر جا کر سب کو بتایا۔ ''بڑی آپا جی نے ناخنوں پر ایسی مہندی لگائی ہے جو گلاب کی پتیوں کی طرح کی سرخ اور جان بی بی کے ہونٹوں کی طرح چمکتی ہے۔ پانی پینے، ہاتھ دھونے سے اُترتی بھی نہیں۔''

لوگ رخشندہ شیخ کو بہت خوبصورت کہتے ہیں مگر مجھے وہ کبھی بھی خوبصورت نہیں لگی۔ پتا نہیں کیوں مجھے اس کے پورے سراپا میں کوئی حسن نظر نہیں آیا۔ ماحول میں موجود کچھ سرگوشیوں اور کنکھیوں نے مجھے اور بھی ہلا کر رکھ دیا ہے۔

''سنا ہے مس رخشندہ شیخ ایک سِکھ لڑکے سے پیار کرتی ہے۔''

''اس میں برائی کیا ہے؟'' میرا سات سالہ زندگی کا تجربہ رکھنے والا دماغ بس اتنا ہی سوچتا ہے۔ میں گھر آکر ماں سے پوچھتی ہوں۔ وہ جھٹ سے کہتی ہیں:

''بری بات! بچوں کو ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔''

''میں نے تو نہیں کی......''

''تُف......' مسلمان ہو کر سِکھ سے عشق، قیامت آنے والی ہے۔''

لفظ عشق بھی میرے لیے نیا اور اجنبی ہے۔

''اماں! عشق کیا ہوتا ہے؟''

''چپ رہ۔ بک بک مت کر.....'' اماں آگے سے جواب دیتی ہیں۔ میں کھلکھلا کر ہنس پڑتی ہوں کہ ماں میرے قاعدے والے لفظ بول رہی ہیں۔ قاعدہ میں کب کا ختم کر چکی۔ آپا جی اقبال بیگم اب ہمیں ''اسلام کی پہلی کتاب'' میں سے سبق دیتی ہیں۔ اماں قاعدہ بولتی ہیں۔ مجھے اس بات پر ہنسی آئے چلی جا رہی ہے۔ مس رخشندہ والی بات آئی گئی ہو گئی۔

بڑی بہن کنیز فاطمہ کی شادی ہونے والی ہے۔ اُس کی نسبت کہیں امرتسر میں، میری دور کی ایک پھوپھی کے ذریعے طے ہوئی تھی۔ آپا کنیز بہت پر جوش اور جذباتی رہتی ہیں۔ امرتسر کے لفظ نے اُسے ایک جادوئی حصار میں لے لیا ہے۔ اپنی سگائی پر آپا اِترائی رہتی ہیں۔ جب سے انہوں نے سنا ہے کہ ان کی ہونے والی نندیں فیشن ایبل اور ہونے والا شوہر سیر سپاٹے کا شوقین ہے۔ آئے دن کبھی کلکتے، کبھی بمبئی آتے جاتے رہتے ہیں۔ وہ پھولی نہیں سماتی۔ مسوری، شملہ، ڈلہوزی جیسے نام میں نے آپا ہی کے منہ سے سنے۔ آپا کا تصور اور تخیل آج کل عروج پر ہے۔ شادی کی تیاریاں بھی عروج پر ہیں۔ ابا نے گاؤں میں اپنے حصے کی زرعی اراضی بھی بیچ دی ہے۔ رشتے کی پھوپھی اکثر اپنے ریوڑ کے ساتھ آئی رہتی ہیں۔ آپا کو لے کر بیٹھتی ہے اور بہت باتیں کرتی ہے۔

وہ بہت اونچے لوگ ہیں۔ مجھے تو فکر ہے میرا غریب بھائی کیسے پورا اُترے گا اُن کے ساتھ۔ اُن کے رشتہ دار بھی امیر ہیں۔ وہ تو قسمت سے انہیں لڑکی پسند آ گئی۔ اب برابر آنے کے لیے ہمت تو کرنی پڑے گی میرے بڑے بھائی کو۔

ایسی باتوں سے بڑی آپا اور زیادہ جذباتی اور فیصلہ کن انداز اختیار کر لیتی ہیں۔ ''میری شادی ہو گی تو بس ہو گی۔ ہر حال میں۔ منہ سے بات نکل گئی ہے تو آخری ہے۔'' اماں اور ابا جی کی لڑائی جھگڑے کے ساتھ ساتھ شادی کی تیاریاں زوروں پر ہیں۔ آپا کو اچھے کپڑوں اور ہار سنگار کا جنون کی حد تک شوق ہے۔ وہ اپنی کوٹھڑی میں بیٹھی لکڑی کے موٹے فریم والے آئینے کو اپنے دونوں گھٹنوں میں دبائے دیکھتی رہتی ہیں۔ کبھی بال بناتی ہیں پھر کھول دیتی ہیں۔ ہونٹوں پر گہری سرخی بھی لگا لیتی ہیں۔ اماں اُن کے اس شوق سے عاجز ہیں پھر بھی ضروری چیزیں فراہم کرتی رہتی ہیں مثلاً خوشبودار ولایتی صابن جسے آپا چھپا کے صرف اپنے استعمال کے لیے رکھتی ہیں۔ ٹالکم پاؤڈر جسے ایک بار میں سعیدہ کو دکھانے کے لیے چپکے سے لے گئی تھی۔ یہ ٹالکم پاؤڈر سعیدہ نے اپنے منہ اور بینی کے منہ پر اس قدر تھوپا کہ آٹا، پیسنے والی مشین والا مزدور نظر آنے لگیں۔ ان کا خیال تھا کہ وہ گوری چٹی میم لگتی ہیں۔ میں گھر آئی تو آپا نے کہرام مچایا ہوا تھا میری اچھی خاصی ٹھکائی ہوئی کہ پاؤڈر کا ڈبا، سعیدہ کو دکھانے، میں ہی لے گئی تھی اور اب وہ تقریباً آدھا رہ گیا تھا۔

اس کے بعد آپا نے اپنی چیزیں لکڑی کے صندوق میں رکھنی شروع کر دیں۔ تالا لگا کر چابی اپنے گلے میں ڈال لی۔ [1]

◆◆◆

[1] فرخندہ لودھی ''میری کہانی'' لکھ رہی تھیں۔ ماضی کو بازیافت کر رہی تھیں کہ اچانک ان پر فالج کا حملہ ہو گیا۔ ان کے علاج معالجے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی گئی لیکن وہ جانبر نہ ہو سکیں۔ اس کے ساتھ ہی ان کی یہ تہذیبی سرگزشت بھی زیرِ لحد چلی گئی۔ افسوس صد افسوس!

(ادارہ تخلیق)

نکلے ہوئے جنت سے

......9......

عزیز میرٹھی

جب میں پہلی بار بمبئی آیا تھا تو فلورا فونٹین کے خوبصورت علاقے میں، فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے پل بھر کے لئے غیر ارادی طور پر اچانک ایک ہیئر کٹنگ سیلون کے سامنے رُک گیا تھا۔ دبیز شیشوں کی دیوار کے پیچھے اتنا وسیع اور صاف ستھرا سیلون میں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ ایک طویل ہال میں شفاف آئینوں کے مقابل دور تک کرسیوں کی ایک قطار تھی۔ ہال کے پورے فرش پر سبز رنگ کا قالین بچھا ہوا تھا۔ اور دن میں بھی مرکری لائٹوں سے ہال بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ کٹنگ کرانے والے، شیو بنوانے والے اور مساج کرانے والے بڑے آرام وسکون سے کرسیوں پر گردنیں پیچھے کو ڈالے آنکھیں بند کئے بیٹھے تھے۔ نہایت حسین وجمیل یہودی اور پارسی دوشیزائیں، ان کے بال تراشنے، شیو بنانے، شیمپو یا چہرے کا مساج کرنے میں، لب لعلیں پر مسکراہٹیں سجائے، ہمہ تن مصروف تھیں۔ چٹے سفید فراک پہنے کمر پر سرخ چوڑے بیلٹ کے۔ جن پر ناف کے قریب سنہری بروچ لگے تھے۔ بیلٹ کو کس کر باندھنے سے سینے کا تناؤ زیادہ کمر مزید پتلی اور کولھوں کا اُبھار نمایاں ہو گیا تھا۔ ریشمی سیاہ بالوں کی پونی ٹیل گردن کے پیچھے سفید عریاں جلد پر ناگنوں کی طرح بل کھا رہی تھیں۔ کانوں میں بڑے بڑے گول سنہری رنگ گلابی رخساروں کو چومتے تھے۔ ان کی پنڈلیاں، لمبی، مرمریں، چکنی اور سڈول تھیں۔ ادھر ادھر آتے جاتے غور سے دیکھنے پر محسوس ہوتا جیسے ان گرم خون سے دہکتی پنڈلیوں کی تپش سے سیلون کے موٹے شیشے تڑخ جائیں گے۔ سبز کارپٹ پر ان کے گورے پاؤں اور گلابی ایڑیاں جھیل میں کھلے ہوئے کنول کے پھول لگتی تھیں۔ ایک جمال پرست نوجوان شاعر کے لئے اس جنت نظیر منظر میں بلا کی کشش تھی۔ میں مدہوش سا ہو کر کچھ دیر کے لئے دنیا و مافیہا سے غافل ہو گیا۔ بمبئی کی شاہ راہ اعظم پر ٹریفک کا بے پناہ بے ہنگم شور ایک پُراسرار سناٹے میں بدلے گا۔ میری آنکھیں جیسے سیلون کے شیشے سے چپک کر رہ گئیں، پورا وجود دو بڑی بڑی آنکھوں میں ڈھل گیا۔ ایک پری پیکر گاہک کی کٹنگ کرنے کے بعد آئینہ اٹھا کر لائی اور گاہک کی پشت پر رکھ کر اسے کٹنگ کا معائنہ کرایا اور اس کے اثبات میں سر ہلانے پر آئینہ میز پر رکھ دیا اور ایک مومی شمع روشن کر کے اس کی گدی پر گھماتی رہی، پھر برش سے گدی اور گردن کو صاف کیا۔ کام کرتے ہوئے ان لیڈی باربروں کے گلابی ہونٹوں پر ایک دلکش مسکراہٹ مسلسل کھیل رہی تھی۔ وہ بڑی نرمی اور نفاست وملائمت سے گاہک کے چہرے کو اپنی نازک انگلیوں سے اِدھر اُدھر گھماتی تھیں کہ انسان کے جذبات میں ہلچل مچ جاتی ہوگی۔ غیر ارادی طور پر میرا ہاتھ اپنی جیب کی طرف بڑھا۔ مگر کسی شاخ بریدہ کی طرح گر گیا کیوں کہ جیب کسی بھکاری کے کشکول کی طرح خالی تھی۔ اور میں عالم خیال سے دنیائے وجود میں آ گیا۔ ٹریفک کا

شورکوہ آتش فشاں کی طرح میرے کانوں پر پھٹ پڑا۔دل سے ایک ہُوک اٹھی،کاش میں بھی اس سیلون میں شیو بنواسکتا......

اور آج میں اسی سیلون میں شیو کرانے کے لئے باوردی دربان کے دروازہ کھولنے پرکسی امیر زادے کی طرح درّانہ داخل ہوا۔ جس کے بند دروازے سے دو برس پہلے مایوس ونامراد لوٹ گیا تھا۔وقت بھی کیا کیا رنگ بدلتا ہے۔''راگ رنگ'' کے بکنے کی خوشی کا اثر ابھی ذہن ودل پر باقی تھا کہ فلمی دنیا میں بھی ایک کامیابی حاصل ہوئی۔اس روز عبدالحمید نظامی بھائی کا خط بھی ملا۔جس میں دوسری باتوں کے علاوہ ظفر صاحب کی لاہور سے روانگی کی اطلاع بھی تھی۔تاریخ اور وقت بھی درج تھا لہٰذا دوسرے روز میں نے وکٹوریہ ٹرمینس پر جناب ظفر سہارنپوری کا استقبال کیااورٹرام پرسوار ہوکرمسافر خانے میں لے آیا۔آتے ہی سب سے پہلے حمید نظامی کے خط کا جواب تحریر کیا۔

بمبے

10/اپریل1946ء

برادرعزیزحمیدنظامی سلامت رہو!

واضح ہو کہ میں خیریت سے ہوں۔آج شام ظفر صاحب بخیر و عافیت بمبئی پہنچ گئے ہیں۔تنویر کا سلوک میرے ساتھ انتہائی مخلصانہ بلکہ برادرانہ ہے،تقریباًروز ہی ملاقات ہوتی ہے۔اگر چہ پہلے دن اپنے فلیٹ میں نہ بٹھا کراس نے بہت مایوس کیا تھا۔پردیس میں بےسہارا ویسے بھی زودرنج ہوتا ہے،دوست کی معمولی سی بے رخی بھی فطرتاًدل شکنی کا باعث ہوتی ہے۔مرزاانیس نے کیا خوب کہا تھا :

خیالِ خاطر احباب چاہیئے ہر دم
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

اس روز وہ حقیقتاً مجبور تھا۔اب اپنے ذاتی کام بھی پس پشت ڈال کرمیرے لئے بھاگ دوڑ میں مصروف ہے۔لیکن جیسا کہ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں بمبئی میں مکان نایاب ہیں،فلیٹ تو دور کی بات ہے۔معمولی کھولی کا مالک بھی دس بارہ ہزار پگڑی کے مانگتا ہے۔تنویر نے کہا تھا فی الحال مسافر خانے میں گذارہ کرو۔پریشان ہونے کی ضرورت نہیں اوراس کی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ گرین آرٹ سٹوڈیو کی فلم''اعتبار'' کے دوگیت جواسے تحریر کرنا تھے۔کیونکہ باقی گانےتنویر کے بھانجے نجف اشرف اوراختر امرتسری نے لکھے ہیں یہ نئی کمپنی ہےاورفلم ساز بڑے کنجوس معلوم ہوتے ہیں کیونکہ انہوں نے اپنی فلم کے لئے ایک ناکام ہدایت کاررکولیا ہے۔نجف اوراختر کوگانوں کا جومعاوضہ دیا ہے وہ بڑا شرمناک ہے۔یعنی بیس روپیہ فی گانا۔لیکن تنویر کا ایثار دیکھئے،وہ مجھے کمنی میں لے گیااور ہدایت کار حیدرشاہ سے ملایا۔میری تعریف میں اس قدرمبالغے سے کام لیا کہ زمین وآسمان کے قلابے ملادیئے۔وہ رنگ جمایا کہ خوش ہونے کی بجائے میں دل ہی دل میں شرمندہ ہونے لگا۔ اس کے بعداپنے دوگانوں کا ایگریمنٹ مجھ سے کرایااورکہا

''شاہ جی!عزیز صاحب کواس وقت ہماری مدد کی ضرورت ہے۔اس لئے خیال رکھیں انہیں نجف اوراختر کے ترازو میں نہ تولیں۔''

ہوسکتا ہےتنویر نے یہ گانے مجھےاس لئے دلوائے ہوں کہ وہ اتنے کم معاوضے پرگانا لکھنا اپنی توہین یا بزنس کے منافی سمجھتا ہو، کچھ بھی ہو،میرے لئےتو یہ اس کا احسان ہی تھا۔وہ ایسا نہ کرتا تو بقیہ دوگانے بھی نجف اوراختر ہی لکھتے۔ہدایت کار نے اسی وقت مجھے دونوں گانوں کی سچویشن بڑی تفصیل سے سمجھادیں اورکہا۔

''میرٹھی صاحب! آپ صرف پانچ چھ استھائیاں لکھ کر لائیے، جو استھائی سچویشن پر زیادہ فٹ ہوئی اور میوزک ڈائریکٹر کو بھی پسند آ گئی اس کے انترے بعد میں لکھ دیں۔''

تیسرے روز میں آٹھ استھائیاں مختلف میٹرز میں لکھ کر دفتر پہنچا۔ حُسنِ اتفاق سے اس وقت پورا یونٹ موجود تھا۔ شاہ صاحب بھی تھے اور فلم ساز بھی تھا، کیمرہ مین اور موسیقار حسن لال بھگت رام بھی تھے۔ حیدر شاہ صاحب نے سب سے میرا تعارف کرایا اور کہا۔

''میرٹھی صاحب! کچھ لکھا ہو تو سنائیں۔''

میں نے استھائیاں سنائیں اور خلاف توقع ساری استھائیاں ہی پسند کی گئیں اور خوب داد ملی۔ خدا کا خاص فضل تھا کہ موسیقار جوڑی نے یہاں تک کہا۔

''سیٹھ جی! ساری استھائیاں ہی اتنی اچھی ہیں کہ ریکارڈنگ کے لئے سیلیکٹ کرنا مشکل ہے۔ آپ کچھ بولو تو دو استھائیاں فائنل کر لیں۔''

''ہم کیا بولیں گا؟ بابا! یہ تمہارا اور ڈائریکٹر کا جوب ہے۔''

آخر کافی بحث مباحثے کے بعد دو استھائیاں متفقہ طور پر منتخب کر کے حسن لال نے کہا۔

''میرٹھی صاحب! دونوں گانوں کی ریکارڈنگ تک آپ کو ڈیلی آفس میں آنا پڑا گا۔ انترے آپ ہمارے ساتھ بیٹھ کر لکھیں''

میں نے بخوبی حامی بھر لی، فلم ساز اٹھ کر جانے لگا تو حیدر شاہ صاحب نے اسے روک کر سو روپے کا ایک بیئرر چیک لکھایا اور مجھے دیتے ہوئے کہا۔

''یہ لیں میرٹھی صاحب! یہ آپ کے دونوں گانوں کی اڈوانس پےمنٹ اور......''

پھر انہوں نے اپنی جیب سے بیس روپے نکال کر میری طرف بڑھائے۔

''اور یہ آپ کا کنوینس۔''

میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ تنویر کو پوری روداد سنائی۔ وہ بھی بہت خوش ہوا اور کہا۔

''الحمدللہ، میری محنت ٹھکانے لگی اور شاہ جی نے میری لاج رکھ لی۔''

خدا اسے جزائے خیر دے، اس دور نفسانفسی اور عہد جوانی میں یہ ایثار و قربانی ہر کس و ناکس کا کام نہیں۔ خدائے قدوس نے درویش صفت تنویر نقوی کو حسن صورت کے ساتھ حسن سیرت سے بھی نوازا ہے۔ کہنے لگا۔

''عزیز صاحب! فلمی دنیا میں صحیح مقام اور بلند مرتبہ حاصل کرنے کے لئے کم از کم دو سال بمبئی میں ٹک کر رہنے کی ضرورت ہے۔ جب تک کوئی فلم سپر ہٹ نہ ہو جائے، فنکار کا مستقبل مخدوش رہتا ہے۔ اس دنیا میں فنکار کی لیاقت، قابلیت اور اہلیت کی بجائے معیار کامیابی، کریڈٹ اور شہرت ہے۔ یہاں چڑھتے سورج کی پوجا کی جاتی ہے۔ ڈوبتے ستاروں کا ماتم کوئی نہیں کرتا۔ اچھی فلم بنانے کے لئے بے شک علم و عقل کی ضرورت ہے۔ لیکن ہٹ کرانے کے لئے اوپر والے کا فضل و کرم چاہیئے۔'' تنویر نقوی نے بالکل سچ کہا تھا۔ بہت بعد 1984ء میں میرے ہونہار شاگرد ہدایت کار اقبال کشمیری نے ایک فلم ''قسمت'' بنائی تھی، اس کے ہٹ ہونے پر فلم ساز نے اشتہار دیا۔

''ہم نے تو فلم بنائی تھی۔ قدرت نے ''قسمت'' بنادی۔''

پنجاب کے ایک صوفی شاعر نے اسی موضوع پر کیا خوب کہا۔

مالی دا کم پانی دینا بھر بھر بوکے پاوے
مالک دا کم پھل پُھل لانا لاوے یا نہ لاوے

''سناؤ بات کچھ آگے بڑھی۔'' میں نے کہا۔

''ہاں! آج تین چار انترے لکھے۔ مگر میوزک ڈائریکٹروں کی تسلی نہیں ہوئی۔ جس کا مضمون پسند آتا وہ ٹیون پر فٹ نہ بیٹھتا اسی طرح جو دُھن پر پورا اترتا وہ سچویشن کی پوری طرح عکاسی نہ کرتا۔''

''کوئی بات نہیں، ہمت نہ ہارنا، کوشش جاری رکھو۔''

مجھے بھی انمول گھڑی میں ''آواز دے کہاں ہے'' کے ہر روز کئی کئی انترے لکھنے پڑتے تھے۔ نوشاد صاحب مطمئن ہی نہ ہوتے تھے۔ لیکن ''ہے جستجو کہ خوب سے خوب تر کہاں'' کا نتیجہ ایک سدا بہار نغمے کی صورت میں نکلا۔ عزیز! قدرت نے تمہیں بڑی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ بس مستقل مزاجی سے ڈٹے رہو، پہلے کی طرح اس بار بھی بنتے کام ادھورے چھوڑ کر، بزدلوں کی طرح میدان سے بھاگ نہ اٹھنا ورنہ زندگی بھر پچھتاؤ گے۔'' تنویر سانس لینے کو رُکا تو میں نے کہا۔

''بھائی! میں تو زندگی بھر یہاں سے جانے کا نام نہ لوں۔ مگر سر چھپانے کا ٹھکانہ......'' وہ میری بات کاٹ کر بولا۔

''فکر نہ کرو۔ دوگانے تمہیں یہ دلوا دیئے ہیں۔ ایک اور جگہ کوشش جاری ہے۔ وہاں امید ہے کہ فلم کے سارے گیت تم ہی لکھو گے۔ کارپوریشن کوٹھی کا نقشہ پاس نہیں کر رہی جو ہو میں پلاٹ لے رکھا ہے۔ نقشہ پاس ہو جائے تو گھر تمہارا اپنا ہوگا۔ کام چل پڑے تو وہیں بھابی کو بھی بلا لینا۔ اپنی پروڈکشن بھی بنانے کا پروگرام ہے، لیکن فی الحال'' قصہ مختصر تنویر کی کوششوں سے انور بٹالوی کے فلیٹ میں رات بسر کرنے کی جگہ بھی مل گئی ہے۔ بمبئی میں رات ہوتی ہی کتنی دیر کے لئے ہے؟ پلک جھپکتے گذر جاتی ہے۔ یہ فلیٹ شیواجی پارک میں کیڈل روڈ پر واقع ہے۔ بڑی صاف ستھری اور پرسکون آبادی ہے۔ ماحول انتہائی خوشگوار سمندر کا کنارہ اور ٹھنڈی ہواؤں میں جھومتے تاڑ اور ناریل کے بلند و بالا درخت، فردوس نظر ہیں۔ قریب ہی اداکار ہدایت کار ظہور راجہ اور موسیقار کے۔ امرناتھ کے بنگلے ہیں، جس فلیٹ میں انور بٹالوی کرایہ پر رہتا ہے اس کی اوپری منزل میں علی جن فلم ساز اداکار کرمار اپنی اداکارہ بیوی پرمیلا کے ساتھ رہتا ہے اور یہ فلیٹس ان ہی دونوں کی مشترکہ ملکیت ہیں۔ انور بٹالوی کو یہ فلیٹ ظہور راجہ کی سفارش اور گارنٹی پر ملا ہے۔ انور بٹالوی آج کل ''بادل'' اور ہدایت کا محبوب کے لئے ''انمول گھڑی'' کی کہانی لکھ رہا ہے جس کا منظر نامہ اور مکالمے آغا جانی کاشمیری اور نغمات تنویر نقوی لکھ رہے ہیں۔ فی الحال تم خط کا جواب مسافر خانے کے پتے پر ہی دینا کیونکہ ظفر صاحب کی وجہ سے مجھے روزانہ وہاں کا چکر لگانا ہوگا۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا میں اُن کے لئے کیا کر سکتا ہوں۔ وہ بمبئی آ تو گئے ہیں، لیکن فلمی دنیا میں جگہ بنانا ان کے بس کا روگ نہیں۔ یہاں ایک سے بڑھ کر ایک جغادری گیت نگار پڑا ہے، ان کے دل بند، جگر بند، خط بند خبر بند کو نے سُنے گا۔ صاف صاف کہتا ہوں تو ان کی دل شکنی کا خوف آتا ہے۔ تعریف کرتا ہوں تو فن سے بددیانتی کا مجرم قرار پاتا ہوں، گوئم مشکل وگرنہ گوئم مشکل والا معاملہ ہے۔ اچھا دیکھو جوالہ کو منظور، میں تمہیں عنقریب انور بٹالوی کے فلیٹ کا پورا پتہ لکھوں گا۔ اللہ تعالیٰ ایک دو بڑے اداروں کی فلموں کے گیت دلا دے اور ایک آدھ کہانی بک جائے تو میں اپنا فلیٹ لے لوں گا۔ پھر تمہیں بلا کر بمبئی کی سیر کراؤں گا کہ بڑے شہروں میں ایک شہر یہ بھی دید کے قابل ہے، جس جگہ میں رہتا ہوں اس جگہ کو بھی دیکھو تو

دریائے حیرت میں غوطے کھانے لگو۔ اور کہو واقعی بھائی جان یہ آپ کے خوابوں کی تعبیر ہے جو اب سے تین برس پہلے دیکھے تھے۔ اللہ مہربان ہوا تو میری محنت بہت رنگ لائے گی اور میں ثابت کردوں گا کہ انسان مسلسل کوشش کرے اور ناکامیوں سے دل نہ ہارے تو کوئی کام مشکل نہیں، فرہاد بھی ایک انسان ہی تھا، جو جذبۂ عشق کے بل پر ایک تیشے سے سنگین چٹانوں کے جگر چیر کر دودھ کی نہر نکال لایا تھا۔ جو لوگ میرا مذاق اڑاتے ہیں، ان کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔

جو مجھے کہہ رہے ہیں، دیوانہ، وہ تعصب کی رو میں بہتے ہیں
میں وہی ہوں جو میں سمجھتا ہوں، وہ نہیں ہوں جو لوگ کہتے ہیں

خط کافی طویل ہوگیا ہے، باقی پھر۔ اماں اور ابا کو سلام، اسلم کو پیار، اور تمہاری بھابی کو بہت، بہت............"

تمہارا بھائی، عزیز میرٹھی

(مختتم شد)

◆◆◆

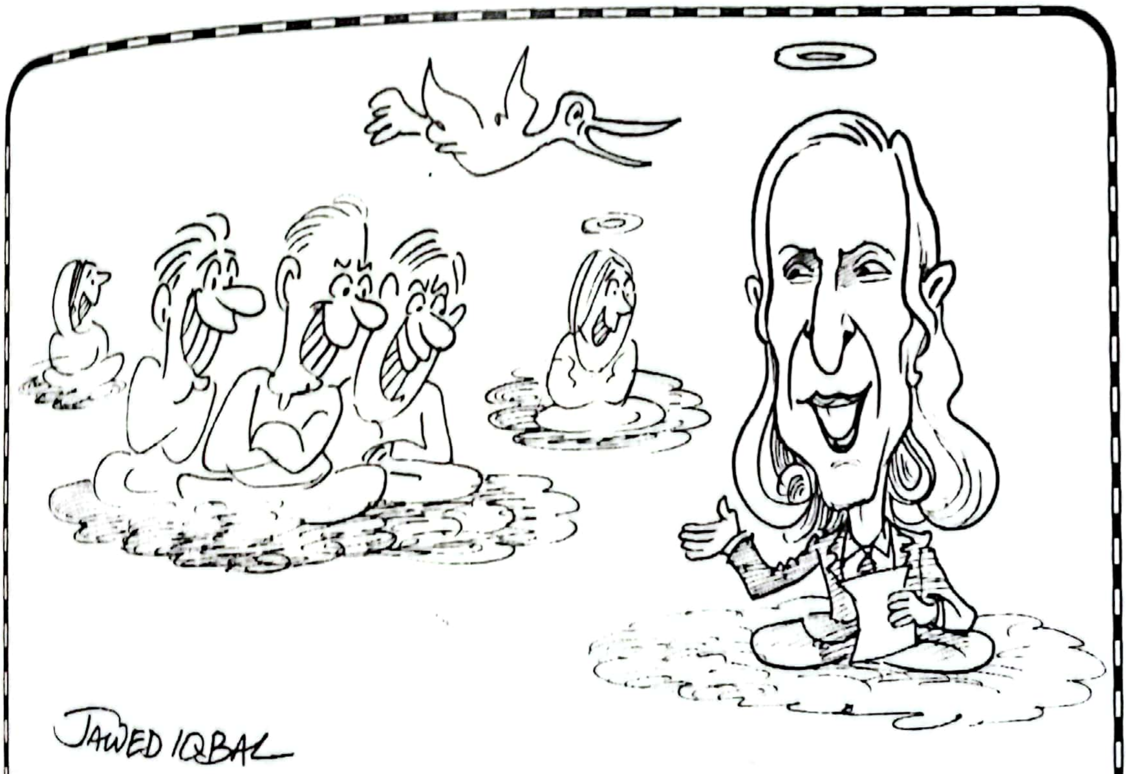

اظہر جاوید ادھر بھی محفل سجا کر بیٹھے ہوں گے

بین الاقوامی کارٹونسٹ جاوید اقبال کا اظہارِ محبت

سفرِ شمال

......5......

طارق محمود

ایک شام چیف سیکرٹری جناب عبداللہ نے مجھے یاد کیا۔معلوم ہوا وہ گھر پر تھے اور وہیں ملنا چاہتے تھے۔اُن دنوں چیف سیکرٹری ہاؤس میں اُن کا دفتر قائم تھا۔نئی عمارت زیرِ تعمیر تھی۔عبداللہ صاحب نے اپنی رہائش گاہ ''پاکستان رورل اکیڈمی'' میں رکھی ہوئی تھی، جو بھلے وقتوں میں شہر کے مضافات میں واقع تھی۔اب بڑھتی ہوئی آبادی کی وجہ سے گنجان علاقے میں گھر چکی تھی۔میں شام گئے اُن کے ہاں پہنچا۔ڈرائنگ روم کی ہر شے سے سادگی جھلک رہی تھی۔چیف سیکرٹری تعیّنات ہونے سے قبل وہ اکیڈمی میں بطور ڈائریکٹر تعینات تھے۔ اُنہوں نے وہیں رہنا پسند کیا۔قدرے توقف کے بعد وہ ڈرائنگ روم میں آئے، سر پر چترالی ٹوپی پہن رکھی تھی اور جسم کو اونی شال سے لپیٹ رکھا تھا۔چند سرکاری امور کے بارے میں ضروری ہدایات کے بعد ہلکی پھلکی گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا جو دیر گئے جاری رہا۔عبداللہ صوبے میں کئی اہم پوسٹوں پر تعیّنات رہ چکے تھے۔انہیں قبائلی ایڈمنسٹریشن کا وسیع تجربہ تھا۔کئی برس تک کمشنر افغان مہاجرین رہے۔خطّے میں ہونے والی اہم تبدیلیوں پر اُن کی گہری نظر اور اپنی مخصوص رائے تھی۔ہم چائے سے فارغ ہو چکے تھے۔اس وقت خاصی دیر ہو چکی تھی۔میں نے اجازت چاہی اور وہاں سے رخصت ہو گیا۔

رورل اکیڈمی کے دونوں اطراف سے کھلے برآمدوں، گزرگاہوں سے مجھے بہت کچھ یاد آ رہا تھا۔پشاور شہر اور اس علاقے سے میرا پہلا تعارف اسی اکیڈمی کے حوالے سے ہوا تھا۔کئی دہائیاں پہلے جب میں نے سروس کا آغاز کیا تو مہینے ڈیڑھ کے بعد میرے ہمراہ کئی اور زیرِ تربیت افسر تھے جنہیں فیلڈ ٹریننگ کے لئے پشاور بھیج دیا گیا۔لگ بھگ ہفتے عشرے کی اس ٹریننگ میں ہمارا قیام اکیڈمی کے ہاسٹل میں تھا۔لاہور میں اسلامی کانفرنس کا انعقاد ہو رہا تھا۔شہر میں وفود کے لئے رہائش گاہوں کی ضرورت آن پڑی۔فیصلہ ہوا تمام سرکاری ہاسٹل، تربیتی ادارے اور اہم ہوٹل خالی کرا لیے جائیں۔اسلامی ممالک سے مختلف نوعیت کے وفود متوقع تھے۔لاہور میں اکیڈمی بھی زیرِ تربیت افسروں کو تمام صوبوں کے مختلف مقامات پر بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا۔ہمارے گروپ میں تمام ساتھی وہ تھے جنہوں نے اکیڈمی میں پشتو بطور اختیاری زبان لے رکھی تھی۔شاہین گیلانی، شفقت محمود، سہیل عباس، سہیل صفدر، نیّر آغا، چوہدری یعقوب اور کچھ اور دوست بھی تھے۔اِس گروپ میں پانچ خواتین پروبیشنرز بھی تھیں۔شفقت محمود اپنے مڈ کیریئر کے دوران سیاست اور صحافت کی نذر ہو گیا۔سہیل عباس نے پی ایچ۔ڈی کرنے کے بعد سائیکالوجسٹ بن گیا۔باقی صاحبان نے سروس میں پوری اننگز کھیلی۔

پشاور میں میرے ساتھ شاہین گیلانی کمرہ شیئر کر رہا تھا۔شاہین کا تعلق بہاولپور سے تھا وہ فارن سروس میں آ گیا۔کئی ممالک میں

سفارت کاری کی۔ خاصا خوش مزاج اور فقرے باز تھا۔ زوردار قہقہے لگانے کا عادی تھا۔ اس گروپ کے انچارج اکیڈمی کے ڈپٹی ڈائریکٹر مسٹر ڈگلس تھے۔ ڈگلس صاحب نسلاً سکاٹش تھے لیکن زندگی برصغیر میں گزار دی تھی، الہ آباد کے گریجویٹ تھے۔ انڈین انفارمیشن سے ملازمت کا آغاز کیا۔ پاکستان بنا تو اس نئی مملکت کا انتخاب کیا۔ پشاور اکیڈمی میں اُن دنوں جناب شعیب سلطان ڈائریکٹر تھے۔ دیہی ترقی اُن کا مخصوص موضوع تھا۔ آنے والے برسوں میں انہوں نے اپنے آپ کو اسی شعبے سے وابستہ کرلیا اور بڑا نام کمایا۔ ہمارے معمولات میں وقت کی پابندی لازم تھی۔ صبح سویرے کوسٹر میں سوار کسی قریبی گاؤں کی طرف نکل جاتے۔ مختلف پروجیکٹس کو بنظرِ غائر دیکھتے تفصیلی نوٹس بناتے، اکیڈمی لوٹتے تو شام کے وقت کامن روم میں بیٹھ کر تبادلۂ خیال کیا جاتا۔ اس روٹین سے فارغ ہوتے تو، تاش اور کیرم کی بازی شروع ہو جاتی۔ ہماری کولیگ فوزیہ نسرین جو بعد میں سفارت کار بن گئیں بہت عمدہ آواز میں گایا کرتی تھیں۔ اس کی آواز میں خاص میلوڈی (Melody) تھی۔ ڈگلس صاحب کے اصرار پر قدرے تردد کے بعد فوزیہ ایک آدھ گانا سنا دیتیں۔ ماحول میں کچھ دیر کے لیے سنجیدگی آ جاتی۔

چند ہی دنوں میں ہم نے سارا شہر گھوم ڈالا۔ کوچی بازار، خیبر بازار، قصہ خوانی بازار، یونیورسٹی، اسلامیہ کالج اور سب سے بڑھ کر داؤدزئی پروجیکٹ جس کا اُن دنوں مربوط دیہی ترقی کے حوالے سے خاصا چرچا تھا۔ ڈگلس بڑی دلچسپ شخصیت کے مالک تھے۔ طبیعت میں ڈسپلن بھی تھا اور بڑی زندہ دلی بھی تھی۔ پروبیشنرز (Probationers) کو ساتھ لے کر چلنے کا فن جانتے تھے۔

اپنے قیام کے دوران ایک روز ہمیں بڈھا بیر ایئربیس کا دورہ کرایا گیا۔ یہ ایئربیس (Air Base) پشاور کے نواح میں تھا۔ بیس پر موجود ماہرین ہمیں مختلف فائیٹر جہازوں کی تفصیلات سے آگاہ کر رہے تھے، خاصا معلوماتی دورہ تھا۔ اختتام پر پرتکلف چائے سے تواضع کی گئی۔ بڈھا بیر آ پ تو ذہن ماضی کی طرف لوٹ گیا۔ ساٹھ کی دہائی کا آغاز تھا۔ میں سکول کا طالب علم تھا جب روس نے اپنی فضاؤں میں امریکی جاسوس طیارے یوٹو کو گرادیا۔ طیارے کے پائلٹ فرانسس پاور نے پیراشوٹ کے ذریعے کود کر اپنی جان بچائی تھی۔ اس طیارے نے مبیّنہ طور پر بڈھا بیر کے مقام سے ہی پرواز کی تھی۔ اُس وقت کے روسی وزیراعظم خروشیف نے مبینہ طور پر نقشے پر بڈھا بیر پر سرخ دائرہ لگا کر اسے تباہ کرنے کی دھمکی دی تھی۔ اتنے برس بیت جانے کے بعد ایسی خبریں اب بھی سننے کو مل جاتی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہ دھمکیاں اب روس کی طرف سے نہیں تھیں۔

اکیڈمی میں قیام کے دوران ایک شام آڈیٹوریم میں ایک دلچسپ محفل میں شمولیت کا موقع ملا۔ اس تقریب میں جناب احمد ندیم قاسمی اور احمد فراز مرحوم خصوصی طور پر مدعو تھے۔ دیہی ترقی کے موضوع سے فراغت ہوئی تو چائے پر دونوں ادبی ہستیوں سے ملاقات ہوئی۔ مختصر سی محفل میں اُنہوں نے اپنا کلام سنایا جسے سب نے بڑی دلچسپی سے سنا۔ میری ان دو اصحاب کے ساتھ پہلی بالمشافہ ملاقات تھی۔ قاسمی صاحب کے ساتھ تو سروس میں آنے کے بعد ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ وہ مجلس ترقی ادب کے ڈائریکٹر تھے اور میں بطور سیکرٹری اطلاعات اس ادارے کا صدرنشین رہا۔ سرکاری امور میں کبھی کبھار اونچ نیچ ہو جاتی لیکن کبھی ایسا دانستہ نہ ہوا تھا۔ عقیدت اور احترام کا رشتہ اپنی جگہ تھا۔ ان کی وفات پر کشور ناہید نے اپنے کالم میں اس بات کا ذکر کر دیا کہ بھلا ہو طارق محمود کا جس نے قاسمی صاحب کے لئے سرکاری سواری کا بندوبست کر دیا۔ وگرنہ پیش روؤں نے یہ معاملہ درخورِ اعتنا بھی نہ سمجھا! کشور کا یہ جملہ پڑھ کر مجھے اپنی کم مائیگی کا شدت سے احساس ہونے لگا۔ کاش اتنی معتبر ہستی کے لیے میں کچھ اور کرنے کے لائق ہوتا۔

فراز صاحب سے کبھی کبھار کسی ادبی یا سوشل تقریب میں ملاقات ہو جاتی۔خصوصی شفقت سے ملتے۔اسلام آباد میں مقیم تھا تو اُنہوں نے ایک شام کھانے پر مدعو کیا۔مصروفیت کی بناء پر میں اُن کے ہاں جا نہ سکا۔اُن سے آخری بار عزیزی شعیب بن عزیز کے ہاں ملاقات ہوئی تھی۔وہ لاہور آئے تو شعیب نے اُن کے اعزاز میں پرتکلف کھانے کا اہتمام کیا تھا۔فراز اچھے موڈ میں تھے، دیر گئے شعروں سے نوازتے رہے۔

جناب عبداللہ کے ہاں سے رورل اکیڈیمی سے رخصت ہوا تو ڈھیر ساری پرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔وسط ستر کی دہائی اور اکیسویں صدی کے آغاز میں پشاور میں کس قدر واضح فرق آ چکا تھا۔افراد کی بھیڑ تھی۔بڑھتی ہوئی آبادی کا دباؤ اور تناؤ تھا۔شہر کے قریہ قریہ میں ہر سمت افغان دکھائی دے رہا تھا۔کہیں دولت وحشمت کی جھلکیاں تھیں کہیں غربت اور افلاس کی تلخیاں تھی۔

ایسی فضا میں یہاں کے قدیمی باسیوں کو اپنا شہر ہوتے ہوئے بھی پرایا لگ رہا تھا۔پشاور کی اس سیر کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ شہر ہمارے اندر بسنے لگتے ہیں اور جب ہم کہیں اور جا بستے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہمیں اپنے سائے بھی پرائے لگتے ہیں۔یہ نہ صرف شہر پشاور کی کہانی تھی بلکہ اس بے محل دور میں ہمارے ہی شہر کی کہانی تھی۔

(جاری ہے)

◆◆◆

ناصر زیدی

کی ایک سے بڑھ کر ایک اعلیٰ غزلوں پر مشتمل 101 غزلوں کا

''نیا مجموعہ''

عنقریب اشاعت پذیر ہونے کو ہے!

سادات پبلی کیشنز

A/3-270، سٹریٹ 6، جوہر ٹاؤن، لاہور۔ فون: 0301-4096710

بیتے کل کا اِک اِک پل

......17......

نذیرؔ فتح پوری (انڈیا)

بجلی تیرے روپ کتنے

یہ بجلی بھی عجیب شئے ہے۔قدرت نے اسے صرف بادلوں میں پوشیدہ رکھا تھا۔اورموسم باراں میں اس کی نقاب کشائی ہوتی تھی۔لغات کے مرتبین نے اس کے بطن سے معانی اورمحاوروں کی دنیا آباد کردی۔اسے برق اورصاعقہ بھی کہا جاتا ہے۔یہاں تک کہ آم کی گٹھلی کا مغز بھی یہی بجلی کہلاتی ہے۔عورتوں کے کان کا ایک زیور بھی بجلی کہلاتا ہے۔بجلی گھر اس عمارت کو کہتے ہیں جس میں بجلی پیدا کرنے کے آلے اورمشینیں نصب ہوتی ہیں۔اس طرح کچھ انسانوں کے جسم بھی ''بجلی گھر'' کی مصداق ہوتے ہیں جن میں چالاکی، پھرتیلا پن، چستی اور تیزی ہوتی ہے۔ایک محاورہ ہے ''بجلی مہمان، گھر میں نہیں تنکا'' کسی میزبان کی کم مائیگی کا احساس اس محاورے میں پوشیدہ ہے۔بعض دفعہ بجلی کا کڑکا سن کربچوں کے دل پرخوف طاری ہوجاتا ہے۔اوروہ ماؤں کے آنچلوں میں چھپ جاتے ہیں۔ بجلی کی لپک، بجلی کی کڑک، بجلی کی چمک، بجلی کی تلوار، بجلی کی سی رفتار، بجلی کی کوند، بجلی کا ٹوٹنا، بجلی کا گرنا۔کتنے رنگ روپ ہوتے ہیں بجلی کے۔بجلی کا مسکن اگرچہ آسمان اورزمین کے درمیان میں ہوتا ہے۔لیکن اس کی یلغار سے نقصان زمین والوں کا ہی ہوتا ہے۔

ایک بجلی وہ ہے جوسائنس کی پیداوار ہے۔اسے انسانی ذہن نے پانی سے پیدا کیا ہے۔آج دنیا کا پورا نظام انسان کی ایجاد کردہ بجلی پر ہی انحصار کرتا ہے جس کی تفصیل کا یہاں محل نہیں۔یہاں بات صرف آسمانی بجلی کی ہے۔بچپن سے لے کرآج تک بڑی سے بڑی اورچھوٹی سے چھوٹی واردات کا بھی میرے دل پرگہرا اثر ہوتا ہے۔اس تعلق سے بچپن کا ایک واقعہ آج بھی میرے ذہن سے چپکا ہوا ہے۔ جب بھی بجلی چمکتی ہے۔آندھی آتی ہے۔مجھے بچپن کا وہ واقعہ یاد آجاتا ہے جس نے میرے گاؤں فتح پور کی بنیاد ہلا کررکھ دی تھی۔

زمینی بجلی کا قہر

مجھے آسمانی بجلی اورزمینی بجلی نے ہمیشہ خوف زدہ رکھا۔جب بھی بادل گرجتے ہیں میرا دل لرز جاتا ہے۔جہاں بجلی چمکی نذیرؔ فتح پوری کے اوسان خطا ہوئے۔موسمِ بہار میں بجلی کی کڑک سن کرمیرے دل کی دھڑکن بڑھ جاتی ہے۔یہی حال زمینی بجلی کا بھی ہے۔ کبھی کبھی بیٹھے بیٹھے ہی یوں محسوس ہونے لگتا ہے جیسے میں نے بجلی کا ننگا تار چھولیا۔میں بلب اور پنکھے کے بٹن لگاتے ہوئے بھی خدا کو یاد

کرتا ہوں۔موبائل جب چارج کرتا ہوں تو بہت احتیاط سے کام لیتا ہوں۔اس سلسلے میں ایک نفسیاتی خوف ہمیشہ مجھ پر غالب رہتا ہے۔ اس کی وجہ مجھے یاد ہے۔بچپن کا ایک حادثہ جو محلّے میں میرے ساتھ کھیلنے والے ایک بچے کے ساتھ پیش آیا تھا۔جس نے اس کی جان لے لی تھی۔

مجھے یاد ہے۔جب فتح پور میں پہلی بار جنگل میں بجلی کے بڑے بڑے کھمبے کھڑے کئے گئے تھے۔تو پورا گاؤں ان کھمبوں کو دیکھنے کے لیےٹوٹ پڑا تھا۔بالخصوص بچوں نے تو جیسے جنگل میں منگل کر دیا تھا۔بچپن ہی سے میری عادت رہی ہے کہ میں بھیڑ کا حصّہ کبھی نہیں بنا۔ہمارے محلے عیدگاہ کے بچے جب جمع ہو کر جنگل میں بجلی کے کھمبے دیکھنے گئے تو میں نہیں گیا۔یہ دوپہر کا وقت تھا۔گرمی بھی خوب تھی۔گرمیوں میں راجستھان کے ریگستانی علاقوں میں ریت بھوبھل کی طرح گرم رہتی ہے۔اور مجھے گرمی سے بھی بہت ڈر لگتا ہے۔ اس لیے میں نہ جا سکا۔جو بچے بجلی کے تار اور کھمبے دیکھنے گئے تھے۔شام میں ان میں سے ایک بچے کی لاش گھر آئی۔جس کا نام حسین تھا۔عمر یہی کوئی آٹھ نو سال کی تھی۔بہت ہی ضدی قسم کا بچہ تھا۔جس کام کے لیے دوسرے بچے انکار کر دیتے یہ وہی کام کرنے کے لیے دوڑ پڑتا۔یہاں بھی یہی ہوا۔بچوں میں شرط لگی کہ کھمبے پر چڑھ کر بجلی کے تار کو کون ہاتھ لگاتا ہے۔چونی (چار آنے) کی شرط پر حسین اس کے لیے تیار ہو گیا۔ان دنوں چار آنے بہت ہوا کرتے تھے۔جس بچے سے شرط لگی تھی حسین نے کھمبے پر چڑھنے سے پہلے ہی اس سے چار آنے وصول کر لیے۔اس نے نیکر اور قمیص پہن رکھی تھی۔دونوں میں جیب نہیں تھے۔اس لیے چوّنی مٹھی میں دبا کر وہ کھمبے پر چڑھ گیا اور جیسے ہی وہ تاروں کے قریب پہنچا تاروں نے اسے اوپر کھینچ لیا۔یہ چونکہ مین پاور کے تار تھے۔پورے راجستھان میں انہی تاروں سے بجلی پہنچائی جاتی تھی اس لیے بہت طاقت ور تھے۔دوسرے ہی پل حسین کی لاش دھڑام سے زمین پر گر پڑی۔بچے گھبرا گئے اور سب بستی کی جانب دوڑ پڑے حسین کا گھر بہادر خان غنی خان جوڑ کی حویلیوں کے سامنے تھا۔گھر کیا تھا کچی مٹی کی دیواروں کا چھپر تھا۔جو کالی مٹی سے لیپ کر بنایا گیا تھا۔

شام ہوتے ہوتے پورے محلے میں صف ماتم بچھ گئی۔کسی نے تھانے میں خبر کر دی۔پولس کا ایک آدمی محلّے میں آیا اور بچوں سے پوچھ تاچھ کرنے لگا۔پولس والا ہمارے گھر بھی آیا اس نے مجھ سے بھی پوچھا۔میں اندر سے بہت ڈرا ہوا تھا۔میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔میری ماں نے بتا دیا کہ میرا بیٹا ان بچوں کے ساتھ نہیں گیا جو بجلی کے کھمبے دیکھنے گئے تھے۔بہرحال غریب بچے کی موت کا معاملہ تھا۔اس لیے پولس والوں نے محلے کے لوگوں سے مل کر اسے تحقیقات کی حدوں میں داخل ہی نہیں ہونے دیا اور سورج ڈوبنے سے پہلے پہلے اس معاملے کو ختم کر دیا۔جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

حسین کا تعلق بہشتی برادری سے تھا۔اس کے ماں باپ محلے کے گھروں میں بکھال کے ذریعہ پانی سپلائی کرتے تھے۔ایک مریل سا بیل انہوں نے پال رکھا تھا۔اسی پر بکھال لاد کر پانی گھر گھر پہنچاتے تھے۔دونوں میاں بیوی بہت ہی کالے کلوٹے تھے۔اتفاق سے دونوں کی ناک چپٹی تھی۔بات کرتے وقت پورے لفظ نہیں نکلتے تھے۔حالانکہ پوری طرح گونگے بھی نہیں تھے۔اسے مکمل طور پر ناک میں بولنا بھی نہیں کہہ سکتے۔وہ ذہنی طور پر بھی فعال نہیں تھے۔حسین کے علاوہ ایک بیٹا اور بھی تھا۔اس وقت اس کی عمر چھ سات برس رہی ہوگی۔دونوں بیٹے ماں باپ کی طرح کالے تھے۔حسین کو محلّے میں سب دھیریا کہتے تھے۔یعنی اندھیرے کا بیٹا، وہ تھا

بھی اندھیرے کا بیٹا، ایک دم کالی دیوار کی طرح، رات میں جب ہم کھیلتے اور حسین کہیں چھپ جاتا تو نظر ہی نہیں آتا تھا۔ چاروں کی چھڑی ایسی سخت تھی جیسے آپ نے کسی بھینسے کو چھولیا ہو۔ حسین کے گھر سے سوقدم کے فاصلے پر اسلامیہ اسکول عیدگاہ کی عمارت تھی۔ لیکن وہ کبھی اسکول نہیں گیا۔ ان دنوں تعلیم کا ایسا چرچا بھی نہیں تھا۔ صرف امیروں کے بچے ہی اسکول جاتے تھے۔ حالانکہ اسکول کے سامنے والے چوک میں بچے اکثر کھیلنے آتے تھے۔ ان میں حسین بھی ہوتا تھا لیکن اسکول کے رجسٹر میں اُس کا نام کبھی درج نہ ہوسکا۔

مجھے ٹھیک سے یاد نہیں۔ غالبًا دوسرے دن صبح اس کا جنازہ اٹھایا گیا۔ اور جنازہ کیا ہوگا بس اسی کی برادری کے دو چار لوگ اس کی لاش کو اٹھا کر دفنا آئے ہونگے امیر لوگ غریبوں کے جنازوں میں کب شریک ہوتے ہیں۔ آٹھ نو برس کا حسین اپنی تمام شرارتوں کے ساتھ بلکہ معصوم جبلتوں کے ساتھ قبر کا حصہ بن گیا۔ اس کی ماں جب تک زندہ رہی ''میرا دھیریا، میرا دھیریا'' ہی کہتے رہی۔ آٹھ نو برس کی عمر میں بھی وہ حوصلہ مند تھا۔ ہمت والا تھا۔ اسی لیے تو بجلی کے کھمبے پر چڑھ کر جان دیدی۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ جس چوّنی کے لیے اس نے جان دی تھی۔ بجلی کا کرنٹ لگنے سے وہ چونی اس کی ہتھیلی میں پیوست ہوگئی تھی۔ جسے غسل کے وقت بڑی مشکل سے نکالا گیا تھا۔ اس واقعہ میں ایک عبرت ہے خدا کے بندوں کے لیے۔ ہم لوگ دنیا کے عیش و آرام کی حصولی کے لیے کیا کیا نہیں کرتے۔ نہ حرام، نہ حلال۔ بس جو کچھ جہاں سے جتنا ہاتھ لگا حاصل کر لیتے ہیں اور عیش کرتے ہیں۔ اس دن کو بھول جاتے ہیں جس دن حسین کی چوّنی کی طرح سب کچھ اس دنیا میں چھوڑ جانا ہے۔ اور اندھیروں کی قبر میں کیڑوں کی خوراک بننا ہے۔ میں واقعی بزدل تھا۔ میں اس کے جنازے میں شریک نہ ہوسکا۔ میں آج بھی اسی کیفیت کا شکار ہوں۔ کسی کی موت کی خبر سن کر میں سکتے میں آجاتا ہوں۔ اور بڑی مشکل سے قبرستان تک جا پاتا ہوں۔ حسین کا میرا ساتھ زیادہ نہیں رہا۔ بس محلّے کے بچوں کے ساتھ ہم دونوں بھی کبھی کبھار کسی کھیل کا حصّہ بن جایا کرتے تھے۔ لیکن اس کی موت کو میں کبھی نہیں بھول سکا۔ آج بھی تازہ گزرے حادثے کی طرح سارا منظر نامہ میرے حافظے کی کتاب میں درج ہے۔ آج بھی بجلی کا بٹن دباتے ہوئے مجھے ڈر لگتا ہے۔

آسمانی بجلی کا قہر

(یہ واقعہ پونہ آنے کے بعد رونما ہوا تھا۔)

یہ ان دنوں کی بات ہے جب مجھ پر معاشی بدحالی کا شدید حملہ ہوا اور میرا انیتا پارک کا خوبصورت فلیٹ فروخت ہوگیا۔ جس دن فلیٹ کا سودا ہوا اس رات ہم دونوں میاں بیوی بہت غم زدہ تھے اور بچے باقاعدہ رو رہے تھے۔ صبح دس بجے سامان ٹرک میں لاد کر ہم لوگ سنجے پارک کے ایک مکان میں منتقل ہوگئے۔ یہ مکان دراصل ایک اُجڑی ہوئی بیکری کی شکل میں تھا جو کچھ دنوں کے لیے ہمارے ماموں زاد بھائیوں نے ہمیں فراہم کیا تھا۔ تمام دیواریں اور چھت بیکری کے دھوئیں سے کالے پڑ گئے تھے۔ اِدھر اُدھر چھت پر جالے بھی لٹک رہے تھے۔ رات میں جب بجلی چلی جاتی تو یوں لگتا جیسے ہمیں کسی نے قبر میں اُتار دیا ہو۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا۔ ہمارے ذہنوں میں اندھیروں کی فوج اس طرح دوڑتی محسوس ہوتی جیسے افغانستان اور عراق میں امریکی فوجی جدید ہتھیاروں سے لیس گشت کر رہے ہوں اور شہر کے باشندے ان کے بوٹوں کی آواز سن کر دبکے پڑے ہوں۔

اس بیچ ماں کے کہنے پر میرے چھوٹے بھائی ناصر نے سنجے پارک کے دوسرے حصّے ومان درشن میں مدینہ مسجد کے سامنے

ایک زمین کا ٹکڑا دو لاکھ میں دلوا دیا۔ خدا کے بھروسے اسی زمین پر چار کمروں کی تعمیر کا نقشہ کاغذ پر ابھر آیا اور پھر نقشے کے مطابق بنیاد کا کام شروع کر دیا گیا۔ دھیرے دھیرے انچ انچ کر کے مکان زمین سے ابھرنے لگا۔ سڑک سے دو فٹ کی اونچائی پر حصار باندھ کر فرش کا کام پورا ہوا تو کالموں کا کام شروع ہو گیا۔ اسی دوران بسنت رُت نے آنکھیں کھولیں۔ برسات کا موسم شروع ہو گیا۔ اور ایک شام میں شہر سے گھر کی طرف لوٹ رہا تھا۔ اپنی دو چاک والی موپیڈ (جسے یہاں لونا کہتے ہیں میں نے ادب کی زبان میں اسے ایک سطری نظم کا نام دے رکھا تھا) پر سوار تھا۔ اس روز بادل برس نہیں رہے تھے بلکہ چنگھاڑ رہے تھے۔ اور بجلی بھی بادلوں کے حصار کو توڑ کر زمین پر حملہ آور ہونے کے لیے ''باولی، اتاولی'' ہو رہی تھی۔ بجلی کی ایسی بے تابی میں نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ مغرب کے بعد کا وقت تھا۔ گولف کلب روڈ پر میرے سواا کا دکا راہ گیر ہی نظر آ رہا تھا۔ کبھی کبھی کوئی گاڑی پھراٹے بھرتی ہوئی قریب سے گزر جاتی۔

میری گاڑی کی رفتار سب سے کم تھی۔ یہی میری زندگی کی رفتار بھی ہے۔ دنیاوی اعتبار سے بھی میں بہت سوں سے پیچھے چل رہا ہوں۔ میری سبک رفتاری ہمیشہ میرے لیے طمانیت کا باعث رہی۔ یہ سبک روی میرے لیے کبھی سبکی کا سبب نہیں بنی۔ تو میں بادلوں کی چنگھاڑ اور بجلی کی یلغار کے سائے میں سبک رفتاری سے اپنے گھر کی جانب رواں تھا۔ اچانک بجلی کی ایک لہر سڑک کو چھوتی ہوئی میرے سامنے سے گزر گئی۔ جس کا کرنٹ سڑک سے ہوتا ہوا میری لونا میں سرایت کر گیا اور میرے بائیں ہاتھ میں کرنٹ اتر گیا۔ بجلی دور جا کر گولف کلب کے پچھواڑے کی بستی پر گری۔ ایسا دھماکہ ہوا کہ سارا ماحول لرز گیا۔ میری سبک رفتاری میرے کام آئی۔ خدا نے جان بخشی، اگر گاڑی کی رفتار تھوڑی سی بڑھ جاتی تو اس دن میرا قصّہ تمام تھا۔ اور یہ بھی اچھا ہوا کہ بجلی کے کرنٹ سے پٹرول کی ٹنکی پر کوئی اثر نہیں ہوا اور نہ گاڑی میں آگ لگ جاتی اور کیا حشر ہوتا خدا جانے موت جب زندگی کے قدم چھو کر گزرتی ہے تو احساسات کے بخیئے ادھیڑ دیتی ہے۔ کرنٹ لگنے سے میرا بایاں ہاتھ نیم مردہ ہو گیا تھا۔ دھیرے دھیرے ایک ہاتھ سے گاڑی چلاتے ہوئے گھر کی سمت بڑھنے لگا۔ گھر پہنچنے تک یوں لگ رہا تھا جیسے بجلی اپنے پورے جلال کے ساتھ میرے آگے آگے چل رہی ہے۔ گھر آنے کے بعد بیوی نے دیر تک ہاتھ کی مالش کی اور گرم کپڑا لپیٹ کر سو گیا۔ اور پھر دوسرے دن شام میں اسی وقت بجلی نے میرے زیر تعمیر گھر پر حملہ کر دیا۔ اس وقت چھت کا کام شروع نہیں ہوا تھا۔ صرف کالم کھڑے کئے گئے تھے۔ بجلی نے اتنا کرم کیا کہ کالموں کے سر سے گزر کر ''سیفٹی ٹینک'' پر حملہ آوار ہوئی۔ جس سے سیفٹی ٹینک کی دیواریں اکھڑ گئیں۔ میرا بڑا بیٹا اقبال کام کی نگرانی پر معمور تھا اس نے بتایا کہ دھماکہ اتنا شدید تھا کہ ساری بستی لرز اٹھی۔ جو مزدور کام کر رہا تھا وہ بال بال بچا، وہ اس قدر سہم گیا کہ دوسرے دن کام چھوڑ کر چلا گیا، ہم تو کہیں نہیں جا سکتے تھے۔ چمن کھلتے رہتے ہیں، آشیانے بنتے رہتے ہیں اور بجلیاں گرتی رہتی ہیں، لیکن ساتھ ساتھ دعاؤں کا سائباں بھی چلتا رہتا ہے۔ انسان کی زندگی میں دعاؤں کے پھول نہ ہوں تو زندگی اُجڑ دیار بن کر رہ جاتی ہے۔

میں آج بھی زمینی و آسمانی دونوں بجلیوں سے بے حد خائف رہتا ہوں۔ یہ ایک نفسیاتی مرض ہے جس نے مجھے مبتلا کر رکھا ہے۔ میں نے بہت چاہا کہ شعر کے قالب میں اتار کر اپنے ذہن کو اس خوف سے آزاد کر لوں۔ لیکن میں اپنی تخلیقی زود نویسی کے باوجود اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اس وقت مجھے اپنی دو مختلف غزلوں کے دو شعر یاد آ رہے ہیں جن میں بجلی کا ذکر ہے۔

بجلیوں نے کیا رُخ زمیں کی طرف   جب مکمل مرا بیج بونا ہوا

....

میرا گھر بن کے جس دم مکمل ہوا آسمانوں سے بجلی گرائی گئی

اور چار چھ برس کے بعد ایک دن میں ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے رختِ سفر باندھ کر گھر سے نکلنے کی تیاری کر رہا تھا کہ اچانک بادل اُمنڈ آئے اور بادلوں نے بجلی کے دیوتا کی ساری مشقیں کھول دیں اور بجلیوں نے بھی آؤ دیکھا نہ تاؤ زمیں پر حملہ کر دیا ایک ایک پل میں بجلیوں کی گھڑ گھڑاہٹ کے ساتھ ساری بستی روشنی میں ڈوبنے لگی۔ بجلی کی ایسی خطرناک آواز اور بادلوں کے ٹکرانے کی ایسی بھیانک آواز یہاں سنجے پارک میں رہائش کے بعد پہلی بار سنی تھی۔ میرے دونوں پوتے سہم کر بستر میں دُبک گئے تھے۔ میرے مکان کے سامنے کچے گھروں میں جو لوگ رہتے تھے اُن کا بُرا حال تھا۔ ہر پل انہیں ان کے گھروں کے اُڑ جانے کا خطرہ لاحق تھا۔ پھر بجلی چلی گئی اور ساری بستی اندھیرے میں ڈوب گئی۔ میں ہال سے برآمدے میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ حالانکہ اندر سے بہت سہا ہوا تھا۔ لیکن دونوں ہاتھ جوڑ کے خدا سے دعا کر رہا تھا۔ اپنے گھر کے لیے، اپنی بستی کے لیے، اپنے گھر کے سامنے والے چار جھونپڑوں کی سلامتی کے لیے۔

کچھ دیر بعد بجلی آ گئی لیکن آسمانی بجلی کا قہر بدستور قائم تھا۔ میرے گھر کے آنگن میں لگے آم کے دونوں پیڑ ہوا کی یلغار سے بے حال نہیں بلکہ بدحال ہو رہے تھے۔ مجھے ڈر لگ رہا تھا کہ پیڑ جڑ سے نہ اکھڑ جائیں۔ لیکن پیڑ چھوٹے تھے۔ کم عمر تھے۔ زیادہ پھیلے ہوئے نہیں تھے اس لیے کھڑے رہے۔ بجلی، آندھی اور برسات کا مسلسل وار سہتے رہے۔ میں برآمدے میں کھڑا سارا منظر نظر میں اُتار رہا تھا۔ ابھی میری گاڑی میں ایک گھنٹے کا وقت تھا۔ میرے گھر سے اسٹیشن آدھے گھنٹے کی مسافت تھی۔ اچانک بارش رُک گئی۔ بادل بھی خاموش ہو گئے۔ بجلیاں بھی مقیّد ہو گئیں، دس منٹ میں پورا منظر نامہ ہی تبدیل ہو گیا۔ میں نے گھر میں مشورہ کیا۔ کسی کو لگا ہی نہیں کہ ہم دس منٹ پہلے پوری بستی کے ساتھ بجلیوں کی زد پر تھے۔ بیوی نے اجازت دیدی۔ بچوں نے بھی جانے کے لیے نہیں روکا۔ ۔ چونکہ مشاعرے کی دعوت تھی ٹکٹ ریز رو تھے اور سامان باندھ کر تیار تھا اور میں نے تو سفر کی نیت اس دن سے باندھ رکھی تھی جس دن مشاعرے میں شرکت کی دعوت ملی تھی۔ میرے اشارے پر بیٹے نے اپنی بائک نکالی اور بیس منٹ کے اندر اندر مجھے ریلوے اسٹیشن چھوڑ آیا۔ ریل میں بیٹھ کر میں اپنا ہی یہ گیت گنگنانے لگا۔

گیت

دل کیا کیا مچلتا ہے برسات کے موسم میں
بادل جو ستاتے ہیں برسات کے موسم میں
بجلی جو چمکتی ہے برسات کے موسم میں
پیاسی تھی بہت دھرتی پانی کی ضرورت تھی
جب گھِر کے گھٹا آئی، ہر سمت خوشی چھائی
برسات کی یہ شدت، بستی کو ڈبو دے گی
بس خوف ہی پلتا ہے برسات کے موسم میں

طوفاں اُبلتا ہے برسات کے موسم میں
اک خوف سا جگاتے ہیں برسات کے موسم میں
شعلہ سا لپکتی ہے برسات کے موسم میں
بکھری ہوئی ہر جانب گرمی کی تمازت تھی
بجلی کی جسارت ہے، ناگن سی جو لہرائی
غربت کی زمینوں میں اک خوف سا بو دے گی
طوفان اُبلتا ہے برسات کے موسم میں

(جاری ہے)

◆◆◆

ڈائری

سنگریزے اور جواہر

غلام الثقلین نقوی

19 ستمبر 1988ء

نفیِ ہستی کرشمہ ہے دلِ آگاہ کا لا کے دریا میں نہاں موتی ہے اِلا اللہ کا

(اقبال۔سوامی رام تیرتھ)

میں اِن دنوں اپنے اساتذہ کے ساتھ ایک 'رابطہ' لکھ رہا ہوں۔ ڈی۔بی ہائی اسکول دیپالپور میں میرے ایک استاد پنڈت چمن لال تھے۔اُن سے اپنا رابطہ لکھتے وقت گوسوامی رام تیرتھ بہت یاد آئے۔'رابطے' کا متعلقہ حصہ یوں ہے......''میرے والد اور پنڈت جی کبھی کبھار روحانیت پر بات چیت کرتے تھے جس میں مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔سوامی رام تیرتھ کے انگریزی لیکچروں کا ایک مجموعہ پنڈت جی نے میرے والدِ مرحوم کو دیا تھا اور ''گیتا بھگوت'' کا اُردو ترجمہ بھی۔والد صاحب مجھ سے کہا کرتے تھے کہ سوامی جی کے لیکچر پڑھو۔دیکھو کتنی سادہ اور خوبصورت انگریزی لکھی ہے۔دسویں میں مجھے اتنی انگریزی کہاں آتی تھی کہ میں سوامی جی کے لیکچروں سے محظوظ ہوسکتا۔بلاشبہ نہایت سادہ انگریزی تھی لیکن مطالب اتنے گہرے تھے کہ اُن تک میری رسائی نہ ہوسکتی تھی۔البتہ دیباچے میں اُن کی مختصر زندگی کے جو محیّر العقول حالات لکھے تھے،اُنھوں نے مجھے بہت متاثر کیا۔شاید اس لیے کہ اِن میں افسانہ وافسوں کی پُراسرار فضا چھائی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔''

میں وثوق سے تو نہیں کہہ سکتا لیکن اِس کتاب کے آغاز میں سوامی جی کی تصویر بھی تھی۔چار ابرو کا صافا اور گیروے کپڑے۔پاؤں میں لکڑی کی کھڑاؤں۔اَب پچاس سال کی دُوری سے اُن کے چہرے کے خدوخال یاد نہیں آرہے۔ہر لیکچر کا آغاز مندرجہ ذیل فقرے سے ہوتا: Myself in the form of ladies and gentlemen.

ایک لیکچر میں ''تربوز'' والی حکایت بیان ہوئی تھی کہ ایک ہندوستانی،ایک ایرانی اور ایک انگریز ہم سفر تھے۔ایک جگہ اُنہیں 'تربوز' نظر آیا۔ہندوستانی نے کہا کہ یہ ہندوانہ ہے،ایرانی بولا تربوز ہے اور انگریز نے کہا کہ تم دونوں غلط کہتے ہو''یہ واٹرمیلن'' ہے۔''اس حکایت سے سوامی جی نے جو نتیجہ اخذ کیا تھا، وہ مجھے یاد نہیں۔اِسی لیکچر میں یا کسی اور لیکچر میں سوامی جی نے شاہجہان اور اورنگ زیب کا ایک قصّہ بیان کر کے اُس سے کچھ نتائج اخذ کئے تھے کہ شاہجہاں نے قیدِ تنہائی سے تنگ آکر اورنگ زیب سے اِس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ وہ اپنے بچوں کو کچھ دیر کے لئے اُس کے پاس بھیج دیا کرے تاکہ وہ اُنہیں پڑھائے اور اُس کا دل لگا رہے۔اورنگزیب نے باپ کی درخواست یہ کہہ

کررَ دکردی کہ ''ابھی تک آپ کے دماغ سے حکومت کی بُونہیں گئی۔''

لیکچروں کے اس مجموعے کے دیباچے میں لکھا تھا کہ سوامی جی نے اُنیس سال کی عمر میں ایم۔اے (ریاضیات) میں اوّل پوزیشن حاصل کی تھی۔ کچھ عرصہ کسی کالج میں پڑھاتے رہے تھے۔ شادی بچپن میں ہوگئی تھی۔ ایک لڑکا بھی تھا۔ اچانک اُنہوں نے دنیاترک کردی اور درویشی اختیار کرلی۔ جنگلوں میں مجاہدہ کیا اور اتنی روحانی قوّت حاصل کرلی کہ جہاں سمادھی لگا کر بیٹھتے، وہاں اُن کے گرد جنگل کے درندے اور چرندے بھی ہجوم کر لیتے۔ اِن میں ہرن بھی ہوتے اور شیر بھی۔ غالبًا یہ بھی بیان ہوا تھا کہ برف پڑتی تو اُس میں دب جاتے۔ لوگ برف کے ڈھیر سے نکالتے تو ویسے کے ویسے ہوتے۔ اُنتیس سال کی عمر میں وفات پا گئے۔ اُن کی راکھ (پھولوں) کو ایک لکڑی کی صندوقچی میں بند کر کے گنگا میں بہایا گیا تو صندوقچی اپنے آپ کُھل گئی اور راکھ گنگا میں بہہ گئی۔

اتفاق سے ایک محفل میں ڈاکٹر وزیر آغا صاحب نے بیان کیا کہ سوامی جی نے خودکشی کی تھی جس پر میں بہت حیران ہوا۔ سلسلۂ کلام یہاں تک، آرتھر کوئسلر اور اُس کی بیوی کی مشترکہ خودکشی سے شروع ہو کر پہنچا تھا۔ آرتھر کوئسلر نے محسوس کیا تھا کہ اُس کی ذات کی تکمیل ہوگئی ہے اور مزید تحقیق کی صلاحیت باقی نہیں رہی۔ اِسی لئے بانجھ زندگی سے کیا فائدہ؟ ارنسٹ ہیمنگوے نے بھی اسی تخلیقی بانجھ پن سے فرار کی کوشش میں خودکشی کی تھی۔ یہ بات کچھ سمجھ میں آتی تھی لیکن سوامی جی کی خودکشی کی کوئی وجہ میرے ذہن میں نہیں آرہی۔ چنانچہ ایک عرصے سے ''سوامی جی'' میرے ذہن پر چھائے ہوئے ہیں۔ نماز پڑھتے ہوئے بھی اُن کا خیال آتا ہے تو میں عالمِ حیرت میں گم ہو جاتا ہوں۔ یہ خودکشی کیوں؟

چنانچہ میں ایک خط ڈاکٹر وزیر آغا کے نام لکھ رہا ہوں۔ یہی بات میں اُن سے زبانی بھی پوچھ سکتا تھا لیکن خط میں جو کیف ہے، وہ ممکن ہے کہ زبانی بات چیت سے حاصل نہ ہوتا۔

محترمی! تسلیم:۔

ایک محفل میں آپ نے فرمایا تھا کہ سوامی رام تیرتھ نے خودکشی کی تھی۔ پتہ نہیں، کیا وجہ ہے کہ اس دن سے اَب تک یہ سوچ رہا ہوں کہ سوامی جی نے خودکشی کیوں کی؟ آپ سے کئی بار پوچھنا چاہا لیکن دورانِ ملاقات اِس کا موقع ہی نہ ملا۔ میں نے اپنے محترم اُستاد پنڈت چمن لال جی کے ساتھ ایک رابطے میں سوامی جی کا ذکر کیا۔ افسوس کہ سوامی جی کے متعلق میرا مطالعہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ اُن کے انگریزی لیکچروں کا ایک مجموعہ مجھے اپنے والدِ محترم سے ورثے میں ملا تھا لیکن وہ گم ہو گیا ہے۔ کیا آپ کے پاس کوئی ایسی کتاب ہے، جس میں سوامی جی کی سوانح عمری بھی ہو اور لیکچر بھی؟ اگر ہو تو ضرور مرحمت فرمائیں۔ میں محسوس کر رہا ہوں کہ سوامی جی کی روح مجھ سے اس مطالعے کا تقاضا کر رہی ہے۔ سچ جانیے کئی بار نماز پڑھتے ہوئے بھی وہ یاد آئے۔ یوں تو میری نماز پریشان خیالیوں کا ایک پلندہ ہے کہ جن کا کوئی سر ہوتا ہے، نہ پیر تاہم سوامی جی کا یاد آنا ایک اچنبھا ضرور ہے۔

سوامی جی کی خودکشی کے بارے میں مندرجہ ذیل توجیہات میرے ذہن نے مجھے مطمئن کرنے کے لئے پیش کیں لیکن میں مطمئن نہیں ہو سکا:۔

1- سوامی جی روحانی ممکنات کی اُس حد تک پہنچ چکے تھے کہ جس سے آگے جانا ممکن نہیں تھا۔ اس لئے

اُنھوں نے باقی ماندہ زندگی کو بے مصرف جان کر اُس کا سلسلہ قطع کر دیا۔

2- سوامی جی ریاضت اور تپسیا کی انتہا تک پہنچنے کے بعد بھی اُن بنیادی سوالات کا جواب نہ پا سکے جو ہر سوچنے والے انسان کو پریشان کرتے ہیں مثلاً اللہ کی حقیقت کیا ہے؟ دُنیا کیسے وجود میں آئی؟ اس کی تخلیق کا مقصد کیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ اس مایوسی کے عالم میں اُنہوں نے اپنے ہاتھوں اپنی جان لے لی۔

3- یہ بھی ممکن ہے کہ ''فلسفے'' کے وسیلے سے نہیں بلکہ 'وجدان' کے ذریعے وہ اِس نتیجے پر پہنچ گئے ہوں کہ زندگی ایک بے معنی چیز ہے۔ زندگی کی ''لایعنیت'' اگر اچانک ادراک کی شکل اختیار کر لے تو اِس میں 'خودکشی' ایک فطری نتیجہ ہے۔

4- یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ کسی مہلک مرض یعنی سرطان وغیرہ میں مبتلا ہوں اور اِس کا علم صرف اُنہیں کی ذات تک محدود ہو اور وہ اِس کے انتہائی مرحلے تک پہنچ کر مرنا نہ چاہتے ہوں۔

علامہ اقبال کی نظم ''سوامی رام تیرتھ'' کا ایک شعر اوپر لکھی ہوئی توجیہات میں سے پہلی کی تائید کرتا ہے۔

نفیِ ہستی کرشمہ ہے دلِ آگاہ کا لَا کے دریا میں نہاں موتی ہے اِلا اللہ کا

(سوامی رام تیرتھ)

یہ خط لکھ کر مجھے کچھ سکون سا ملا ہے۔ نہ جانے کیوں؟ فقط...... مخلص، غلام الثقلین نقوی

افسوس یہ ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا نے جواب میں جو خط مجھے بھیجا وہ اب دستیاب نہیں

....

ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی ساٹھویں سالگرہ

5 جنوری 1989ء

آج ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی ساٹھویں سالگرہ ہے جو سرکاری طور پر منائی جا رہی ہے۔ اگر مرحوم کی بیٹی محترمہ بے نظیر بھٹو برسرِ اقتدار نہ آتیں تو ذوالفقار علی بھٹو بھی تقریباً دس سال قبر میں رہنے کے بعد آناً فاناً زندہ نہ ہو جاتے۔ یُوں پاکستان کے عوام کی اکثریت کے دلوں میں وہ زندہ تھے۔ واقعی؟

یُوں مجھے زمانے کی منافقت پر حیرت ہوتی ہے۔ جنرل ضیاء الحق مرحوم کے دور میں کسی اخبار نے ذوالفقار علی بھٹو کا نام تک شائع نہ کیا، اُن کے چند نہایت مخلص پیروکار شعرا کے علاوہ کسی نے اُن پر کوئی نظم نہ لکھی، کل بدھ کو 'جنگ'' کا جو ادبی ایڈیشن شائع ہوا ہے، اُس میں اسلامی ادیب 'حسن رضوی' نے یکا یک اپنا چولا بدل لیا ہے اور ''کیمونسٹ'' ہو گیا ہے۔ اُس نے اپنے کسی شعر کا ایک مصرع یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ وہ ''کیمونسٹ'' ہو گیا ہے، سرِ فہرست لکھ کر اپنا نام محبّانِ بھٹو کی فہرست میں لکھوا لیا ہے۔ مصرع یہ ہے :۔

ع لوگ کہتے تھے حسؔن اُس کو سزا ہو جائے گی

اَب آپ اِس شخص کی منافقت سے خود آ گاہ ہو سکتے ہیں کہ اُس نے اس شعر کا پہلا مصرع کیوں نہیں لکھا۔ اِس لئے کہ وہ اتنی جرأت کہاں سے لاتا۔ اشعار کا وہ مجموعہ جس کا عنوان ''خوشبو کی شہادت'' ہے۔ میں نے بھی پڑھا تھا۔ یہ کتاب اصغر علی چودھری نے شائع کی تھی۔

میرے نزدیک تو کوئی پاکستانی شاعر اتنا جرأت مند نہیں تھا کہ بھٹو، کو واضح طور پر اپنا لیڈر مانتا۔ صرف تین شاعر ایسے تھے جنہیں میں صحیح معنوں میں بھٹو سے منسوب جانتا ہوں۔

1- شہرت بخاری 2- فخر زمان 3- اسلم گورداسپوری

یُوں تو میں ''کلامِ اقبال'' سے بھی ایسے اشعار تلاش کر سکتا ہوں جن کے متعلق میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی وفات سے متاثر ہو کر لکھے گئے ہیں مثلاً:

نفی ہستی کرشمہ ہے دلِ آگاہ کا — لا کے دریا میں نہاں موتی ہے اِلا اللہ کا

حسن رضوی نے اِس کتاب سے جن شعراء کے اشعار منتخب کئے ہیں، اُن میں ''احمد ندیم قاسمی'' کا نام شامل نہیں۔ مجھے یاد آیا کہ اِن کی کوئی غزل ''خوشبو کی شہادت'' میں شامل نہیں تھی۔

◆◆◆

سوھن راھی کی شاعری کی کتاب

تم کیسر ھم کیاری

شائع ہوگئی ہے

قیمت-/200 روپے

ملنے کا پتہ : مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37۔ اُردو بازار، کراچی۔ پاکستان

(فون:0092-300-9266116)

طنز و مزاح

میں نہیں مانتا، میں نہیں جانتا......

ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی

ہماری یہ سوچی سمجھی رائے ہے، جس سے اختلاف ممکن نہیں، کہ کوئی بھی عورت ''بے رحم'' نہیں ہوتی اور یہ کہ ہر عورت اپنے میاں کی خیر خواہ ہوتی ہے...... اسے صبر کے مواقع فراہم کر کے اس کی عاقبت سنوارتی ہے۔ ہم، اللہ کے بعض ایسے اطاعت گزار اور وفا شعار بندوں کو جانتے ہیں جنھوں نے والدین کی خدمت کا حصہ بھی بیوی کی جھولی میں ڈال دیا۔ ان کا موقف ہے کہ خدمت، خدمت ہوتی ہے چاہے بیوی کی ہو یا والدین کی۔

عورتیں بھی مردوں کو اُن کی خدمت کا پورا صلہ دیتی ہیں لیکن مرد، جو فطرۃً سطحی سوچ رکھتے ہیں، اس کا کماحقہ، ادراک نہیں کر پاتے۔ عورتیں کس کس طرح سے مردوں کا بھلا چاہتی ہیں اس کا ایک عملی نمونہ انڈونیشی خواتین نے پوری دنیا کو دکھا دیا ہے۔ اب انھوں نے شوہروں کے کردار کو صاف ستھرا اور شفاف رکھنے کی ذمہ داری سنبھال لی ہے۔ انھوں نے اُس بنیادی سبب کا سراغ لگا لیا ہے جو مردوں کو راہِ راست سے بھٹکانے اور ناپسندیدہ دھندوں میں پھنسانے کا ذمہ دار ہے اور وہ ہے پیسہ۔ اگر مردوں کو پیسے سے محروم کر دیا جائے تو اُن کے کردار کی اصلاح ہو جائے گی اور وہ صراطِ مستقیم پر گامزن ہو جائیں گے یعنی گھر سے کام کی جگہ اور وہاں سے سیدھے واپس گھر آئیں گے۔ نہ مال، نہ غیر عورتوں سے تعلقات کا وبال! شفاف کردار پر ہمیں ڈاکٹر فاطمہ حسن کا ایک شعر یاد آیا جو یہاں برمحل لگتا ہے

ہماری نسل سنورتی ہے دیکھ کر ہم کو
سو اپنے آپ کو شفاف تر بھی رکھنا ہے

انڈونیشی عورتوں نے اچھے خاصے کماؤ پُوت مردوں کو کنگلا رکھنے کا ایک ''فول پروف'' طریقہ ایجاد کیا ہے۔ ملک کے شمال میں واقع جزیرہ سُلاویسی (Sulawesi) کی خواتین اپنی مقامی حکومت کو اس بات پہ قائل کرنے میں کامیاب ہو گئی ہیں کہ مرد، پیسے ہاتھ میں آنے کے بعد پیسے اور اپنے کردار دونوں پر کنٹرول کھو دیتے ہیں۔ وہ اپنی آمدنی غیر عورتوں پر فراخ دل سے لٹاتے ہیں اور اپنی بیویوں کو دھتا پلاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ گھر تو نہیں چلتا، اُس کی جگہ پورے مہینے ایک طرف سے زبان چلتی ہے تو دوسری طرف سے ہاتھ۔ انتظامیہ نے خانگی تعلقات کو خوشگوار بنانے کی غرض سے صوبے کی عورتوں کا یہ مطالبہ تسلیم کر لیا کہ مہینے کے اختتام پر ملازمین کو جو تنخواہ ملتی ہے وہ براہ راست ان کی بیگمات کے بنک اکاؤنٹ میں چلی جائے۔ نہ ہو بانس، نہ بجے بانسری۔ اب سرتاج، کوڑی کوڑی کا محتاج ہوگا اور گھر پر گھر والی کا مکمل راج ہوگا۔ یہ مردوں کی بے بسی اور عورتوں کی بے حسی کا ایک جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ جزیرے کے 3200 ملازمین نے اپنی رضا مندی سے فوراً یہ کڑوا گھونٹ نوشِ جان کر لیا ہے جبکہ بقیہ دس فی صد، جن میں تھوڑی سی بھی خودی اور بہت زیادہ خودداری موجود ہے، تذبذب

کے عالم میں ہیں کہ پیسے سے محرومی، آزادی سے محرومی کے مترادف ہوگی۔ یہ کوتاہ اندیش یہ نہیں سوچتے کہ اس سے ان کے کردار پر کتنے مثبت اثرات مرتب ہوں گے۔ان کی بیویاں ان کا کتنا خیال کرتی ہیں کہ پیسے سے دور رکھ کر انھیں اپنے سے قریب کر رہی ہیں۔اب پیسہ بھی زبان حال سے کہے گا :

ع میں کمائی ہوں کسی اور کی، مجھے کھینچتا کوئی اور ہے

عورتوں نے مردوں کے کردار پر ہمیشہ شک کیا اور اسی شک نے مردوں کو ''نیک مسکین'' بنا دیا ہے۔ایک خاتون ہر روز شام کو اپنے شوہر کے کپڑوں کا جائزہ لیتی تھیں۔اگر کہیں بال کا چھوٹا سا ٹکڑا بھی نظر آ تا تو وہ ہنگامہ بپا کر دیتیں۔ایک دن جب انھیں کچھ نہیں ملا تو رونے بیٹھ گئیں۔شوہر نے دلجوئی کے انداز میں پوچھا ''اب کیا ہوا'' ع ہماری زندگی ''غیض وغضب'' یوں بھی ہے اور ووں بھی؟'' موصوفہ سسکیاں بھرتے ہوئے ممنائیں ''ہائے اللہ، اب گنجی عورتیں بھی''!اس وقت بھی اگر چہ مردوں کو تھوڑے بہت مالی اختیارات حاصل ہیں لیکن انھیں گھر کے معاملات میں دخل اندازی کی اجازت نہیں۔ ہمارے دوست انور شعور نے اس صورتِ حال پر احتجاج کرتے ہوئے کہا تھا ؎

یاد رکھ، گھر قفس نہیں ہوتا میں یہاں اپنی رائے رکھوں گا

جب مرد اپنی پوری کمائی سے بیگم کے حق میں محروم ہو جائیں گے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ اپنی بچی کھچی (نام نہاد) حاکمیت سے بھی رضا کارانہ طور پر دستبرداری قبول کر لیں گے۔''خانگی حالاتِ حاضرہ'' پر اب بیگمات پورے طور پر حاوی ہوں گی۔عورتوں کے مختلف النوع حملوں کے مقابلے کے لیے مردوں کے پاس صرف ایک ہی ہتھیار رہتا ہے یعنی پیسہ۔اب ان غریبوں کو ''غیر مسلح'' کر کے عورتوں نے گھر میں اقتدارِ اعلیٰ کا بول بالا کر لیا ہے۔دوسری طرف وہ گردن جو پیسے کے زور پر تنی ہوتی تھی اب ہلکی جیب کے ساتھ ڈھلکی رہے گی۔ پہلی تاریخ ہی کو یہ جیبیں بکری کے خالی تھنوں کا نقشہ پیش کرتے ہوئے یہ پیغام دیں گی کہ ''دیکھو مجھے جو دیدہ عبرت نگاہ ہو...... چونکہ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے چنانچہ پاکستانی عورتوں نے فوراً زنانہ تسلّط کا انڈونیشی نسخہ قبول کر لیا۔ پنجاب اسمبلی کی چند خواتین ارکان کی جانب سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ ہمارے یہاں کے مردوں کی تنخواہیں بھی ان کی بیویوں کے کھاتوں میں ڈالنے کا قانون بنایا جائے، یعنی محنت کوئی کرے، معاوضہ کوئی اور حاصل کرے۔کیا یہ کھلا تضاد نہیں ہے؟ تاہم یہ اپنے اپنے ظرف اور اپنی اپنی ہمت کی بات ہے۔انڈونیشی مرد، عورتوں کی سینہ زوری قبول کر کے سینہ کوبی کر رہے ہیں۔ ہمارے یہاں فی الوقت خانگی نظام اس طرح چل رہا ہے کہ معاملات پر خاتونِ خانہ کا کنٹرول ہوتا ہے اور مالیات پر ڈھیلا ڈھالا کنٹرول مردخانہ خراب کا۔ بہتر بھی یہی ہے کہ دونوں ''ادارے'' اپنی اپنی حدود میں کام کرتے رہیں۔ذرا بھی توازن بگڑا تو کوئی ''تیسری قوت'' فائدہ اٹھالے گی۔ یہ وہی قوت ہے جس کا راستہ روکنے کے لیے انڈونیشی عورتوں نے اپنے مردوں کی جیبیں خالی کرائی ہیں۔ بہرحال، یہ اعصاب کی آزمائش ہے۔ہم وہاں ہوتے تو ہر قیمت پر Writ (عمل داری) کا تحفظ کرتے، اپنی انا پر قائم رہتے اور پورے جزیرے میں حبیب جالب کے اس مشہورِ زمانہ شعر کی وال چاکنگ کرا دیتے :

ایسے دستور کو، صبحِ بے نور کو میں نہیں مانتا، میں نہیں جانتا

◆◆◆

ادارہ ''تخلیق''، سہ ماہی ''بیلاگ'' کے مدیرِ اعلیٰ محترم عزیز جبران انصاری کا دلی طور پر شکر گذار ہے کہ انھوں نے اظہر جاوید کی پہلی برسی کے موقع پر ''بیلاگ'' میں اظہر جاوید پر چند خصوصی تحریریں شائع کیں۔

جائزے

ایک درویش صفت انسان۔کرشن لعل نارنگ ''ساقی''

گلشن کھنہ (برطانیہ)

کرشن لعل نارنگ ساقی کے نام سے میری شناسائی کافی عرصے سے تھی۔ان کے ادبی لطائف اکثر اردو کے معیاری رسائل میں شائع ہوتے رہتے تھے۔پھر اردو کے ممتاز اور مستند شاعر کنور مہندر سنگھ بیدی سحؔر پر مرتب کردہ انکی کتابیں ''ہمارے کنور صاحب'' اور انکی سوانح عمری ''یادوں کا جشن'' جب میرے مطالعہ میں آئیں تو کنور صاحب کے اس سچے جانشین اور جہانِ لطیفہ کے شہرت یافتہ ادیب سے ملنے کی خواہش میرے دل میں چٹکیاں لینے لگی۔کچھ عرصہ تک میری ان سے خط کتابت تو چلتی رہی مگر ملاقات کا شرف حاصل نہ ہوسکا۔پھر ایک دن یہ مراد بھی بر آئی۔مارچ 2009 میں ساہتیہ اکادمی میں اردو شاعری پر ہونے والے ایک سیمینار میں شرکت کرنے دہلی گیا تو اس تقریب میں نارنگ ساقی صاحب سے ذاتی ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔وہ بڑے خلوص۔محبت اور پیار سے ملے اور مجھے بھی ان سے مل کر بہت مسرت ہوئی۔میں انکی شخصیت سے بہت متاثر ہوا تھا۔گول مٹول متبسم چہرہ۔گورا چٹا رنگ۔آنکھوں میں ذہانت۔لہجے میں شرافت۔انداز میں نجابت۔عہدِ پیری کے باوجود چہرے سے جوانی چھلک رہی تھی۔باہر سے بھی صاف ستھرے۔نیک طینت۔سلیقہ شعار اور خوش طبع۔یہ تھے کرشن کی بنسی کی طرح میٹھی آواز میں گفتگو کرنے والے کرشن لعل نارنگ ساقی۔

اس پہلی ملاقات کے بعد ہی ہم ایک دوسرے کے اچھے دوست بن گئے تھے۔اسی شام ساہتیہ اکادمی کے جلسے کے بعد نارنگ ساقی نے مجھے اپنے دفتر واقع کناٹ پیلس میں مدعو کیا۔ساقی صاحب کی دعوت پر ہم تین دوست ڈاکٹر سیفی سرونجی۔ف۔س۔اعجاز اور میں انکے دفتر کناٹ پلیس۔نئی دہلی۔پہنچ گئے۔انہوں نے ہم تینوں کے اعزاز میں ایک محفلِ خاص سجائی تھی۔اس محفل میں ساقی صاحب نے ساقی گری کے فرائض انجام دیئے تھے۔اس شام کو شغلِ میناو جام کرنے کے ساتھ ساتھ اردو شعر و ادب پر بھی دلچسپ گفتگو ہوئی تھی۔ساقی صاحب نے ہماری خوب خاطر تواضع کی تھی۔نارنگ ساقی بڑے مہمان نواز شخص ہیں۔اردو شعرا اور ادبا کے لیے محفلیں سجانا اور اپنے دولت کدے پر قیام وطعام کا انتظام کرنا انکی زندگی کا مقصد ہے۔نارنگ ساقی کی شخصیت میں جس چیز نے مجھے خاص طور پر متاثر کیا تھا وہ ان کا فرشتوں کا سا معصومانہ انداز تھا جو اس مکروہ دنیا میں رہتے ہوئے بھی ایک قسم کا گہرا داخلی سکون اور توازن فراہم کرتا ہے۔یہ پہلی ملاقات تھی جو اسی رات ختم ہوگئی تھی لیکن میرے دل اور میرے ذہن پر اس ملاقات کا جو نقش ثبت ہوا اسکے بعد ہونے والی ملاقاتیں اسے ماند نہ کرسکیں۔

کرشن لعل نارنگ ساقی، جو روح میں اترنے والے مسیحا ہیں، کی پیدائش 24 اگست۔1936ء کو پنجاب میں ضلع فیروز پور کے قصبہ سوڈھی نگر کے ایک متمول گھرانے میں ہوئی۔انکے والد کا نام شری سندر داس تھا۔وہ ایک کاروباری آدمی تھے مگر شعر و ادب کے دل دادہ بھی تھے۔انکی والدہ ماجدہ شریمتی کرم دیوی نہایت سادہ طبیعت کی خاتون تھیں۔ان میں انسانیت۔دردمندی اور محبت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔وہ کسی شخص کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتی تھیں۔جب بھی گھر میں مٹھائی یا تازہ پھل وغیرہ آتے وہ محلے کے سب پڑوسیوں میں تقسیم

کرآتی تھی۔نارنگ ساقی بھی یاروں کے یاراورمحبت کرنے والے شخص ہیں۔یہ تمام خصوصیات انہیں اپنی والدہ سے ورثہ میں ملی ہیں۔کنور مہندرسنگھ بیدی سحؔر رقم طراز ہیں۔''نارنگ ساقی نہایت ہی مہمان نواز ہیں انکا حلقہ احباب کافی وسیع ہے۔کوئی فنکشن ہو۔مشاعرہ ہو یا پھر محفلِ موسیقی یا کوئی سیمینار یا مذاکرہ ہو۔ساقی صاحب دوستوں کودیکھ کرہی پوری طرح مسلح ہوکرطلوع ہوتے ہیں اور ہر''اہلِ ذوق'' کی تواضع کرتے ہیں''اردو کے معروف مزاح نگار دلیپ سنگھ نے لکھا تھا۔''ساقی نارنگ نے اپنے گھر کو۔اپنے دفتر کو۔اپنی کار اور ٹیلیفون کو اردو والوں کی خدمت میں لگا رکھا ہے۔پاکستان سے آنے والے اردو ادیبوں کے پاس ٹھہرنے کے لیے اگر کوئی اور جگہ نہیں ہے تو ساقی کا گھر حاضر ہوتا ہے جہاں انہیں ایک بہترین ہوٹل کی تمام سہولتیں دستیاب ہوتی ہیں۔''

دلیپ سنگھ آگے چل کر لکھتے ہیں۔''ساقی مشاعروں میں جاتے ہیں تو شاعروں کی خدمت میں لگے رہتے ہیں۔شعر کم ہی سنتے ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ یہ بات مشاعروں تک ہی محدود نہیں بلکہ اس کا سلسلہ ان کے گھر تک پہنچا ہے۔ساقی آئے دن اپنے گھر میں شاعروں کی دعوتیں کرتے رہتے ہیں۔''

ان کے علاوہ پاک و ہند کے بہت مشاہیرِ قلم جیسے مشفق خواجہ، پروفیسر قمر رئیس، شمس الرحمٰن فاروقی، پروفیسر گوپی چند نارنگ، یوسف ناظم نے نارنگ ساقی کی سخاوت اور اردو والوں سے ان کی محبت اور دریا دلی کا تذکرہ بڑے عمدہ انداز میں کیا ہے۔معروف مزاح نگار یوسف ناظم، رقمطراز ہیں۔'نارنگ ساقی کی شیرینی کی دکان میں متھرا کے پیڑے یا سندھ کے لڈو اور لکھنو کا پیٹھا نہیں ہے۔یہ تو آنی جانی اشیائے خورونوش ہیں۔ان کی دوکان میں تو ادیبوں کی بذلہ سنجی۔حاضر جوابی۔خوش کلامی اور برجستہ گوئی کے شاہی ٹکڑے ملتے ہیں۔''

اپنی پیدائش کے وقت وہ صرف کرشن لعل نارنگ تھے۔مگر انکے نام کے ساتھ یہ جاندار تخلص''ساقی'' کیسے جڑ گیا؟اس سلسلے میں انہوں نے شاعر کے ایڈیٹر افتخار امام صدیقی کو بتایا کہ میں فیروز پور میں تھا تو وہاں سے اردو کے تین چار ہفتہ وار اخبار شائع ہوتے تھے۔ہائی اسکول کے زمانے سے ہی میرا ان سب اخباروں کے دفتر میں آنا جانا تھا۔صحافیوں کی صحبت میں بیٹھنے کی وجہ سے میرے اندر شعر وادب کا ذوق پیدا ہوا۔یہ الگ بات ہے کہ میں نے شعر کبھی نہ کہے بلکہ سوچا کیوں نہ اپنا ایک رسالہ جاری کروں۔کچھ عرصہ بعد رسالے کا ڈکلیریشن حاصل کرکے ماہنامہ''ساقی'' نکالنا شروع کیا۔ابتدا میں یہ ایک فلمی اور ادبی رسالہ تھا۔ماہنامہ جیسے تیسے ڈیڑھ برس تک شائع ہوتا رہا۔پھر یہ رسالہ تو بند ہوگیا لیکن رسالے کا نام میرے نام میں تبدیل ہوگیا۔دوست احباب مجھے''ساقی'' کے نام سے پکارنے لگے تھے۔اس طرح سے تخلص ساقی میرے نام کا حصہ بن گیا۔اور میں کرشن لعل نارنگ سے کے۔ایل۔نارنگ ساقی بن گیا۔''

کے۔ایل۔نارنگ ساقی دلکش اور رنگا رنگ طبعیت کے مالک ہیں اور اردو تہذیب کے دلدادہ ہیں۔اردو ادب سے رشتہ استوار ہونے کے بعد انہوں نے سب سے پہلے ایک کتاب کنور مہندر سنگھ بیدی سحؔر کے بارے میں''ہمارے کنور صاحب'' کے عنوان سے مرتب کی جسے کنور مہندر سنگھ بیدی کمیٹی نے شائع کیا تھا۔انہی دنوں بیدی صاحب کی خودنوشت سوانح عمری''یادوں کا جشن'' مرتّب کی۔پھر''ادیبوں کے لطیفے'' اور''خوش کلامیاں قلم کاروں کی'' لکھ کر ساقی صاحب نے انوکھے محسوسات سے رشتہ جوڑنے کا ایک نہایت عمدہ کام کیا ہے۔'' خوش کلامیاں قلم کاروں کی'' کا ذکر کرتے ہوئے۔ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی رقم طراز ہیں۔''نارنگ ساقی کی مرتّب کردہ خوش کلامیاں سماجی رشتوں کو اونچ نیچ سے پیدا ہونے والے احساسات کی نیرنگیوں سے اٹھتی نکلتی اور جھلکتی ہیں یہ اونچ نیچ ذات پات کی نہیں بلکہ دوستوں۔عزیزوں اور محبوبی پیکروں کے بطون سے نکلی ہوئی ہیں۔ایسی خوش کلامیاں جذباتی اور محسوساتی سطح کے ساتھ تجزیاتی نگاہ بخشتی ہیں جو روح کے تاروں کو جھنجھنا دیتی ہیں۔۔ایسی خوش بیانیوں اور خوش گوئیوں میں حاضر جوابی ہے، تخیل کی تیز رفتاری ہے اور بزمِ بے تکلف کی پھلجھڑیاں

اور مہتابیاں ہیں۔''

نارنگ ساقی نے اپنی کتابوں میں جو کچھ پیش کیا ہے وہ ان کی نیک سیرت اور ذہانت کی ایک دوسری جہت کو اجاگر کرتا ہے یعنی ان کی خوش طبعی۔ان کے احساس کی لطافت اور شوخی کردار و گفتار ان کی تہذیب یافتہ شخصیت کا جوہر ہے جس کے لیے ہمیں ان کا ممنون ہونا چاہیے کیونکہ انہوں نے ہمیں ہماری بڑی مقتدر اور محترم شخصیتوں کے نہایت وقیع اور نادر و کمیاب جوہر سے متعارف کرایا ہے اور انوکھے و نرالے محسوسات سے رشتہ جوڑنے کا ایک عظیم کام کیا ہے۔اس کام کے لیے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں اور کسی بڑے ایوارڈ کے حقدار بھی۔

◆◆◆

''تخلیق'' لاهور، راولپنڈی اور کراچی میں مندرجه ذیل مقامات پر دستیاب هے

لاہور

ایسٹ بُک سنٹر

B-6، دی مال، لاہور (فون: 042-38543006)

شرافت نیوز ایجنسی

ٹورسٹ سٹریٹ، مدینہ مسجد، چوک پرانی انارکلی، لاہور (فون: 0300-4766734)

راولپنڈی

ورائٹی بُکس سٹال

ورائٹی بُکس، بنک روڈ، صدر۔راولپنڈی (فون: 051-5583397)

سائل بُکس ڈپو

B-200، لالہ رُخ، واہ کینٹ۔راولپنڈی (فون: 051-4532598)

کراچی

اکادمی بازیافت

M-17، کتاب مارکیٹ، سٹریٹ نمبر 3، اردو بازار، کراچی۔74200 (فون: 021-32751324)

کچھ یادیں، کچھ باتیں!

عذرا اصغر

شوکتؔ ہمارے ساتھ عجب حادثہ ہوا
ہم رہ گئے، ہمارا زمانہ چلا گیا

میکلیگن روڈ پر دفتر ''تخلیق'' کے سامنے، سڑک کے اُس پار پیپل کا وہ درخت اب کب کا کٹ چکا ہے۔ لیکن پیپل کا یہ پیڑ میرے افسانوں میں آج بھی زندہ و پائندہ ہے۔ وقت بہت بے مروّت ساتھی ہے۔ نہایت خاموشی سے ہمارے پہلو سے کھسک جاتا ہے اور ہم اسے ڈھونڈتے ہی رہ جاتے ہیں۔ دفتر ''تخلیق'' اور میکلیگن روڈ کے وہ دن جانے کب کے ہوا ہوئے۔ ہمارے پاس بس یادوں کی راکھ رہ گئی ہے۔

دفتر ''تخلیق'' میں آنے والے دوست احباب بے شمار تھے ان سب کا تعلق کسی نہ کسی طور شعر و ادب سے تھا۔ شعر کہنے والے، تخلیق کار اور کچھ ان کو پڑھنے والے، علم و ادب کے شیدا۔

پھر یوں ہوا کہ کچھ لوگ وقت کے بہتے سمندر میں بہتے دور نکل گئے۔ کچھ کو معاشی ضرورت کا اژدھا نگل گیا اور کچھ دنیا کے سفر میں اپنی منزل پر راہوارِ وقت سے اتر گئے۔ کہتے ہیں موت کا ایک دن معین ہے۔ کیا یہ بھی معین ہے کہ وہ کیسے آئے گی؟ گھر کے بستر پر، ہسپتال کے کسی وارڈ میں، پانی میں ڈوب کر، آگ میں جل کر، زہر سے یا گولی سے؟

''تخلیق'' ادبی مجلّہ تو ہے ہی جو گزشتہ قریباً آدھی صدی سے جاری ہے اور شائقین ادب کو نوازتا آ رہا ہے مگر دفترِ تخلیق ایک ادارہ بھی رہا ہے۔ اب بھی ہے۔ لیکن اب شاید وہ گہما گہمی وہ چہل پہل وہ شگفتگی نہیں رہی یا میں اس سے لاعلم ہوں کہ وقت کے سمندر کی لہروں نے مجھے بھی دور...... بہت دور لا پھینکا ہے۔ اب دفتر تخلیق بھگوان کی گلی میں ہے۔ تب میکلیگن روڈ کی کشادہ سڑک پر تھا جہاں ڈاکٹر وزیر آغا، قتیل شفائی، جوہر نظامی، ڈاکٹر انور سدید، سبطین شاہجہانی، ذوالفقار تابش، زمان کنجاہی، میرزا ادیب، خواجہ محمد زکریا اور حسین شاد جیسے نابغۂ روزگار ادیبوں، دانشوروں کے علاوہ نوعمر، نوآموز بہت سے لکھاری بھی پابندی سے آتے تھے۔ ان میں سے جو نام میرے ذہن کی تختی پر کندہ و روشن ہیں وہ سلمان بٹ، عائشہ اسلم، امینہ عنبرین اور سعیدہ تصدق ہاشمی ہیں۔ سلمان بٹ اُبھرتا ہوا جواں فکر صحافی اور خاکہ نگار تھا۔ عین عالمِ شباب میں موت اسے ایک چوراہے پر کھڑی ملی اور اپنے ساتھ لے کر ٹلی۔ عائشہ اسلم وقت اور معاشرے کے جبر کا شکار ہو کر شاعری وائری سب بھول گئی۔ امینہ عنبرین نے عالمِ جوانی میں بیوگی کا دُکھ اٹھایا اور اس کا افسانہ اور شاعری سب روٹی روزگار کے صحافت خانے میں دب کر رہ گئی۔ سعیدہ تصدق ہاشمی ایک کھلی کلی تھی شاعری کی۔ ہر دم ہنسنا اور خوش رہنا اس کی عادت تھی۔ وہ ذوالفقار بھٹو کی پرستار تھی۔ میری

ڈائری میں اس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی نظم آج بھی تروتازہ ہے ۔

اٹھ وے سائیاں سُتیا سن باتیں ذرا ہماریاں
نچ گئی ہیں کتنی چادریں اور روئیں چار دیواریاں

ڈائری میں درج نظم کے حرفوں کی سیاہی ماند نہیں پڑی جبکہ بھٹو کو وقت کے آمر کا حسد آمیز انتقام ہڑپ کر گیا۔

یاد نہیں سعیدہ سے پہلی ملاقات کس سن، دن یا مہینے میں ہوئی لیکن ہوئی دفتر تخلیق میں ہی تھی کہ میں اس وقت تخلیق سے منسلک تھی۔ کمسنی میں بھی سعیدہ ایک پختہ گو شاعرہ تھی۔ وہ اس وقت شاید ایف۔اے کی طالبہ تھی اور مختلف اخبارات میں لکھ رہی تھی۔ الڑھ سی، کھلنڈری سعیدہ ہاشمی معروف شاعرہ ربیعہ فخری کے شاعر بھائی عظیم الفرقان سے منسوب تھی بلکہ شاید نکاح بھی ہو چکا تھا مگر سعیدہ کو یہ رشتہ غالبًا کچھ پسند نہیں تھا۔ وہ آزاد منش لڑکی تھی۔ گھومتے پھرتے رہنا اس کا مشغلہ تھا۔ دفتر ''تخلیق'' میں اس نے اصغر مہدی سے انگریزی پڑھنا شروع کی۔ فلاں شخص بڑا اسکولرلی (Scholarly) ہے۔ اس کا گویا تکیہ کلام تھا۔ بعض دفعہ ہم سب دفتر سے اٹھ کر اکٹھے ہی کسی ادبی تقریب میں چل دیتے۔ کبھی اعزاز احمد کے پاس نیشنل سینٹر اور کبھی حلقۂ اربابِ ذوق کی نشست میں۔ دوپہر کو اکثر انارکلی سے ''ٹکا ٹک'' منگالیا جاتا اور سب مل کر کھانا کھاتے۔ کتنا مزا تھا اس کھانے میں جو خود پکانا نہیں پڑتا تھا۔ امینہ یونیورسٹی سے آ جاتی۔ زمان کنجاہی بنک سے آ جاتے۔ میں ایک دفعہ ظہر کی نماز پڑھ رہی تھی کہ قتیل صاحب آ گئے ۔ مجھے نماز پڑھتے دیکھ کر ٹھٹھکے پھر بلند آواز سے بولے۔

اظہر جاوید! یہ دفتر تخلیق میں کیا دیکھ رہا ہوں میں۔''

اظہر جاوید نے کہا:

''قتیل صاحب! ایسا وقت کبھی بھی آ سکتا ہے۔''

پرچے کی پیسٹنگ پر زمانہ کنجاہی برفی لانا کبھی نہ بھولتے۔ عائشہ اسلم ذرا لئے دئے رہتی اور ہمیشہ اپنی خوبرو بھابی کے ساتھ آتی۔ پھر جانے کیا ہوا۔ سعیدہ نے عظیم الفرقان سے طلاق لے لی اور حسن نثار سے شادی کر لی۔ کچھ عرصے کے لئے ہمارا سب کا رابطہ سعیدہ سے کٹ گیا۔ شاید 1978ء یا 1979ء میں وہ پھر نمودار ہوئی۔ اب وہ تین بیٹوں کی ماں تھی اور ماڈل ٹاؤن کی ملحقہ بستی دھلّے میں رہائش پذیر تھی۔ میں ماڈل ٹاؤن کے ایچ بلاک میں رہتی تھی۔ سعیدہ کو جب کہیں جانا ہوتا تو بچوں کو میرے گھر چھوڑ جاتی۔ میرا گھر اس کے راستے میں پڑتا تھا اور اسے مجھ پر بھروسہ تھا۔

سعیدہ کے تینوں بیٹے بڑے پیارے مگر حد درجہ شریر بچے تھے۔ جب تک وہ رہتے گھر میں اودھم مچا رہتا۔ ان سب کو عنبر بمشکل قابو کرتا۔ دھلّہ اب ماڈل ٹاؤن کا Q اور R بلاک بن چکا ہے۔ حسن نثار اُن دنوں سعودیہ میں مقیم تھے۔ سعیدہ اور حسن نثار کا ہجر و وصال سے پُر عشقیہ خطوط کا باہمی سلسلہ جاری تھا۔ بعدازاں حسن نثار سعودیہ سے واپس آ گئے اور سعیدہ سے ہمارا رابطہ ایک بار پھر منقطع ہو گیا۔ 1985ء میں ہم لوگ بھی لاہور سے ہجرت کر کے اسلام آباد چلے گئے ۔ حسن نثار نے سعیدہ کے خطوط کو کتابی شکل دی تو ادبی حلقوں میں مدتوں ان کا چرچہ ہوتا رہا۔ لیکن جانے کیا ان ہونی ہوئی کہ سعیدہ کو طلاق ہو گئی۔ بڑے طویل عرصے تک سعیدہ میرے رابطے سے قطعی طور پر باہر رہی۔ پھر ایک دن فون پر اظہر جاوید نے بتایا کہ اس نے کسی شگفتہ نام کے جج سے نکاح کر لیا ہے۔ میں نے سوچا ''چلو اسے گھر مل گیا۔'' اب وہ پھر ادبی منظر سے غائب تھی۔

2003ء یا 2004ء میں وہ پھر نمودار ہوئی۔ شبہ نے مجھے فون پر خبر سنائی تھی۔ سعیدہ اسے کہیں ملی تھی۔ مگر وقت نے میرے اور اس کے درمیان سینکڑوں میل کا فاصلہ حائل کر دیا تھا۔ میں اسلام آباد سے کراچی منتقل ہو چکی تھی۔ لاہور گئی تو میں نے اسے فون کیا۔ پھر وہ مجھ سے ملنے شبہ کے گھر آئی جہاں میں قیام پذیر تھی۔ وہی الڑھ انداز، وہی دل نواز ہنسی، ویسی ہی بے تکلف۔ اس نے بتایا کہ شگفتہ سے بھی اس کے ایک بیٹا ہے مگر وہ حسن نثار کے چھوٹے بیٹے کے ساتھ لالہ زار میں رہتی ہے۔ وہ بچوں کی تفصیل بتاتی رہی۔ شگفتہ نے بھی اسے طلاق دے دی تھی۔ اپنے اوپر گزرے کڑے وقت کا تذکرہ کرنے سے اس نے گریز کیا۔ اس نے مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت دی جسے میں نے لاہور کے اگلے چکر میں آنے کا وعدہ پر رکھا۔ مگر اگلے ٹرپ پر بھی میں اس سے مل نہیں سکی۔ جون 2011ء کو لاہور گئی تو حسن آذر نے اس کی شاعری کی کتاب ''مجھے لکھنا نہیں آتا'' مجھے دی۔ اب میں اس کے گھر جانے کا ارادہ کر چکی تھی مگر جا نہ سکی۔ 7/اکتوبر 2011ء کو میں مغرب کی نماز پڑھ رہی تھی جب فون کی گھنٹی بجی۔ اظہر جاوید کہہ رہے تھے۔

''بی بی! آپ کی سعیدہ ہاشمی اپنے آخری لختِ جگر کی گولی سے خون کے سمندر میں ہمیشہ کے لئے غرق ہو گئی ہے۔'' قاتل کی موٹر سائیکل درخت وغیرہ سے اس طرح ٹکرائی کہ وہ بھی اس جہان سے چل بسا۔

موت کا ایک دن معین ہے لیکن ہم نہیں جانتے۔ ہمیں پتہ نہیں کہ ہماری موت کہاں اور کس صورت میں ہم سے آ کر ملے گی۔ گھر کے بستر پر، ہسپتال میں، بارود میں جل کر، پانی میں ڈوب کر یا پستول کی نالی پر!

اور اب جب کہ میں اپنی یادداشتوں کو کھنگال چکی تھی اور انہیں قلمبند کرنے کے بعد فائل میں رکھ کر بھول چکی تھی اور اب جب یہ مضمون بر آمد ہوا تو میں ایک اور عزیز دوست کے صدمے سے گزر چکی تھی۔ یوں تو چلا چلی کا بازار گرم ہے۔ کتنے ہی عزیز، دوست، احباب، عدم آباد جا بسے، اظہر جاوید بھی۔ جن سے ہر ادیب دوست کی تعزیت شیئر ہوتی تھی۔ جو زندگی کے اچھے بُرے وقتوں میں ہمارے کام آتا تھا۔ جس نے میرے ہم سفر کے بچھڑ جانے پر مجھے تسلی آمیز کلمات سے ڈھارس دی تھی۔ وہ اظہر جاوید خود چپ چاپ اکیلا ہی مرحوم دوستوں سے جا ملا اور دفتر ''تخلیق'' ویران ہوا۔ میکلیگن روڈ اور بھگوان اسٹریٹ، دونوں ایک دوسرے سے پوچھتی ہیں۔

کہاں گیا اظہر جاوید......اور دفتر تخلیق......؟

◆◆◆

''مسائلِ ادب ہوں یا مسائلِ زمانہ، اظہر جاوید نے ان کے بارے میں ہمیشہ ہوش مندانہ، اصولی اور ترقی پسندانہ مؤقف اختیار کیا ہے۔ وہ ادب و فن، تہذیب و ثقافت کو پورے سیاق اور سباق میں دیکھتا ہے اور انسان اور انسانیت کی حرمت کے تصورات کی بنیاد پر سماجی زندگی کو جانچتا ہے۔ البتہ مسائلِ عشق کے بارے میں ان کا رویہ مختلف ہے۔'' عابد حسن منٹو

شیرازہ

ڈاکٹر انور سدید

برطانیہ میں اُردو زبان و ادب کے فروغ میں نمایاں خدمات اور تخلیقی کردار ادا کرنے والوں کے نام لیے جائیں تو محمود ہاشمی (''کشمیر اُداس ہے'' کے مصنف)، مقصود الٰہی شیخ (مدیر ''راوی'' اور ''مخزن'')۔ قیصر تمکین، ڈاکٹر صفات علوی، ساحر شیوی اور صابر ارشاد عثمانی کے نام ذہن کی تختی پر فوراً اُبھر آتے ہیں۔ ان سب کے ساتھ مجھے جاوید اختر چودھری بھی یاد آ رہے ہیں جو پاکستان کے ایک دُور اُفتادہ شہر سوہاوہ سے تارکِ وطن کی حیثیت میں برطانیہ گئے تو وہاں مستقل طور پر آباد ہو گئے اور اپنے ذوق کی پرورش کے لیے شاعری کرنے لگے، اپنے مشاہدات کو کہانیوں کی صورت دینے لگے۔ ان کی سوچ کے زاویے نثر کے مضامین میں بھی ظاہر ہو چکے ہیں۔ شاعری کا پہلا مجموعہ ''حصارِ ذات'' 1999ء میں اس وقت شائع ہوا جب ان کی شاعری کی عمر 37 برس ہو گئی تھی۔ اس سے ظاہر ہے کہ جاوید اختر چودھری نے 1962ء میں شعر کہنا شروع کیا تھا۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ ''حرفِ دُعا'' کے نام سے شائع ہوا تو اس کی تحسین جناب مقصود الٰہی شیخ نے ایک مضمون لکھ کر کی اور تسلیم کیا کہ ''فسانہ طرازی میں ان کا اپنا الگ سا رنگ اور سحر ہے۔'' مجھے ان کے سب افسانوں کے مطالعے کا دعویٰ نہیں۔ لیکن ان کے ایک افسانے ''ٹھوکا'' نے جو تاثر پیدا کیا وہ کبھی مٹ نہیں سکا۔ ''سوہاوہ میری بستی میرے لوگ'' میں انہوں نے اپنی جنم بھومی کے نقوش اُبھارتے ہیں۔ یہ سوہاوہ کی ان تصویروں پر مشتمل کتاب ہے جو جاوید اختر چودھری کے دل میں محفوظ ہیں اور جب برطانیہ میں اُداس ہوتے ہیں تو گردن جھکا کر اس پکچر گیلری میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اب یہ بتانا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہ برطانیہ سے ''سوہاوہ یاترا'' پر تشریف لائے تو مجھے بھی اپنی ملاقات سے شرف یاب کیا۔

یہ تمہید جاوید اختر چودھری کے تعارف کے لیے ضروری تھی۔ ان کی نئی کتاب ''شیرازہ'' کے عنوان سے شائع ہوئی ہے جو مضامین، انٹرویوز اور خطوط پر مشتمل ہے۔ ان تین اصنافِ ادب میں جاوید اختر، چودھری نے ادیبوں اور کتابوں کو موضوع بنایا ہے اور اپنا تاثر معصوم سادگی، بے لاگ صداقت اور حقیقت کے دائرے میں رہ کر پیش کیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے جناب احمد ندیم قاسمی کو اُردو ادب کا اساطیری کردار شمار کیا اور لکھا:۔

> ''انہوں نے نہ تو شرابیوں کے کلب کی رکنیت حاصل کی اور نہ ہی راگیوں کی خدمات سے استفادہ کیا۔ قاسمی صاحب نے نہ کوئی تشہیری حربے استعمال کیے اور نہ ہی بیرونِ ملک میں منعقدہ مشاعروں کو شہرت اور افتخار کا زینہ بنایا۔ انہیں ان چیزوں کی ضرورت بھی نہ تھی۔''

اس پارس پتھر کے لمس سے خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، پروین شاکر اور منصورہ احمد سونا بن گئیں لیکن اب وہ اس دنیا میں موجود نہیں۔ لیکن امجد

اسلام امجد اور خالد احمد زندہ ہیں۔ اور یہ دونوں جناب جاوید اختر چودھری کے محولہ بالا بیانِ حقیقت پر نشان انگوٹھا ثبت کر سکتے ہیں۔ انہوں نے برطانیہ میں آباد قیصر تمکین، سیّد عطا جالندھری، محمد اقبال بھٹی، ڈاکٹر صفات علوی اور محمد فاروق نسیم پر خاکہ نما مضامین پھول کے قلم سے لکھے ہیں اور ان قلم کاروں کے فن کی خوشبو برطانیہ کی راجدھانی کی حدود سے باہر بھی پھیلائی ہے۔ خالد سہیل کی تصنیف ''سچ اپنا اپنا'' میں انہوں نے اپنا سچ پیش کر کے جرأت مندی کا ثبوت دیا ہے۔ خالد سہیل نے اُردو کی معروف مصنّفہ اور ''سخن ور'' اور ''گفتنی'' جیسی کتابوں کی نامور مؤلفہ سلطانہ مہر کو یہ کتاب بھیجی تو لکھا:

''سلطانہ مہر کے نام...... جن کے اُردو پر بہت سے احسانات ہیں۔'' (خالد سہیل)

جاوید اختر چودھری نے یہ ''انتساب'' پڑھا تو چونک پڑے اور سوالیہ انداز میں لکھا:

''اگر ایسا ہی ہے تو وہ اعزازات اور انعامات کہاں ہیں جو قوم اپنے محسن کو دیا کرتی ہے۔ جو اُردو ادب پر احسان کرنے والوں کو ملتے ہیں۔ جو ہر سال سینکڑوں افراد کو پاکستان اور بھارت کے صدر صاحبان اور وزرائے اعظم اور وہاں کے دیگر معتبر ادبی ادارے عطا کرتے ہیں۔''

ڈاکٹر خالد سہیل نے اپنی کتاب میں عارف عبدالمتین کے قبولِ اسلام کا ذکر کرتے ہوئے ذوالفقار علی بھٹی اور جنرل ضیاء الحق کا بھی ذکر کیا تو جاوید اختر چودھری نے اپنی سیاسی بصیرت کا اظہار بھی جرأت مندی سے کیا اور کہا:

''ذوالفقار علی بھٹو ایک شاعر اور انتہائی مکار سیاست دان تھا۔ اس کے پسماندگان اس سے بھی چار ہاتھ آگے نکلے۔ یہ 1965ء کی جنگ کی ابتدا اور 1971ء میں بنگلہ دیش کے قیام میں بھٹو صاحب کی سیاست کا بڑا عمل دخل تھا۔ برسرِ اقتدار رہنے کے لیے یہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ بے نظیر بھٹو نے بھی ہندوستان سے کہا تھا کہ وہ پاکستانی فوج کو ڈرانے کے لیے پاکستان کی سرحد پر محاذ کھولے۔ بھٹو اور ان کے حواری دن رات آمروں کو بُرا بھلا کہتے ہیں حالاں کہ بھٹو صاحب کی سیاست کا اکھوا آمریت کی گود میں پھوٹا، پھولا اور پھلا...... طاقت اور اقتدار کے نشے نے انہیں اندھا کر دیا تھا۔ پھر دوسرے آمر جنرل ضیاء الحق کے دور میں انجام کو پہنچے۔ جس نفاق کا آغاز بھٹو کی سیاست سے ہوا تھا، اسے عروج ضیاء الحق کے دور میں ملا۔ بھٹو نے اسلام کو اپنے ذاتی جاہ و جلال اور دائمی اقتدار کے لیے استعمال کیا اور ضیاء الحق نے اسلام کے نام پر روایتوں اور عقیدوں کو پروان چڑھایا۔ انجام دونوں کا عبرت ناک ہوا۔''

یہ اقتباس واوین کے بغیر ہے اس لیے قاری انہیں جاوید اختر چودھری صاحب سے ہی منسوب کرے گا۔ انہوں نے خالد سہیل کی اس بات سے بھی برملا اختلاف کیا ہے کہ ''شاعر شراب پی کر سچ بولتا ہے......'' ان کا مشاہدہ اور ایقان یہ ہے کہ

''شاعر شراب پی کر بہک کر ضرورت سے زیادہ جھوٹ بولتا ہے۔ وہ اپنی انا اور برتری کے قصے سناتا ہے۔ نشے کی حالت میں اس کی شاعرانہ تعلّی اور شیخی عروج پر ہوتی ہے اور یہ بات ساقی فاروقی پر بھی صادق آتی ہے۔'' جن کے بارے میں ایک اقتباس یہ بھی سامنے آتا ہے:

''ساقی فاروقی کو جب یہ خطرہ لاحق ہوا کہ کہیں اخلاقیات کا پرچار کرنے والے مولوی اور نقاد اس کی نظموں اور

غزلوں پر تھوک نہ دیں تو اس نے ''حملہ بہترین دفاع ہے'' (offence is the best defence) کے اصول پر عمل کرتے ہوئے ان پر خود ہی تھوکنا شروع کر دیا۔''

جاوید اختر چودھری کی خوبی یہ ہے کہ وہ چھپی ہوئی جو چیز بھی پڑھتے ہیں اور بولی ہوئی بات تقریبات میں سنتے ہیں تو اس سے اپنے اختلاف کے حقوق محفوظ رکھتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ اپنا اختلافی نکتہ مصنّف یا مقرّر تک بھی پہنچا دیں۔ ''شیرازہ'' کے مضامین، انٹرویوز اور خطوط میں اختلاف کے برملا اظہار کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ پروفیسر فتح محمد ملک، افتخار نسیم، بخش لائل پوری، حمید قیصر اور مشکور حسین یاد کو انہوں نے جس طرح اپنے کڑوے لفظوں کی زد میں لیا ہے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ برطانیہ کی آزاد فضا میں اُردو کے ادیب بھی سچ لکھنے اور سچ کہنے کی ''جسارت'' کر لیتے ہیں اور جاوید اختر چودھری کی یہ صلاحیت تحسین کی حق دار ہے۔ تاہم اس سے یہ نتیجہ اخذ نہ کیا جائے کہ جاوید اختر چودھری بے جا نکتہ چینی میں دلچسپی لیتے ہیں۔ مجھے ان کی ادبی شخصیت میں مدلّل تحسین کا زاویہ نمایاں نظر آتا ہے تو ان کی رائے میں ان کے تجربے اور مشاہدے کی چاشنی بھی ملتی ہے۔ قیصر تمکین، ش۔صغیر۔ادیب، سیّد عطا جالندھری، محمد اقبال بھٹی، محمد فاروق نسیم، مظفر حنفی، شیخ مقبول الٰہی اور فرخندہ رضوی پر ان کے مضامین اس سلسلے کی خوبصورت کڑیاں ہیں۔

اسلوبیات کے زاویے سے جاوید اختر چودھری نے اپنی نثر کی تشکیل و تعمیر اس طرح کی کہ سیّد عطا جالندھری نے ''چراغ جلنے دو'' اور ''شب زدہ تنہائیاں'' پر ان کے مضامین پڑھ کر کہا:

''جاوید تمہاری نثر میں بڑی جان اور بڑی کاٹ ہے۔ باقاعدگی سے نثر لکھتے رہو۔''

جاوید صاحب نے عطا جالندھری کے اس حرفِ تحسین کی لاج رکھی اور اپنی مشق و مزاولت سے اپنا ذاتی اسلوب اختراع کیا جس میں واحد متکلم ہمارے ساتھ بڑی بے تکلفی سے مکالمہ کرتا اور وہ باتیں سناتا چلا جاتا ہے جن تک اس سے پہلے ہماری رسائی نہیں ہوئی۔ آپ یہ کتاب منگوانا چاہیں تو پاکستان میں اس پتے پر خط لکھیں: (جاوید اختر چودھری۔ محلّہ چودھری محمد یوسف۔ سوہاوہ (ضلع جہلم) پاکستان۔

◆◆◆

ممتاز افسانہ نگار جاوید اختر چودھری کی کتاب

ٹھوکا

شائع ہو گئی ہے

رابطہ

محلّہ چوہدری محمد یوسف، سوہاوہ، ضلع جہلم (پاکستان)

گوشۂ اظہر جاوید

محبتوں کا پیامبر......اظہر جاوید

ف۔س۔اعجاز (انڈیا)

ماہنامہ تخلیق لاہور کا جلد 43 کا شمارہ 2 مطابق فروری 2012 ملنے کے فوراً بعد اظہر جاوید صاحب کے اچانک انتقال کی خبر ملی۔ بہت دکھ ہوا۔ مذکورہ شمارے اور ان کے انتقال کی خبر میں وقت کا فاصلہ اتنا کم تھا کہ خبر کا یقین ہی نہ ہوتا تھا یا یوں کہئے کہ خبر پر یقین کرنے کو دل ہی نہیں چاہتا تھا۔ خبر سن کر جب اس شمارے پر ہاتھ رکھتا ہوں وہ اتنا تازہ اور صاف نظر آتا ہے کہ اظہر جاوید کے انتقال پر ملال کی دھول کا اس پر بیٹھنا گوارا نہیں ہوتا۔

ان سے فون پر بات ہوئے چند مہینے گزرے۔ ان کی خیریت پوچھنے کے لئے میں نے فون کیا تھا۔ انھوں نے بتایا طبیعت بحال ہو چکی ہے۔ یہ سن کر مجھے خوشی ہوئی۔ ان سے برسوں تعلق خاطر رہا۔ میری شاعری اور اکا دکا مضامین تخلیق میں شائع ہوا کرتے تھے۔ میری تصنیفات اور انشاء کے خاص شماروں پر تبصرے بطور خاص تخلیق میں شائع فرماتے تھے۔ ان کا کلام بھی کبھی کبھار ماہنامہ انشاء میں شائع ہوتا تھا۔ انشاء کے ''ادیبوں کی حیاتِ معاشقہ نمبر'' کے دوسرے ایڈیشن کے لئے ساحر کے تعلق سے ان کا ایک مضمون اشاعت کے لئے محفوظ ہے جو میری فرمائش پر انھوں نے لکھا تھا۔ کسی نے کہا ہے ''دنیا میں اجنبی کوئی نہیں ہے اور جواب تک نہیں مل پائے وہ صرف دوست ہیں جن سے ملاقات ہونا باقی ہے۔'' ان سے خط و کتابت ہوا کرتی تھی۔ اور یہ تعلق بہت پرانا تھا۔ پھر انور سدید صاحب سے جو قلمی شناسائی بہت پرانی تھی، اس نے ایک واضح شکل ''تخلیق'' کے صفحات میں اختیار کر لی۔ تبصروں اور غیر ملکی کتابوں کے کالموں میں۔ یوں تو قتیل شفائی سے بھی مرحوم کا ذکر ہوا کرتا تھا۔

اظہر جاوید نہ صرف اپنی طرز کے اکیلے آدمی تھے بلکہ مدیر بھی اپنے ہی انداز کے تھے۔ نقصان کے سودے انہیں بہت پسند تھے۔ 130 لے کر 240 صفحات کے شمارے پچاس روپے میں نکال کر اہل ادب کے علمی اور فکری تمول میں ہر ماہ اضافہ کرتے رہنا ان کا بھی ایک مذہبی فریضہ سا ہماری ہی طرح بن گیا تھا۔ اور ہر شمارے میں شرح ڈاک کے بڑھنے کا رونا برسوں سے روتے آ رہے تھے۔ کئی ادارے تواتر سے پاکستان کی حکومت کو مخاطب کر کے لکھتے رہے کہ بدیشی ڈاک کی شرح برائے رسائل و کتب کم کی جائے۔ یہ بھی ایک لطیفہ ہے کہ جب انھوں نے ایک دوواداریوں میں ہندوستان کی شرح ڈاک برائے فارن ڈاک کی طرف متوجہ کیا کہ انڈیا سے پاکستان وغیرہ کے لئے کتابوں اور رسالوں پر ڈاک خرچ بہت کم آتا ہے، حکومت پاکستان اس پر غور کرے تو خدا جانے ان کی بات کس طرح خداوندانِ ڈاک نے سن

کر ہماری حکومت کو الغا کر دیا۔ انشاء جو بنگلہ دیش اور پاکستان تین روپے کے ڈاک ٹکٹ سے پوسٹ ہوتا آ تا رہا تھا اچانک 25اور پھر 35روپے تک پہنچ گیا۔ میں نے اظہر جاوید صاحب کو ایک خط میں لکھا یہ سب آپ کی سازش یا بددعا کا نتیجہ ہے۔ میں نے انہیں دو ایک بار فون پر ایک تجویز پیش کی کہ آپ چند صفحات کم کر دیں اور ٹائپ کا سائز جو ابھی بہت بڑا ہے ذرا خفی کر دیں تو آپ کا خسارہ ضرور کم ہو جائے گا۔لیکن تھے وہ ضدی۔اپنے من کی ہی کرتے تھے۔

ایک معزز خاتون قانون پیشہ اور محترمہ تسنیم کوثر چند سال قبل دہلی میں نارنگ ساقی صاحب کے دفتر میں ان سے ملاقات ہوئی۔ اور پاکستان سے ان کے ساتھ تشریف لائی تھیں۔کافی وقت خوش گوار اور بے تکلف ماحول میں ساقی صاحب کے دفتر میں گزرا۔ساقی تو ہیں ہی ''تخلیق'' کے ہندوستان میں نگراں۔ میں نے انہیں کلکتہ آنے کی دعوت دی۔تینوں نے وعدہ بھی کیا کہ اگلی بار کلکتے کا ویزا لے کر آئیں گے۔دعوت تو اظہر جاوید صاحب کو میں پہلے بھی کئی بار دے چکا تھا۔ایک بار آنے پر رضامند ہو گئے تھے مگر وہی ویزے کا مسئلہ!۔

''تخلیق'' میں دنیا بھر کے اردو افسانہ نگار شاعر اور نقاد لکھتے آئے ہیں۔اور مختلف اصنافِ ادب میں اظہر جاوید نے اچھی سے اچھی تحریریں پیش کرنے کی سعادت حاصل کی۔پنجابی اصنافِ ادب کو بھی کئی صفحات دیتے تھے۔''انجمن خیال'' میں تخلیق اور اظہر جاوید کے چاہنے والوں کے تاثراتی، فنی اور تنقیدی خطوط پوری پوری طوالت کے شائع ہوتے تھے۔لیکن ''اپنی بات'' ادارتی کالم میں وہ اپنی ہی بات کہتے تھے۔اور اپنے دوٹوک بے باک لہجے کا کمال دکھاتے تھے۔ پاکستان جو ایک مثالی سیاسی نظام سے محروم رہا ہے اس پر اپنی تشویش کا اظہار ضرور کرتے تھے۔ پاکستان کو ایک آئیڈیل جمہوری نظام اور ایماندار حاکموں کی ضرورت ہے تقریباً ہر اداریئے میں اس پر اصرار کرتے تھے۔کرپشن پر قابو پانا ان کے نزدیک بہت ضروری تھا۔نوجوان نسل یا بوڑھی عمر کے لوگوں کا پاکستان سے ہجرت کر کے مغربی ممالک میں جا بسنا اظہر جاوید کے لئے افسوسناک بات تھی۔اور وہ اس طرح کی ہجرت کے اسباب کا تدارک چاہتے تھے۔اسی طرح پاکستان میں سرکاری ادبیاتی ادارے کے بگڑے ماحول اور سیاسی غرض مندوں اور حکمرانوں کے ذریعہ چند پسندیدہ ادیبوں کے ذریعہ ادب اور ادیبوں کا ادارہ جاتی استحصال ان کے ماتم، تبصرہ اور احتجاج کا موضوع بنتا رہا۔''اپنی بات'' کے موضوعات میں تنوع تھا اور وہ اپنی بات کے آغاز یا انجام میں کوئی واقعہ، کتاب یا کسی فلم سے کوئی صورتِ حال بیان کر کے اپنے مقصد کے لئے طاقت تلاش کرتے تھے۔ جو مایوس ترقی پسندوں کو اپنے آئیڈیل کے انگاروں کی راکھ کو کریدنے سے ملتی ہے۔اب اس پیارے اظہر جاوید کو کس مٹی میں تلاش کیا جائے۔میں سوگوار ہوں اور سوچتا ہوں۔دعا ہے خدا ان کی مغفرت کرے۔آمین!

◆◆◆

''اظہر جاوید! تمہارے اس شعر نے تو میرے اندر بھونچال ڈال دیا ہے۔ میں تمہاری آپا (بانو قدسیہ) سے کہہ رہا تھا......کئی لوگوں کو سنایا......اوئے! تم نے اس عہد کا بہت بڑا شعر کہہ دیا ہے :

جلا کے کشتیاں دریا کے پار ہم بھی گئے
ہمارے ساتھ مگر یہ ہوا کے مارے گئے''

اشفاق احمد

اظہر جاوید کی یاد میں

ایم ڈی ملک

چودہ فروری 2012 ''تخلیق'' کے قارئین کے لیۓ ایک غمگین دن تھا اس دن محترم اظہر جاوید ہم سب سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے ۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ اس دن انکی موت پر کسی کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ راقم نے محترم انور سدید' ابدال بیلا اور ملک مقبول کو یہ کہتے سنا کہ ''کل تک وہ بالکل ٹھیک تھا یقین نہیں آ رہا کہ اظہر جاوید اتنا جلدی مر سکتا ہے۔'' لیکن موت تو برحق ہے۔ سحر حفیظ تخلیق برادری کو یہ خبر دیتے ہوئے خود بھی صدمے سے نڈھال تھی۔ حزن وملال میں ڈوبا سونان اظہر' بابا کے فون پر لوگوں کے تعزیتی کلمات بڑے صبر وسکون سے سن رہا تھا۔ سونان اظہر کے بابا کے فون پر سونان کی غمگین آواز سن کر اظہر جاوید کے قریبی چاہنے والوں کو یقین آنا شروع ہو گیا کہ اس دن ''جی اظہر!'' کی آواز واقعی ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی۔

''تخلیق'' کے دیگر قارئین کی طرح راقم بھی اظہر جاوید کی جادوئی شخصیت سے ہمیشہ متاثر رہا ہے۔ وہ ''تخلیق'' کے قاری اور لکھاری کے ساتھ ہمیشہ رابطے میں رہتے تھے۔ شام کے اوقات میں ان کا فون ہمیشہ مصروف ملتا تھا۔ میں جب کبھی بھی ''تخلیق'' کے دفتر میں انکی قدم بوسی کے لیے حاضر ہوا تو کسی نہ کسی ملاقاتی کے ساتھ ان کو محو گفتگو ہی پایا۔ فون پر بات ہو رہی ہو یا ملاقاتی کی رخصتگی کا وقت ہو' وہ اسے شاد آباد رہنے کی دعا دینا کبھی نہ بھولتے تھے۔

اظہر جاوید کے چالیسویں میں اکابرین کے اکٹھ کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ ان کی دوستی ادب کے کتنے عظیم لوگوں سے تھی۔ ان کی شخصیت پر راقم نے ایک تعزیتی مضمون بعنوان ''لمبی لمبی زلفوں والا'' بھی تحریر کیا لیکن وہ ماہنامہ ''روشنائی'' میں چھپ جانے کی وجہ سے ''تخلیق'' میں جگہ نہ پا سکا۔ تخلیق سے میری دلی وابستگی کا یہ عالم ہے کہ گذشتہ دو دہائیوں سے میں اس کا باقاعدہ خریدار چلا آ رہا ہوں۔ جب اظہر جاوید کی موت کے بعد اس رسالے کو ایک ٹرسٹ کی زیرنگرانی شائع کرنے کا فیصلہ ہوا تو راقم نے اگلے پچیس سال کے لیے یکمشت سالانہ چندہ منی آرڈر کر دیا۔

اظہر جاوید کی ادارت میں شائع ہونے والے کم قیمت ''تخلیق'' میں قارئین کے ادبی ذوق کی تسکین کا ہر سامان میسر ہوتا تھا۔ ادب کی تقریباً ہر صنف کی نمائندہ تحریروں کو کم ضخامت کے رسالے میں سمونا یقیناً مرحوم کا بہت بڑا کمال تھا۔ اس رسالے کی سب سے پسندیدہ تحریر مدیر کی ''اپنی بات'' ہوتی تھی۔ اگر یہ کہا جائے تو شاید غلط نہ ہو کہ الف جیم کی ''اپنی بات'' کو ہر قاری اپنے ہی دل کی آواز سمجھتا تھا۔ وہ خود اپنے ہاتھ سے لفافے پر پتا لکھتے تھے۔ ''تخلیق'' کے طویل سفر میں واقع ہی انہوں نے نہ کبھی کسی سے مالی تعاون کی فریاد کی نہ زبوں حالی کا واویلا مچایا تاہم ان کی تحریر ''دم ہے تو ''تخلیق'' قائم رہے گا ورنہ...... بند رسائل کی فہرست میں تذکرہ نگار ایک اور نام کا اضافہ

کرلیں''، کو پڑھ کر قارئین ''تخلیق'' کے مستقبل کے متعلق ماہ بہ ماہ تشویش میں ضرور رہتے تھے۔آخر کار 14 فروری 2012 کو وہ دن آ ہی گیا جب ادب کا یہ درخشندہ ستارہ قریباً نصف صدی کے عرصے تک ادب کے آسمان پر روشن رہنے کے بعد اجل کی گمنام وادیوں میں ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا۔

اظہر جاوید کی رحلت کے بعد ان کے ہونہار بیٹے سونان اظہر جاوید نے جن نامساعد حالات میں اپنے والد محترم کی رسم تخلیق نوازی کو آگے بڑھایا وہ نہ صرف لائق تحسین ہے بلکہ ان کی اس کاوش کی مثال ادبی دنیا میں کم کم ہی ملتی ہے۔سونان اظہر جاوید کی ادبی اڑان پر ادب کے بڑے بڑے عبقریوں نے جو تحسینی کلمات کہے ہیں وہ بڑے برمحل اور مبنی برحقیقت ہیں۔تخلیق کے قاری کی حیثیت سے میں انکی خوش تدبیری؛ بلند حوصلگی اور ادبی روایت کی پاسداری پر انہیں مبارکباد پیش کرتا ہوں اور توقع رکھتا ہوں کہ وہ اپنے عظیم باپ کے نقش قدم پر یونہی کاربند رہے گا۔

یوں تو اظہر جاوید کے ساتھ گزرے ماہ سال کی بے شمار یادیں ذہن کے نہاں خانوں میں محفوظ ہیں مگر یہاں میں صرف چند باتیں قارئین کو پیش کروں گا۔

ایک دفعہ ہم انارکلی کے دفتر میں بیٹھے تھے کہ محترم ابدال بیلا کا ذکر خیر آیا تو کہنے لگے ''وہ بڑا جی دار آدمی ہے۔'' میں نے کہا ''حضور، وہ تو آپ کو باباجی کہتا ہے'' کہنے لگے ''فوجی ہے نا۔ جو اسکے جی میں آئے کہے، سرکار کو کون روک سکتا ہے۔''

اسی طرح ایک دفعہ میں نے فون پر ان سے شکایت کی کہ ''انجمن خیال'' میں دشنام طرازی کا عنصر در آیا ہے تو کہنے لگے۔ ''کیا کروں جی یہ سب میرے کدِ مغرما اور دوست ہیں۔ایک اور روز کا واقعہ ہے کہ میں نے فون پر کسی نوآموز شاعر کے کلام میں چند عروضی غلطیوں کی نشاندہی کی تو کہنے لگے کوئی بات نہیں ''تخلیق'' نئے لکھنے والوں کی نرسری ہے۔ پختہ کار ہوں گے تو خود ہی ان غلطیوں کو دور کرلیں گے۔ واقعی وہ نئے لکھنے والوں کی بڑی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔

ان کی موت سے چند ماہ قبل کی بات ہے کہ ''تخلیق'' میں عزیز جبران انصاری اور مناظر عاشق ہرگانوی کے درمیان ایک عروضی بحث چھڑ گئی تو میں نے فون پر انہیں کہا کہ ''مجھے تو انصاری صاحب کا مؤقف درست لگتا ہے۔ کہنے لگے ''ابھی بحث جاری ہے اب دیکھتے ہیں پاک و ہند کی اس عروضی جنگ میں کون سا فریق جیتتا ہے۔'' اس عروضی بحث سے چند ماہ قبل کا واقعہ ہے کہ ایک دفعہ انہوں نے طیش میں آ کر ''انجمنِ خیال'' کا سلسلہ بیک جنبش قلم روک دیا۔ان کے اس فیصلے سے تخلیقی دنیا میں ایک کہرام بپا ہوگیا۔راقم نے انہیں منانے کی اپنی سی کوشش کی۔حوصلہ افزا جواب نہ ملا تو جواباً میں نے عرض کیا کہ ''چلیں آپ نہیں مانتے تو میں ادب کی سپریم کورٹ میں اپیل کرتا ہوں۔'' چونک کر کہنے لگے ''وہ کہاں ہے؟'' جب میں نے انور سدید صاحب کا نام لیا تو کھلکھلا کر ہنسے اور پھر جب یہ سلسلہ بحال ہوا تو مجھے فون پر کہنے لگے ''لوجی فیصلہ آپ کے حق میں آ گیا ہے'' خدا کا شکر ہے کہ ''تخلیق'' میں انجمن خیال کا سلسلہ اسی طرح جاری وساری ہے۔

اللہ تخلیق کو دن دگنی اور رات چوگنی ترقی دے اور سونان اظہر کی ادارت میں یہ تا دیر جاری وساری رہے۔سونان نے تخلیق میں جو تبدیلیاں کی ہیں وہ ہر لحاظ سے قابل تعریف ہیں۔خاص کر اظہر جاوید ہر صفحے پر موجود ہیں۔آخر میں؛ میں ایک بار پھر اظہر جاوید صاحب کے بلند درجات کی دعا کرتا ہوں۔

◆◆◆

روشنی کی مثال تھا اظہر

علی رضا

اظہر جاوید بھی رخصت ہو گئے...... کسی کو گمان تک نہ تھا کہ اتنا ان تھک اور متحرک آدمی جو ایک طویل عرصہ سے شعر و ادب کی ترویج اور فروغ کے لئے سرگرم رہا ہو سب کو یوں داغ مفارقت دے جائے گا۔ حضرتِ احسان دانش کے بقول ؎

قبر کے چوکھٹے خالی ہیں انھیں مت بھولو
جانے کب کون سی تصویر سجا دی جائے

یہ نظامِ قدرت ہے کہ جو کوئی دنیا میں آیا ہے اپنی مدتِ حیات پوری کر کے اسے ایک نہ ایک دن ضرور یہاں سے رخصت ہونا ہے سو اظہر جاوید بھی چلے گئے اور اب وہ واپس نہیں آئیں گے۔ ماہنامہ ''تخلیق'' کا بھگوان سٹریٹ پر واقع ان کا دفتر اور کمرہ جس سے ان کی رفاقت بھی بہت پرانی تھی ان کے جانے سے بہت اداس ہے۔ کمرے میں بکھری ہوئی اور بے ترتیب کتابیں اور کچھ پرانا فرنیچر بھی اظہر جاوید کے یوں اچانک چلے جانے سے افسردہ ہے۔ ماہنامہ 'تخلیق' کی اشاعت گزشتہ بیالیس برسوں سے جاری تھی اس انداز میں انھوں نے شعر و ادب کی طویل عرصہ تک بے پناہ خدمت کی اور اپنے ادبی رسالے کو نگارشات کے حوالے سے ایک خاص معیار کی بلندی پر فائز رکھا اور اس میں شامل تخلیقات کے معیار کے معاملے میں انھوں نے کبھی کسی سے سمجھوتہ نہ کیا۔ اچھی شاعری اور عمدہ نثر ان کے حسنِ انتخاب کی ہمیشہ آئینہ دار رہی۔

''تخلیق'' کے لئے اچھی تحریر اگر انھیں دور دراز کے کسی گاؤں سے بھی موصول ہوئی تو انھوں نے بلا تامل اسے ''تخلیق'' کے صفحات پر جگہ دی۔ خود دار ایسے تھے کہ تخلیق کی 43 سال سے زائد عرصہ پر محیط کامیاب اشاعت کے دوران کسی مرحلے پر بھی کبھی انھیں کسی کے سامنے دستِ سوال دراز کرتے ہوئے نہیں دیکھا گیا اور نہ ہی انھیں پرچے کی سالانہ خریداری کے لئے ہاتھ پاؤں مارتے دیکھا گیا اگر اس حوالے سے اور سالانہ خریداروں کے معاملے میں بات کرتا تو مسکرا کر بات ٹال دیتے اور کہتے یار اللہ بہتر کرے گا۔ ''تخلیق'' جیسے موقر اور معیاری ادبی پرچے کی باقاعدگی سے کامیاب اشاعت کی یقیناً ایک غیر معمولی کام تھا۔ اظہر جاوید دوستوں کے دکھ سکھ اور غمی خوشی میں ہمیشہ ہر جگہ ضرور نظر آتے اور ان کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی کہ خوشی کا کوئی موقع بے شک رہ جائے لیکن دوستوں کے غم اور دکھ کے معاملے میں ضرور شامل ہوا جائے۔ ہمارے محترم دوست افتخار مجاز اور ان کے بڑے بھائی معروف شاعر اعزاز احمد آذر ان سے بہت محبت سے پیش آتے اور ان کا بہت احترام کرتے اور بلاشبہ انھیں پی ٹی وی کے کئی پروگرامز میں شامل کرنے کا کریڈٹ بھی افتخار مجاز ہی کو جاتا ہے۔ مجھے بھی اپنے کئی

پروگرامز میں اظہر جاوید کو بلانے کی سعادت حاصل ہوئی وہ میری گزارش پر میرے کئی پی ٹی وی پروگرامز میں شامل ہوئے اس معاملے میں مجھے تحریک دینے والے بھی افتخار مجاز ہی تھے...... بہرحال...... نہایت ہی خوب صورت شخص تھے اظہر جاوید، ایک زمانہ ان کی شخصیت کا اسیر اور گرویدہ تھا۔

''خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں''

1988 سے 1995 کے دوران میری شاعری ''تخلیق'' میں چھپتی رہی اس کے بعد بوجوہ میرا رابطہ ''تخلیق'' سے قائم نہ رہ سکا۔ کچھ عرصہ قبل جب میں نے اظہر جاوید صاحب کو نظم و غزل اور دوہا کے ممتاز شاعر محمود علی محمود (ساہیوال) کی رحلت سے آگاہ کیا تو مجھ سے فرمانے لگے کہ یار! ''تخلیق'' کے لئے ان پر کوئی مضمون لکھ کر مجھے بھجواؤ۔ میں نے چند ہی دنوں بعد ان کے حکم پر عمل پیرا ہوتے ہوئے محمود علی محمود کی شخصیت اور شاعری پر ایک مضمون لکھ کر انھیں بھجوایا تو انھوں نے نہ صرف اسے پسند کیا بلکہ ''تخلیق'' میں شائع بھی کیا ''تخلیق'' میں چھپنے والی یہ میری پہلی نثری تحریر تھی۔ بعد ازاں ''انجمن خیال'' کے عنوان سے شائع ہونے والے خطوط میں ڈاکٹر انور سدید، انوار فیروز اور دیگر اہل قلم نے میری اس نثری کاوش کی ستائش کی اور مجھ سے توقع بھی ظاہر کی کہ ایسے ہی دوسرے بہت سے اہل قلم کے بارے میں بھی میں ضرور لکھوں، سو اس کے بعد حضرت جوہر نظامی اور جعفر شیرازی جیسے جید شعراء کے بارے میں بھی میرے مضامین ''تخلیق'' میں شائع ہوئے۔ علاوہ ازیں میری شاعری بھی اس دوران ''تخلیق'' کے صفحات پر پھر سے جگہ پانے لگی۔ یہ انداز دل پسند تھا جناب اظہر جاوید کا جو ہم جیسے ادب کے ادنیٰ طالب علموں کے لئے بھی بہتر رہنمائی، حوصلہ افزائی اور فراخدلانہ رویوں کی پاسداری کا ہمیشہ اہتمام کرتے رہے۔

جناب اظہر جاوید نے تقریباً 73 سال کی عمر پائی اور وہ اس عمر میں بھی جوانوں کی طرح متحرک نظر آتے رہے اور تر و تازہ سوچوں اور ایسے ہی جذبات کے حامل رہے۔ یہی تر و تازگی زندگی بھر ان کی ہمسفر رہی سوچ کا یہی بانکپن ان کی شعری اور نثری تخلیقات میں بھی تمام عمر جاگزیں رہا۔ وہ صاف ستھری سوچوں کے مالک تھے۔ وضع داری، ملنساری، اچھے میل ملاپ اور عمدہ رکھ رکھاؤ کی وجہ سے وہ زندگی کے تمام شعبوں اور حلقوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی نظروں میں بہت احترام کے منصب پر فائز رہے۔ ہمیشہ ادب ہی ان کا اوڑھنا بچھونا رہا اور ادبی خدمت کے اس طویل سفر کو انھوں نے تمام زندگی دے دی۔ ان کی انھی خدمات کے صلے میں حکومت پاکستان نے انھیں صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی سے بھی نوازا جو کہ حکومتی سطح پر بھی ان کی اعلیٰ خدمات کا اعتراف ہے۔

وہ ایک درویش منش آدمی تھے جو چپ چاپ اور فقیرانہ انداز میں اپنی زندگی گزار گئے اور عمر بھر کبھی کسی کے سامنے اپنی ضرورتوں کا رونا نہ روکر، اطمینان قلب کے ساتھ اللہ رب العزت کی بارگاہ میں اظہارِ تشکر کرتے رہے۔ اظہر جاوید جیسے لوگ اب خال خال ہی کہیں ہوں گے جو دوسروں کو شہرت، عزت اور کامیابی کے اعلیٰ زینوں پر دیکھنے کے آرزومند ہو سکتے ہیں۔

◆◆◆

''آپ کے مجموعۂ کلام کا لکھا ہوا، آپ کا اپنا ابتدائیہ پڑھ کر پرانی فرمائش (گزارش) پھر دہراتا ہوں
اپنی آپ بیتی لکھ چھوڑیں حضرت!'' مشفق خواجہ

عجیب مانوس اجنبی تھا

خالدہ احسان

یہ کوئی سات آٹھ سال پہلے کی بات ہے کہ میں ڈیوٹی روم میں تھی کہ پروڈیوسر سہیل بسرا ادھر سے گزرے اور مجھے دیکھ کر ڈیوٹی روم میں آ گئے۔ایک میگزین میری طرف بڑھاتے ہوئے کہنے لگے''اس میں میرا افسانہ چھپا ہے۔ضرور پڑھیں،آپ کو اچھا لگے گا''۔میں نے وہ میگزین پکڑتے ہوئے پڑھنے کا وعدہ کر لیا۔میری پہلی نظر میگزین کے نام پر پڑی۔''تخلیق''۔ذہن میں ایک ہلکی سی جنبش ہوئی۔پہلا صفحہ اُلٹا تو ایڈیٹر کا نام تھا''اظہر جاوید'' مجھے یاد آ گیا کہ چند سال پہلے جب میں صبح کا پنجابی پروگرام''راوی رنگ'' کرتی تھی (جس کی پروڈیوسر شائستہ حبیب مرحومہ تھیں) تو سکرپٹ اظہر جاوید صاحب کا لکھا ہوا ہوتا تھا۔وہ رس بھری باتیں،محبت سے بھرپور جذبے،معاشرے کی بے راہ روی،رشتے ناطوں کی ناپائیداری کے علاوہ شعروشاعری بھی ہوتی تھی،جس میں صوفی شعراء کا کلام شامل ہوتا۔سکرپٹ پڑھتے ہوئے مزہ آ جاتا۔پروگرام ختم ہوتا۔میں ڈیوٹی روم میں آتی جہاں شائستہ حبیب موجود ہوتی تھیں۔ایک روز میں اندر داخل ہوئی تو شائستہ کہنے لگی''لو وہ آ گئی اے تسی آپ ای گل کر لو'' اور فون مجھے پکڑا دیا۔دوسری طرف بہت ہی جاندار،زندگی سے بھرپور آواز تھی۔''کڑیئے،توں تے لفظاں وچ جان پا دینی ایں''۔اور میں کھلکھلا کر ہنسنے لگ گئی۔''ہسدی وی چنگا ایں'' ایک فنکار کے لئے اس سے زیادہ خوشی کی اور کیا بات ہو سکتی ہے کہ اس کے فن کی تعریف کی جائے۔بس اسی طرح وقت گزرتا گیا،ایک آدھ دفعہ غالباً شائستہ حبیب صاحبہ ہی کے کمرے میں اظہر جاوید کو دیکھا بھی۔لیکن زیادہ بات نہ ہو سکی۔آج جب یہ میگزین دیکھا تو وہ الفاظ اور چہرہ نظروں کے سامنے گھوم گیا۔

سہیل بسرا نیا پروڈیوسر تھا۔اس کی حوصلہ افزائی بھی ضروری تھی۔اس کا وہ افسانہ،اس کی یونیورسٹی کے دنوں کی کھٹی میٹھی کہانی تھی۔جو اپنے روایتی انجام کو پہنچی۔محبت کا انجام بچھڑنا ہی لکھا ہوتا ہے۔چاہے مر کر ہی بچھڑا جائے۔اس سے پہلے کہ میں وہ افسانہ ختم کر کے میگزین واپس کرتی،میں نے شروع سے صفحات پلٹنے شروع کئے''اپنی بات'' سیدھی دل میں اتر گئی۔کیا لفظوں کا چناؤ تھا۔اندازِ بیان،اندازِ تحریر ایسا بھرپور کہ متاثر ہوئے بنا رہا نہ جائے۔اور وہ سچی اور کھری بات،نہ کسی کا خوف نہ ڈر،زمانے اور وقت کے گھاؤ سہتے ہوئے۔حالات کے ہاتھوں تنگ،باتوں میں شکوہ ضرور تھا لیکن کسی سے کچھ مانگا نہیں،کسی کی منت نہیں کی،کسی کی خوشامد نہیں کی۔کسی کی بے جا تعریف نہیں کی۔فقرے ایسے کاٹ دار کہ مزہ آ گیا۔ایک ایسا شخص اس میں جھلکا کہ جس کی انا ہی سب کچھ تھی۔جس نے سچ کا جھنڈا اٹھا رکھا تھا۔جنوں کی حد تک اپنے حق کے لئے لڑنے والا اور اپنے میگزین سے بے پناہ عشق۔مجھے تو یوں لگا کہ شاید یہ میرے بھی دل کی بات تھی۔

اب مجھے بھی یہاں ملازمت کرتے ہوئے دس سال سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا تھا۔میں بھی معاشرے کی ناانصافیوں، حق تلفیوں اور دفتر کی پریشانیوں سے تنگ تھی۔میں نے دوسرے ہی دن رسالے سے فون نمبر نوٹ کیا اور کھٹ سے فون کر دیا۔ادھر سے آواز آئی''جی

اظہر''ایک لمحے کے لیے تو میں گنگ سی ہوگئی۔ کہ کیا کہوں۔ پھر تھوڑی سی ہمّت کر کے میگزین کی بات چھیڑ دی اور ''اپنی بات'' کی بے حد تعریف کی اور پوچھا کہ یہ رسالہ مجھے ہر ماہ کہاں سے مل سکتا ہے۔ کہنے لگے'' آپ اپنا نام اور پتہ بتا دیں آپ کو رسالہ مل جایا کرے گا''۔ میں نے کہا کہ میرا کوئی نام نہیں ہے اور نہ کوئی پتہ ہے۔ آپ بک سٹال کا پتہ دیں میں وہاں سے لے لیا کروں گی''۔ فرمانے لگے۔ ٹھیک ہے۔ ٹولنٹن مارکیٹ (پرانی انارکلی) کے برآمدے میں ایک کتابوں کی دکان ہے وہاں سے مل سکتا ہے''۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور فون بند کر دیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں نے کوئی بہت بڑا پہاڑ سر کر لیا ہو۔ کوئی معرکہ مار لیا ہو۔ اتنے بڑے آدمی سے بات کر لی ہے۔ دراصل یہ ''اپنی بات'' کا اثر تھا۔

گھر آ کر تین چار روز میں وہ سارا رسالہ پڑھ ڈالا۔ ہر مضمون بہت جاندار تھا۔ مکمل معیاری ادب، لکھنے والے بھی نامور، شعر و شاعری کا حصہ بھی دل میں اتر تا گیا اور سب سے مزے دار حصہ ''انجمن خیال'' تھا۔ بس اسی جوش میں ایک لمبا چوڑا خط لکھ ڈالا۔ جس میں اپنے ادارے کی خامیاں، اپنے دکھ، پریشانیاں اور پتہ نہیں کیا کیا لکھ ڈالا۔ لیکن اپنا نام پتہ نہیں لکھا۔ اب دل میں کچھ بے چینی سی رہی کہ پتہ نہیں خط مل بھی گیا ہے یا نہیں۔ ایک دن پھر فون کیا۔ تو کہنے لگے'' اچھا، اچھا تو آپ کا خط تھا وہ۔ جس ادارے کا آپ نے ذکر کیا ہے وہ بے وقوف ریڈیو والے تو نہیں''۔ میں نے فوراً پوچھا'' آپ نے کیسے پہچانا۔''بی بی، میں یہاں گھاس کاٹنے تو نہیں بیٹھا ہوا نا''۔ ''خوب پہچانا آپ نے'' پھر میں نے ان کی کتابوں کے نام پوچھے کہ میں پڑھنا چاہتی ہوں۔ انہی دنوں غالباً شاعری کی کتاب ''غمِ عشق گر نہ ہوتا'' چھپ کر آئی تھی، پھر کہانیوں کی کتاب ''بڑی دیر ہوگئی''، ''حضرت رابعہ بصریؒ'' اور ایک کتاب کہانیوں کا ترجمہ تھی (جو مجھے نہیں ملی) سب کتابیں میں نے مختلف دکانوں سے جا کر خریدیں، بار بار پڑھیں۔ مجموعۂ کلام کا تو ہر شعر دل پر اثر کرتا گیا اور میں اشک بار ہوتی رہی ع

''کاش کوئی میرا بھی گھر ہو، کاش کبھی گھر لوٹوں میں''

پتہ نہیں اس مصرعے کے کیا محرکات تھے۔ کیا سیاق و سباق تھا کہ میں روتی ہی جاتی۔ بہت بعد میں جا کر یہ بھید کھلا کہ یہ سب کچھ مجھ پر بھی بیتی تھی۔ یہ واردات میرے ساتھ بھی ہوئی تھی۔ یہ سلسلہ کہ کبھی خط اور کبھی ٹیلی فون زیادہ دیر نہ چلا۔ اور میں بے قرار ہو کر ایک دن اپنی ایک دوست (جو آفس میں ساتھ کام کرتی تھی) کو لے کر ''تخلیق'' کے دفتر چلی گئی۔ ایک بہت ہی مہذب، پروقار، خوش لباس اور مسکراتے شخص نے کھڑے ہو کر ہمارا استقبال کیا اور ہاتھ کے اشارے سے ہمیں صوفے پر بیٹھنے کو کہا۔ یہ ہماری پہلی باقاعدہ ملاقات تھی۔ میں ان کی تحریر کی اسیر تھی۔ وہ لفظوں کے جادوگر تھے۔ شیشے میں اتارنا کوئی ان سے سیکھے۔ ان کی کہانیوں کی کتاب ''بڑی دیر ہوگئی'' پڑھنے کے بعد مجھے لگا جیسے ان کی زندگی تو ایک کھلی کتاب کی طرح ہے۔ ہر کہانی ان کی اپنی ذات کے گرد ہی گھومتی ہے۔ میں جب بھی جاتی ہر کہانی ''ڈس کس'' کرتی۔، سب نام چونکہ فرضی تھے۔ پھر بھی بہت سے کرداروں کو میں نے پہچان لیا۔ جب میں پوچھتی تو کہتے'' یہ تو امانت ہے۔ کسی کا راز ایک امانت ہوتا ہے۔ یہ میں نہیں بتاؤں گا''۔ بعض دفعہ میں ناراض بھی ہو جاتی۔ لیکن وہ پھر بھی نہ بتاتے۔ صرف ایک نام بتایا جو کہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ جس کے نام پر کتاب ہے''بڑی دیر ہوگئی'' میں نے ایک دن یاد دلایا کہ جب میں شروع شروع میں ریڈیو پر ڈراموں میں حصہ لیتی تھی۔ اردو اور پنجابی بہت سے ڈرامے کئے۔ تو آپ نے ایک دن ریڈیو پر ہی میرا انٹرویو کیا تھا۔ جو شائد ''تخلیق'' میں چھپا تھا۔ ان کو تو غصہ آ گیا۔ کہ ایسے فضول انٹرویو وغیرہ ''تخلیق'' میں نہیں چھپتے۔ پھر خود ہی یاد کر کے بتانے لگے کہ ہاں شاید ''امروز'' کے میگزین میں چھپا ہوگا۔ جو مجھے بھی یاد نہیں تھا۔

وقت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ وہ اپنی چال چلنے سے باز نہیں آتا۔اچانک میرے شوہر کا ہارٹ اٹیک سے انتقال ہوگیا۔ میں بکھر کے رہ گئی۔ میرا بیٹا چونکہ ملک سے باہر ملازمت کرتا تھا، جو مجھے کسی صورت، کسی حال میں بھی یہاں رکھنے پر راضی نہ ہوا اور اپنے ساتھ ابو ظہبی لے گیا۔ ہم سفر تو چھٹ ہی گیا تھا، میں اکیلی رہ گئی تھی۔ اپنا وطن بھی چھوٹا۔ (مجھے پاکستان سے بے حد محبت ہے) ملازمت (جو میرا شوق تھا) چھوٹی، گھر بھی ٹوٹا اور چھوٹا۔ اپنے ساتھی، غمگسار، بہن بھائی سب چھوٹ گئے اور میں دیارِ غیر میں جا کر اجنبی لوگوں میں حیرت زدہ سی رہنے لگی۔ صرف ایک بات ضرور مان لی گئی کہ سال میں ایک مرتبہ دو تین ماہ کیلئے پاکستان جایا کروں گی۔ اور یہی دوری مجھے اظہر صاحب کے زیادہ قریب لے آئی۔ لیکن میں اس ہجوم میں شامل نہیں ہوئی جو ان کے گرد ''حسیناؤں'' اور ''محبوباؤں'' کا تھا۔ کیونکہ یہ ان کے Pet لفظ تھے جو وہ سب کے لیے کہتے تھے۔ کیونکہ نہ میں ادیب تھی نہ شاعرہ نہ ان کے حلقہ احباب میں شامل تھی۔ میں تو ان کے قلم کی اسیر تھی۔ ہمارے ملک کی ایک بڑی ادیبہ نے ایک سچے شاعر کے بارے میں کیا صحیح جذبات لکھے ہیں جو اظہر جاوید صاحب کی صحیح عکاسی کرتے ہیں۔

> ''جب کوئی شخص بستیوں میں اجنبیوں کی طرح پھرتا رہے اور لڑکیوں سے محبت کرتا رہے۔ تو پھر وہ شاعر بن جاتا ہے اور شاعر وہ شخص ہوتا ہے۔ جو ارد گرد کو تو اپنے اندر تحلیل کر لے۔ لیکن خود کسی محلول میں حل نہ ہو۔ شاعر نہ محبوبہ میں حل ہوتا ہے۔ نہ ماحول میں۔ نہ حالات میں گھلتا ہے۔ نہ معمولات میں۔ جیسے صدیوں قرنوں ...... پانی کے اندر یورنیم کی ڈلی آس میں پڑی رہے کہ ایک دن وہ پانی کا حصہ بن جائے گی۔ لیکن کئی جگ بیتنے کے بعد بھی وہ اسی طرح رہے گی۔ شاعر میں نہ حل ہونے کی خاصیت اس کی انا سے پیدا ہونے والی تنہائی سے جنم لیتی ہے۔ اسی لئے وہ وصل اور فراق میں یکساں تڑپتا ہے۔ اور آسودگی اور بے مائیگی میں ایک سا بے چین رہتا ہے۔ وہ محفل میں چلا بھی جائے پھر بھی اکیلا ہی رہے گا اور محبوب سے وصل ہو بھی گیا تو بھی فرقت کے صدمے اٹھاتا رہے گا۔ اسی تنہائی کے آسمان پر شاعری کے ستارے چمکتے ہیں۔ اسی تنہائی کے ویران اور ٹھنڈے کنویں سے تخلیقی عمل جاری ہوتا ہے۔ یہی وہ تنہائی ہے جس میں شاعری کے غزال اپنے مُشک کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں''۔

جب میں نے یہ پڑھا تو میری نظروں کے سامنے اظہر جاوید صاحب ہی کی تصویر ابھر کر آئی۔ وہ ایک خوددار انسان تھا۔ انا تو ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ رشتے ناطوں کو بھی نبھانا جانتے تھے۔ ان کی ذات کے بارے میں جتنی مرضی گفتگو ہو جاتی۔ لیکن اپنی ذات سے جڑے لوگوں کے بارے میں زیادہ بات چیت پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ دوستوں کے دوست تھے۔ ہر جذبہ ان کے اندر شدید تھا۔ عشق، دوستی، شاعری، کہانی، ہر کام پوری شدت سے کرتے۔ سب کچھ پا لینے کے بعد بھی پتہ نہیں کس چیز کی کمی تھی کہ اب بھی وہ کسی تلاش میں تھے۔ شائد پایا کم اور کھویا زیادہ۔

ان کی سب کتابیں ''بڑی دیر ہوگئی''، ''ناکام محبت......ساحر لدھیانوی''، قتیل شفائی کی آپ بیتی ''گھنگھرو ٹوٹ گئے''، جس کا پیش لفظ اظہر صاحب نے لکھا۔ ''حضرت رابعہ بصریؒ، مجموعہ کلام ''غمِ عشق گر نہ ہوتا''، اور محترمہ بےنظیر بھٹو کے بارے میں لکھی ہوئی کتاب ''موت میرے تعاقب میں'' اور سالہا سال کے ''تخلیق'' میرے پاس موجود ہیں۔ کہانیوں کی کتاب میں بار بار پڑھتی ہوں۔ یوں لگتا ہے جیسے اظہر صاحب سے بات چیت ہو رہی ہو۔ ان کا اندازِ تحریر وہی ہے جو ان کا انداز گفتگو تھا۔

مجھے باقاعدگی سے ''یو اے ای'' میں ''تخلیق'' ملتا رہا۔ میں فون کرتی رہی۔ پاکستان جاتی تو دو ملاقاتیں تو ضرور ہوتیں۔ ایک

وہاں پہنچنے پر، اور ایک واپسی پر۔ اب بھی ایک ماہ پہلے میں آنے سے پہلے ان کے آفس گئی۔ وہی ہشاش بشاش چہرہ، وہی رس بھری باتیں، باتوں میں وہی چمک اور شوخی۔ وہیں سحر حفیظ سے بھی ملاقات ہوئی۔ ایک تازگی کا احساس ہوا۔ سب نے مل کر چائے پی۔ پھر آنے کا وعدہ کر کے میں چلی آئی۔ لیکن دوبارہ جا نہ سکی۔ ایئرپورٹ سے فون کیا اور معذرت کی کہ میں پھر نہیں آ سکی۔ آواز میں کچھ شکوہ سا تھا ''کڑیے رکشہ پھڑ نا سی تے آ جانا سی'' میں نے پوچھا ''وہ سحر بیٹھی ہے''؟ ''لے توں اودے نال گل کر لے''۔ اور فون سحر کو پکڑا دیا۔ وہ بھی کہنے لگی ''آپ نے تو وعدہ کیا تھا کہ جانے سے پہلے مل کر جاؤں گی۔ آ جاتیں تو اچھا تھا''۔ میں نے پھر معذرت کی اور کہا ''اچھا سحر اپنا بھی خیال رکھنا اور اظہر صاحب کا بہت خیال رکھنا''۔ کہنے لگی ''جی، ان کا خیال میں آپ کی امانت سمجھ کر رکھوں گی''۔ اور خدا حافظ کہہ کر فون رکھ دیا۔ بس یہ آخری گفتگو تھی۔ اس دن ویلنٹائن ڈے بھی تھا۔ میں ہمیشہ ہی Velentineday پر فون کرتی تھی اور جب ''تخلیق'' ملتا تب بھی۔ اس مرتبہ بھی ہمیشہ کی طرح نمبر ملایا۔ تو دل میں تھا کہ ابھی آواز آئے گی۔ ''جی اظہر'' لیکن کسی نے کہا ''ہیلو''۔ میں نے سمجھا غلط نمبر مل گیا ہے۔ یا کسی اور نے فون اٹھا لیا ہے۔ ''کیا یہ اظہر جاوید صاحب کا نمبر نہیں''۔ ادھر سے آواز آئی۔ ''آج صبح ان کا انتقال ہو گیا ہے''۔ ''دیکھیئے آپ مجھ سے مذاق نہ کریں۔ ایسا نہیں ہو سکتا''۔ ''جی میں ان کا بیٹا بول رہا ہوں''۔ میرا تو دل اچھل کر میرے حلق میں پھنس گیا۔ میں گنگ ہو گئی، پھر پتہ نہیں کتنی ہی دیر میں یونہی گم صم بیٹھی رہی۔ لیکن یقین نہیں آیا۔ دو تین دن کے بعد اسی نمبر پر دوبارہ فون کیا...... دل آج تک نہیں مانتا۔ اتنا زندہ دل شخص، ہنستا کھیلتا، دوسروں کے دُکھ درد سنتا۔ دلجوئی کرتا۔ کیسے سب کو چھوڑ کر جا سکتا ہے۔ لیکن شائد بچھڑنا ہی حقیقت ہے۔ یہی اٹل ہے۔ انہی کی ایک نظم پر ختم کرتی ہوں۔

اداسی چار سو ''بینر'' لگاتی پھر رہی ہے۔
الوداعی کے
دکھوں نے شہر کے سب راستوں پر
بچھڑ جانے کے نوحے لکھ دیئے ہیں
ہزاروں خواب رخصت ہو رہے ہیں
کوئی پیمان!
آنسو بن کے آنکھوں میں
کسی دلدار لہجے کو ترستا ہے
خدا جانے مسافر کب پلٹتا ہے
اب ''کبھی نہیں''، ''کبھی نہیں'' اور ''کبھی بھی نہیں''۔

◆◆◆

ڈاکٹر وصی مکرانی واجدی (نیپال)

اظہر جاوید کی نذر

وہ ایک شخص جو تنہا تھا انجمن جیسا
وہ ایک پھول شگفتہ تھا جو چمن جیسا

وہ کیا گیا کہ جہانِ ادب ہوا سونا
لگا ادب کے مہ و مہر پہ گہن جیسا

کبھی جہانِ ادب میں وہ روح کی مانند
کبھی دماغ، کبھی دل، کبھی بدن جیسا

زبان و فکر و نظر کے فروغ کی خاطر
رکھا ہے عمر بھر خود کو سدا رہن جیسا

وہ کائناتِ سخن کی بساط پر ہر سُو
رہا جو گھر، کبھی ایوں، کبھی صحن جیسا

وہ جس نے ذرّے کو ہے مثلِ ماہتاب کیا
زمیں کی گود میں لگتا تھا جو لگن جیسا

وہ اور کیسے تھے، مجھ کو نہیں پتہ لیکن
نہیں کسی کا وصی من ہے ان کے من جیسا

OOO

لطیف قریشی (مسقط)

اظہر جاوید کی نذر

تیرے ہجر کی آگ میں جلتے
اور برس اِک بیت گیا
قریہ قریہ، کوچہ کوچہ
تجھ کو ڈھونڈا
پھر بھی تیرے وصل کی لذّت
ترے بدن کی خوشبو سے
محروم رہا!
یونہی تیرے ہجر میں جلتے
اور برس اِک بیت گیا

OOO

سلسلے محبتوں کے

دوستوں کے دوست اظہر جاوید کے خطوط ـــــ معاصرین کے نام

افسانہ نگار تسنیم منٹو کے نام

محترمہ تسنیم منٹو صاحبہ!

حیرت کی بات ہے......''ذراسی بات'' نے بھی چونکا دیا ہے۔ سوچ رہا ہوں، آپ اتنا عرصہ ادب سے دُور اور لاتعلّق کیوں رہیں......؟

عجیب اتفاق ہے......اتفاق نہیں کہنا چاہیے۔ امرواقعہ لکھنا چاہیے......کہ ادب میں بے شمار ایسے لوگ موجود ہیں، جنہیں بہت عرصہ پہلے لکھنا چھوڑ دینا چاہیے تھا......اور کئی ایسے ہیں، جنہیں بہت پہلے سے لکھنا چاہیے تھا، دوسری بات آپ پر صادق آتی ہے۔

سیاست، صحافت، وکالت اور کئی ایسے دوسرے کام لوگوں کے ذوقِ سلیم کو مار دیتے ہیں، شعر و ادب سے بیگانہ کر دیتے ہیں۔ آپ اتنا زمانہ، سیاست میں رہیں، پھر بھی ادب کی چنگاری تابندہ رہی۔

اللہ کریم آپ کو حوصلہ اور ہمّت دے......ایسی اور اس سے بھی اچھی بے حساب کہانیاں اور لکھیں، اور میرے جیتے جی کتاب بھی شائع کروالیں۔

یہ نیا سفر مبارک ہو اور میری اس مبارک میں عابد منٹو صاحب کو بھی شریک کریں۔

رب راکھا، آپ کا......**اظہر جاوید**

21-05-1995

....

افسانہ نگار سیما پیروز کے نام

سیما جی!

لفظوں، حرفوں، جملوں اور فقروں کو سنوارتے نکھارتے اک عمر ہوگئی ہے۔ تعریف بھی لکھی ہے، تحسین بھی کی ہے۔

مگر کبھی کبھی ایسا وقت بھی آ جاتا ہے، (جیسا، اب آیا ہے) کہ نہ لفظ قابو میں آتے ہیں، نہ کوئی جملہ گرفت میں۔

آپ اکثر مہربانی (مہربانیاں) کرتی رہتی ہیں اور میں بدلے میں آپ کے لئے کبھی کچھ بھی نہیں کر سکا۔ آپ نے جس اہتمام سے میرے اعزاز میں کھانا رکھا۔ اس سے میں خوش بھی بے انتہا ہوا، اور اداس بھی بے شمار......

آپ اور آپ کا سارا گھرانہ......قاضی صاحب......عمر،نوشی اور باقی بچیاں بھی،اور دوسرے گھر سے آئی ہوئی پیاری بیٹی ثمینہ سے بھی، جتنا پیار ملتا ہے، میں تو اپنی بے ثباتی کی وجہ سے اُسے ٹھیک سے سنبھال بھی نہیں سکتا۔

میں اس وقت بھی جذباتی ہوں،اور آپ کی عنایت کے وفور میں یوں، کہ خط بھی سلیقے سے نہیں لکھا جارہا......شاید یہ بھی زندگی میں پہلی بار ہے، کہ اپنی تحریر ہی میں کاٹ چھانٹ کررہا ہوں۔ میں نے تو مضمون لکھتے ہوئے کبھی کسی فقرے کو نہیں کاٹا۔ خداوندِ کریم آپ ایسے دوستوں کو سلامت رکھے کہ حاسدوں اور منافقوں کے ہجوم میں کوئی تو سچے جذبوں کا رکھوالا ہے۔

شاد آباد رہیں۔ شکریہ بے حد شکریہ۔

رب راکھا،آپ کا......**اظہر جاوید**

01-07-2006

....

نقاد،انشائیہ نگار جمیل آذر کے نام

محترم جمیل آذر

میں شرمسار ہوں، میرے خط میں آپ کو شکایت کے ساتھ خفگی بھی محسوس ہوئی۔ یہ میری بدنصیبی ہے......تحریر کا سلیقہ نہیں اور انشائی تحریر تو بالکل نہیں آتی۔

آپ محترم ہیں اور کرم فرما بھی......''تخلیق'' کا خیال رکھتے ہیں۔ بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ آپ کا مضمون ہو اور ''تخلیق'' میں نہ چھپے......بس ترتیب اور مناسبت کا مرحلہ آپڑتا ہے۔ ناشر والے مضمون اور صائمہ کے لئے لکھے ہوئے مضمون میں بھی یہی اڑچن آئی...... اب ''یہ والا'' چھپے گا،تو وہ دونوں اور پیچھے چلے جائیں گے۔

میں معذرت خواہ ہوں......میرے خط نے غلط تاثر دیا۔فوٹوسٹیٹ والی بات الگ ہے۔شاد آباد رہیں۔

رب راکھا،آپ کا......**اظہر جاوید**

16-08-2011

....

افسانہ نگار خاقان ساجد کے نام

محترم خاقان ساجد صاحب!

عجیب کشمکش میں ہوں......صبح سے خود کو یقین دلانے کی کوشش کررہا ہوں، کہ یہ آپ کی تحریر کا کمال نہیں۔

میں بوڑھا ہوگیا ہوں اور رقیق القلب بھی۔

''لوٹ آؤ'' پڑھا،تو آنکھیں بھیگ گئیں......بہت پہلے جب ''تخلیق'' میں آپ کی پہلی کہانی چھپی تھی، (نام یاد نہیں، ملتان شہر کا ذکر تھا) تب بھی میں کہانی پڑھ کر رو دیا تھا۔ پتا نہیں میرے ایسے لوگ جو ٹوٹتے رشتوں اور کچلے مَسلے جذبوں کی زد میں رہتے ہیں،انہیں آپ کا قلم چھو لیتا ہے،تحریر انہی کی رُوح و جاں میں اُتر جاتی ہے۔

میں آپ کو سچ بتاؤں، یہ کوئی ''مدیرانہ شان'' نہیں، بے ترتیب مصروفیت کا عالم ہے۔ میں بہت کم یا شاذونادر ہی کسی کی تحریر پڑھ

کرا ُسے اتنی جلدی ردِعمل بھیج رہا ہوں۔آپ اسے اپنی خوبی نہ سمجھ لیں، میری کمزوری جان کر ٹال دیں۔

بہر کیف۔اچھی کہانی لکھنے پر مبارک۔بہت مبارک۔

شاد آباد رہیں۔اپنے پڑوسی ''کرنیلوں'' محمد دین ملک اور ابدال بیلا کو میرا سلام کہیں، اور اس تحسین سے بھی آ گاہ کریں۔

رب راکھا، آپ کا......**اظہر جاوید**

02-08-2008

....

شاعرہ، کالم نگار حمیرا راحت کے نام

محترمہ حمیرا راحت!

عرصہ ہوا آپ کی طرف سے ''پیام رومی'' ملا تھا میں نے سنبھال کر ایک طرف رکھ دیا کہ دنیا داری کی قباحتوں سے بچ کر اس کے مطالعہ کا سفر اختیار کروں گا۔

آپ جانتی ہیں، عداوتِ زمانہ، دامن کشاں رہتی ہیں۔ہماری بدنصیبی ہی ہے، ہم روحانیت اور تصوّف سے دور ہو گئے ہیں۔ کہنے کو ہمارے علماء کرام روحانیت کا درس دیتے ہیں، مگر کاش، وہ اس کی روح تک خود بھی پہنچے ہوتے۔تصوّف کو ہم نے سیمینار اور کانفرنسز کی نذر کر دیا ہے۔میں حیران ہوتا رہا اور ایک خوش نوا شاعرہ، اس کم عمری میں اتنی لگن سے ایک مشن جاری رکھے ہوئے ہے، حیرت، واقعی حیرت!

خداوند کریم آپ کو استقامت دے اور ہمیں ندامت سے نکالے، ہم کیوں نہ ایسا کام کر سکے۔جریدہ ''پیام رومی'' پر کہیں کوئی قیمت نہیں لکھی جاتی۔(قیمت، جسے ہدیہ کہنے کی تلقین ہوتی ہے)۔

آپ کرم فرمائیں تو کچھ اور شمارے بھجوا دیں، چاہیں تو وی پی کر دیں ''تخلیق'' سے بھی آپ کا رابطہ ٹوٹا ہوا ہے۔

شاد و آباد رہیں۔ یامین اختر کے اس مصرعے نے گرفت میں لے لیا:

نہ ختم ہو سرِ منزل کبھی کسی کا سفر

یہ دعا آپ کے لئے بھی ہے

راب راکھا، آپ کا......**اظہر جاوید**

16-06-2000

◆◆◆

''حیران ہوں، 'تخلیق' تمھارے دم سے زندہ ہے یا تم اس کے سہارے؟ تمھاری ایک نظم کے مصرعے کو مَیں اپنی آپ بیتی کا عنوان بنانا چاہتا ہوں۔تمھیں اعتراض ہے یا خوشی، بتا دینا۔عنوان ہے ''زندگی کا سفر ختم ہوتا نہیں۔'' (**حمید اختر**)

قندِ مکرّر

اپنی بات

''پچھلے دنوں اخبارات میں ایک چھوٹی سی خبر چھپی تھی کہ سارتر کو سرِ بازار ایک اخبار بیچتے ہوئے گرفتار کرلیا گیا۔حکومت فرانس نے اس نظریاتی اخبار کی اشاعت اور فروخت پر کچھ پابندیاں نافذ کی تھیں۔سارتر نے نہ صرف اُس حکم کی مخالفت کی، بلکہ احتجاجاً وہی اخبار لے کر بازار میں آ کھڑا ہوا...... یہ اظہار وافکار کی آزادی کے لئے ایک جرات مندانہ اقدام تھا۔دیکھیں تو واقعی یہ چھوٹی سی خبر ہے...... سوچیں تو یہ ایک ایسا آئینہ ہے جسے دیکھ کر تمام دُنیا کے ادیبوں، شاعروں اور دانش وروں خصوصاً پاکستانیوں کو اپنے اعمال وافعال کا جائزہ لینا چاہیے۔

علم ودانش کی سطح پر نظریات کی جنگ ہمیشہ جاری رہی ہے۔اچھے اور بُرے نظریے کی بحث بھی ہر دَور میں چلتی رہی ہے۔مگر مسئلہ تو یہ ہے کہ آپ اپنے نظریئے، اپنے فکر اور اپنے خیال کا کُھل کر اعلان تو کریں۔جب ایک نظریئے پر پورے وثوق اور سچائی سے اعتماد بلکہ ایمان راسخ ہوجاتا ہے، تو اُس کے ذکر، اس کے پرچار اور اُس کے اظہار میں ہچکچاہٹ کیسی اور اس سے اجتناب کیوں؟

میں پاکستان کے نامور لکھنے والوں کا نام لئے بغیر عرض کروں گا کہ آئیں اور سارتر کا مسلک اپنائیں...... میں جانتا ہوں، وہ لوگ جو میرے مخاطب ہیں، یہ پسند نہیں کریں گے۔کہ نام لے لے کر انھیں ان کا فرض یاد دلایا جائے۔وہ خود اپنے رویّے کو کھنگالیں گے۔اور یقیناً ایک واضح اور واشگاف انداز سے سامنے آئیں گے۔وقت کا تقاضا یہی ہے۔وقت کی آواز یہی ہے۔ورنہ یہ نہ ہو کہ اُن کے پیروکار کل اُن سے احتساب کے لہجے میں بات کریں۔''

اظہر جاوید

(جلد نمبر1، شمارہ7,8، 1970)

....

''گزشتہ ''تخلیق'' کا اداریہ کچھ یوں تھا:

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم''

''اپنی بات کاغذ کی قلت کی نذر ہے''۔

کچھ دوستوں نے اس ایک سطر میں چھپے ہوئے مطالب ومعانی کے سمندر کو محسوس کیا اور سراہا۔کچھ لوگوں نے اسے سرسری سا لیا اور نظر انداز کر دیا۔کچھ احباب نے اِسے ندرت سے تعبیر کیا۔مگر چند ایک کے نزدیک یہ نہ لکھ سکنے کا ایک ''خوبصورت بہانہ'' تھا۔آج...... جب میں پھر اپنی بات لکھنے بیٹھا ہوں تو اچانک آخری رائے سوچ کے پردوں میں ایک پھانس بن کر اٹک گئی ہے...... میں سوچنے لگا، میں

سوچ رہا ہوں کہ میں کیا لکھوں......کس موضوع پر لکھوں۔کس کے لئے لکھوں؟

کیا میں پھر وہی روایتی رونا روؤں کہ ادبی پرچوں کو اس دَور میں زندہ رکھنا، اعجاز ہے۔یا پھر دوستوں اور اپنے اردگرد پھیلے ہوئے لوگوں کی بے حسی کا ماتم کروں کہ وہ کسی بھی انداز سے معاونت نہیں کرتے۔معاونت تو رہی ایک طرف بلکہ الٹا کچھ گزند ہی پہنچا کر جاتے ہیں......بات واحد متکلم کی نہیں، کسی بھی ادبی پرچے کے دفتر میں چلے جایئے......کچھ دوستوں کچھ مداحوں کا ایک ہجوم دکھائی پڑے گا......چائے یا مشروب تو رہا الگ......ایک تازہ پرچہ ''وصول'' کرنا بھی ''اعزاز'' سمجھا جاتا ہے......ان میں سے کچھ دوست ایسے بھی ہیں جو مدیر کو اپنی نفیس کار میں بٹھا کر کسی اعلیٰ ریستوران میں لے جائیں گے اور پندرہ بیس روپے صرف ادب سے محبت کے نام پر اٹھا ڈالیں گے۔لیکن پرچے کی خریداری کی فہرست میں اُن کا نام کبھی شامل نظر نہیں آئے گا۔

نہیں......یہ تو بالکل ذاتی باتیں ہیں......یہ بھی ''اپنی بات'' کے زمرے میں نہیں آتیں۔تو پھر میں کیا لکھوں؟ ملک وملّت کی کچھ بات کروں......مگر کیا......؟ اس وطنِ عزیز کے سربر آوردہ رہبروں نے ہمارے کہنے کے لئے کچھ چھوڑا ہو تو ''خامہ فرسائی'' کروں......اس موضوع پر تو بس یہی شعر محیط ہے ع

آپ ہی اپنی اداؤں پہ ذرا غور کریں
ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی

تو کیا میں علم و دانش کی بات کروں۔؟ میں تو شعروادب کا ایک معمولی سا طالب علم ہوں۔میں کیا گُل فشانی کرسکتا ہوں اس مرحلے پر بھی نگاہ اپنے پیشروؤں کی طرف اٹھتی ہے......مگر میرے ''بزرگوں' نے اپنے اپنے انداز سے اپنے اپنے میدان میں جو گل کھلائے ہیں کیا میں ان کی نشان دہی کرسکتا ہوں......نہیں......اس لئے کہ اس طرح میں صرف گستاخ ہی نہیں گردن زدنی بھی قرار پاؤں گا۔کیا مجھ میں جرات ہے کہ میں حضرتِ جوشؔ کے کسی ''بے مہار عمل'' پر انگلی اٹھا سکوں......جناب فیض کی ''باموقع خامشی'' کو زیر بحث لاسکوں......کیا میں اُن معتبر، مدبر اور اپنے سے سینئر اہلِ قلم اصحاب کا نام لے کر اُنھیں کچھ یاد دلا سکتا ہوں کہ آج کس ''مصلحتِ بینی'' کے پیشِ نظر وہ بھارتی لکھنے والوں کو مطعون کر رہے ہیں لیکن کیا یہ خدالگتی بات نہیں کہ ہم سب......اکثر و بیشتر اور وقتاً فوقتاً انہی لکھنے والوں سے مختلف حیلوں وسیلوں سے اپنی دوستی اور یگانت کا اظہار کرتے رہتے ہیں......میں تو اس مسئلے پر بھی نہیں لکھ سکتا......اس لئے کہ ابھی چند دن پہلے......محترمہ جیلانی بانو صاحبہ آکاش وانی سے ہم سب پاکستانیوں کو (جی ہاں! اُنھوں نے ہم لکھنے والوں کو خصوصاً مخاطب کیا تھا) ''غیرت وحمیت'' کا درس دے رہی تھیں......یہ وہی جیلانی بانو ہیں جن کے اعزاز میں پاکستانی ادیبوں نے شہر شہر دعوتوں کا اہتمام کیا تھا اور اب بھی......آج بھی اس پاک سرزمین کے کئی محبِّ وطن رسائل میں اُن کے تازہ افسانے چھپے ہوئے مل جائیں گے......میں کسے بُرا کہوں، کس پر الزام دھروں، میں کیا لکھوں......میں کیسے لکھوں......ہاں......مجھے اعتراف ہے۔میں اس بار بھی اداریہ نہیں لکھ سکوں گا۔اور اگر میرے چاروں طرف ایسے ہی حالات وواقعات کی یلغار رہی تو شاید میں کبھی بھی، کوئی بھی اداریہ نہ لکھ سکوں......!''

اظہر جاوید

(جلد نمبر2، شمارہ نمبر18، 1971)

◆◆◆

سنگی ساتھی کدے نہ ملدے

(اظہر جاوید دی نذر)

حسن عسکری کاظمی

موتیاں ورگے یار کدے نہ پرتے
تاریاں دیاں چ شکلاں دِسّن
جگ دے اندر ایہو کجھ تے ہوندا رہندا اے
وچھڑے ساتھی یاد جے آون
اوہناں دیاں شکلاں
بدلاں اندر
خواباں اندر
تاریاں اندر دسدیاں رہندیاں
اکھاں وچوں نیر وگاواں
ادھی راتیں اُٹھ اُٹھ روواں
اکھر لکھ لکھ وقت گزاراں
بوہا کھول کے جھاتی ماراں
دل پرچانواں
اپنے نال میں گلاں کرناں
جاون والے کدے نہ آئے
وچھڑے ساتھ کدے نہ ملدے
ٹھنڈیاں ہاواں بھردا رہناں
ایہو کجھ میں کردا رہناں

OOO

سَم راج

سلیم شہزاد

پوہ دی کرسی
کِنے کھچی
کِنے ساڈے پیریں بنھ کے
ہتھاں اُتے اَگ وچھائی
کِنے ساڈیاں اَکھاں وچوں
چانن وڈھیا
کِنے ساڈے گناں اندر سیسہ مڑھیا
کِنے ساڈیاں پپلاں اندر
واگ لُکائی
چانن وڈھ کے
اَک دی گڑھتی دِتی
نیلے رنگدے پچھلے پاسے
زہراں وِچوں سُورج اُگیا
واجاں اندر واجاں بنھیاں
پُٹھے کیتے کاج
فیر سَمے نے دھرتی جمی
دھرتی نے سَم راج

OOO

بیرا جی

نمکین غزل

منڈے گُتّاں کسی پھردے
منہ تے پوڈر دھسّی پھردے
ہارے ہوئے اپنیاں جِتّاں
اک دوجے نوں دَسّی پھردے
کدی نہ ٹائی بنّی آئی
گل وچ پا کے رسّی پھردے
بالاں وانگوں لیڈر ساڈے
گلیاں دے وچ نسّی پھردے
ڈاہڈا اے مہنگائی دا چُنگل
سارے ماڑے پھسّی پھردے
اک ڈرامہ کیہہ تکیا اے
شام سویرے ہسّی پھردے
پڑھیّا وچ وی وردی پا کے
بُوٹ اپنے اوہ کسّی پھردے
لیڈر نویاں چینلاں اُتّے
پُٹھے پیریں نسّی پھردے
سیاسی کرتب تک کے اج کل
چھوٹے وڈے ہسّی پھردے
پیٹی بنھّ کے سُن بیراؔ جی
اپنا ڈھڈ وی دَسّی پھردے

OOO

منزہ شاہد

سَت بسم اللہ

لئو وچہ بجھے زاریاں کر دے، وَس نئیں اکھراں دا
چُپ وچہ گُھٹ لئے اپنیاں چیکاں، موہرا پی صبراں دا

کوئی نئیں ایتھے تیرا جھلیئے! کیہ کرلان دا فیدہ
دنیا دنیا آکھدے جس نوں، جالا ہے مکراں دا

ماروتھل دیاں ریتاں پھکیاں وچہ چناواں اُتری
کنڈیاری نے لیواں کیتا، دساں کیہ سفراں دا

ست بسم اللہ دلبر سوہنا! جیویں مرضی تیری
ہر ساہ اندر تیری گھوکر، سَل کہیا ہجراں دا

اپنیاں پیڑاں اپنے اندر سانبھ کے رکھ منزہ
ٹھپ کے رکھ لئے درد کہانی، ڈک لئے ہڑ اتھراں دا

OOO

اظہر جاوید

O

کاہدا، کِس تے مان بھروسہ، کیہہ یاری سجنائی
موت وی ساڈے پیاریاں وانگوں نکلی اے ہرجائی

کدی تے اوہ وی دِن سن، میرے حال تے شبنم روندی سی
اَج تے میرے کولوں ہس ہس لنگھدی اے پُروائی

اساں تے یاراں دے ہر غم نوں، اپنا درد بنایا
ساڈے دُکھ پر کسے ناں پھولے، کسے ناں پیڑ ونڈائی

پیار دے اک پر چھانویں لئی وی ترلے پاندیاں رہناں
چنگا ربّا...... یاد روے گی تیری بے پروائی

کاہدا جینا، کاہنوں جینا، کس دے پاروں جینا!
اپنی عمر گوا کے ساہنوں ایہہ وی سمجھ نہ آئی

سدھراں دا گل گُھٹ لے اظہرؔ، دل نوں مار مُکا
جھلیا، کد تائیں لڑدا ریں گا، لیکھاں نال لڑائی

OOO

اظہر جاوید

O

اکلاپے دے روگ کولوں ہُن مرجایئے تے چنگا اے
غم دی بازی جتنی کاہنوں ہَر جایئے تے چنگا اے

کِسے وی سوہنی ساڈی خاطر پیار دا پتّن لنگھناں نیئں
سدھراں دے دریا وِچ آپے تر جایئے تے چنگا اے

کِسے نوں دُنیا وی تے کس نے دل تے پھاہیا دھرنا اے
ویلے دے ہر زخم نوں اندے جر جایئے تے چنگا اے

یاراں نے جے موئیاں پچھوں ساڈا مُل چُکانا اے
آپے ای اج اپنا سودا کر جایئے تے چنگا اے

جیوندیاں جی تے ناں دی تختی کسے وی بُوہے لگی نا
کتبہ اپنی قبر تے آپے دَھر جایئے تے چنگا اے

جھوٹھیاں نوں اے تخت بٹھاوے، سچیاں سُولی چاڑھے
اظہرؔ یار زمانے کولوں ڈر جایئے تے چنگا اے

OOO

ویگن والی

اظہر جاوید

ایہہ اُکامُکا فِلماں والی کہانی اے۔

کجھ سال پہلاں دی گل اے، سرگودھے اک مُشاعرہ سی۔ پتا نہیں کیہڑے بھلے لوک نیں میرا ناں وی پا چھڈیا، تے میں وی مروت پاروں انکار نہ کرسکیا۔ اوہدوں تائیں میں مشاعراں وچ شریک ہوندا رہناں ساں تے میں مُشاعریاں دی ''توڑ جوڑ'' توں اکیا نئیں ساں۔ کینویں دُنیادار شاعر، اپنے توں سینئرا گانہہ ٹور کے پچھے ارام نال بیٹھے رہندے سَن۔ ایہہ کم اوہ سٹیج سیکرٹری یاں مُشاعرا کروان والیاں نال رل کے کردے سَن۔ مینوں ایہہ ہیر پھیر چنگی نئیں سی لگدی۔ مینوں شُہرت اَتے پیسہ کماون نالوں عزت بچاونا ضروری لگیا، تے میں مُشاعریاں وچ جان توں انکار کرن لگ پیا۔ ہولی ہولی ایہہ ہویا لوکی بُھل ای گئے پئی میں شاعر وی ہوناں واں۔

گل میں اوس مُشاعرے دی ٹورن لگاں ساں جیہدے نال اوہ کہانی وی بَدھی ہوئی اے۔

پروگرام اِنج سی پئی انارکلی وچ گُورو ہوراں دے دفتر سبھے اکٹھے ہون تے فیرا گانہہ دا پینڈا کیتا جاوے گا۔ سارے شاعر جدوں آ گئے تے کسے صلاح دتی، سدھی سرگودھا دی بس پھڑن نالوں چنگا اے، پہلوں فیصل آباد چلیئے تے اوتھوں فیر سرگودھے ول مُنہ کریئے۔

اوہناں دناں وچ اجے لوہاری دروازے توں ویگناں چلدیاں سَن۔ گُورو ہوراں دے دفتروں ٹُرے تے ویگن دے ٹکٹ لئے۔ شاعر جتھے وی سَن، اوہناں توں وکھ اک سیٹ ای خالی سی۔ جھٹ پچھوں اک برقعے والی بی بی، تے نال چار پنج سال دا بال، اوہناں نوں اک جوان ویگن تے چڑھان آیا سی۔ ویگن بھری تے ڈریور ہوراں رب داناں لے کے سٹارٹ کیتی۔

شاعراں وچ کجھ پکی عمر دے تے کجھ جوان سَن۔ اک شاعرہ وی سی۔ شاعر کٹھے ہو جان تے گلاں، فقرے بازی اتے شعر شاعری وی ہون لگ پیندی۔ شاعری وی لطیفیاں ورگی...... کوئی گل ہتھ آ گئی تے فیر چل سو چل...... اک مصرع ایدھروں تے دُوجا اوہدروں...... کھپ رولا پاندیاں شاہدرہ آ گیا...... ویگن جھٹ پل لئی رُکی، تے شاعرہ نے آکھیا، کنو لے لئی اے...... اوہنے پورے حساب نال ہر شاعر لئی دو دو کنو لئے...... پیسے دین لگیتے گُورو ہوراں آکھیا۔ ''تو نہہ رہن دے، ایہہ میرا فرض اے......''

ویگن وچ بیٹھی ہوئی بُرقعے والی، شاعراں دے کُھلے ڈھلے مذاقاں تے نویاں اوپریاں گلاں سُن سُن کے حران ہو رہی سہی......

میری اکھ اوہدے تے جمی ہوئی سی۔ جیہڑے میرے حصے دے دو کنو آئے، میں اوہدے وچوں اک اوہدے بال نوں پھڑا دتا اوہنے ایویں لحاظ نال آکھیا۔ ''رہن دیؤ۔ کوئی گل نئیں۔'' میں وی جواب دِتا کوئی گل نئیں...... لے لو......''

ایہہ ساڈا پہلا پہلا تعارف سی...... تُسیں اینھوں تعارف نئیں سمجھو گے پر میرا تجربا ہو را اے...... تعلّق دی تے سانجھ بنن دی گل

اِنجے ٹُردی اے۔

ویگن شوٗشوٹ بھجی جارہی سی۔ ویگن دے اندر سبھ توں پُہتی کھپ پان والا شاعر خالد ایدھر اودھر ٹچکراں کری جارہیا سی۔ بُرقعے والی کدی کدی مسکرا دیوے، کدی بال دے دھیانے لگ جاوے تے اینویں بھل بھلیکھے میرے ول وی نظر پالوے۔ مینوں ایہہ سبھ چنگا لگ رہیا سی۔

واہ واہ پینڈا مُک گیا پراجے فیصل آباد دُور سی۔ کسے تھاں تے ویگن فیر رُکی تے ساڈی شاعرہ نیں مُڑ کے کنو خریدے۔ ایہدے توں پہلاں کہ میں بُرقعے والی نوں کنوں دیندا، شاعرہ نے ہسدیاں واج دِتی...... ''تو نہہ رہن دے۔ میں پہلوں ای اوہدا حصہ لے لِتا وے......'' کنو برقعے والی تک اپڑے تے اوہنے شاعرہ دا شکریہ کہن دی جائے، مینوں بڑے اپنے پن نال ویکھیا تے آ کھیا۔ ''تہاڈا شکریہ......''

ہُن شاعر خالد نیں ہور طرحاں دی فقرے بازی شروع کر دتی۔ میرا ناں لے لے کے کہن لگا...... تُو نہہ باز آ جا...... اینھاں کماں دے نتیجے چنگے نئیں ہوندے۔'' میں وی ہس کے کہیا...... ''لے فیر یار جی...... میں وی فیصل آباد اُتر جاواں گا، تے تُسی لوکی اگانہہ سرگودھے مُشاعرہ بھگتاؤ......'' کدی کدی ساڈی شاعرہ وی کوئی فقرہ ماردیوے۔ ''تُو نہہ نصیباں والا ایں۔ تینوں تے سفروچ وی ہم سفر لبھ جاندے نیں۔'' جیہڑے سینئر شاعر سن اوہ نِمے نِمے مُسکراندے رہے۔ میں آ کھیا۔

''لو جی، سبھ نوں خبر ہووے، میں تے فیصل آباد ای اُتر رہیا واں۔ تُسی لوک جاؤ مشاعرے تے۔''

بُرقعے والی نیں فیر چمکدیاں تے ہسدیاں اکھاں نال میرے ول ویکھیا، اتے ایہہ سُنہیا دِتا۔ ''سچی مُچی۔''

ساڈا بے بنیادا تے انجانا پیار اینیوں بے وجہ پکا ہور ہیا سی۔ نہ مینوں اوہدے ناں ٹھکانے دا پتا سی نہ اوہنوں میرے بارے کجھ خبر سی۔ کدی کدی ویلا عجب تماشے وکھاندا اے۔ اِنجے بے خبری وچ سانجھاں بن جاندیاں اَتے بے ناویں رشتے دیاں گنڈھاں بجھ جاندیاں نیں۔

خالد نیں خیر چیخ کے آ کھیا...... ''باز آ جا...... فیصل آباد تینوں اینھیاں کُو ڈانگاں پینیاں نیں، تو نہہ آپ وی اپنے آپ نوں پچھانناں نئیں۔''

بُرقعے والی نیں فیر مُڑ کے ویکھیا۔ ایس واری نہ اوہدیاں اکھاں وچ اپنا پن سی نہ کوئی سُنہیا۔ کجھ اوپری جیہی ویکھنی سی...... اوہ وی میرے ول نئیں...... خالد وَل...... فیر اوس نیں اپنے بال نوں گُھٹ کے سینے نال لایا تے اک بھرواں پیار کیتا...... اوس ویلے مینوں اوہدی ایس حرکت دی سمجھ نہ آئی...... اِنج لگا جینویں اوہنوں کوڑ چڑھ گئی اے۔

ویگن دی رفتار دے نال نال خالد دی فقرے بازی جاری سی۔ دُوجے سنگی شاعر وی چسکے لے رہے سن...... سفر مُکیا، فیصل آباد آ گیا۔ بُرقعے والی ویگن دے بُوہے نال والی سیٹ تے بیٹھی سی۔ اونے اُترن دا چارا نہ کیتا۔ اَسیں لنگھن لگے تے اوہنے اپنا سوہنا جیہا تھیلا مینوں پھڑا دتا تے آپوں بال نوں لے کے تھلے اُتر گئی۔ سبھے شاعر، سینئر جونیئر، گِٹ مِٹ کر کے بولے...... ''لو جی، ایہہ تے گیا بے کموں۔''

ویگن توں اُتر کے میں اوہدے ول تکیا، اوہ رَج کے سوہنی سی۔ بھری جوانی...... اوہ بچہ اوہدا پہلا پہلا بال لگدا سی۔ اوہنے شکر دا ساہ

لیا......اکھاں وچ خوشی تے تسلی دی مستی بھری سی......ایدھر میں عجب مشکل وچ پھسیا ساں۔ میریاں اکھاں وچ فتح دی چمک سی، پئی اک سوہنی کُڑی تن من نال مینوں قبول کر بیٹھی اے، اتے نال اک اک ہار تے شکست دا لانبھو دِل وچوں اُٹھ کے اکھاں راہیں نکل رہیا سی۔ میں سوچیا۔ میں اگے وی کوئی ایڈا نیک نام نئیں سبھاں نوں پتا اے، ایس شاعرہ سمیت، پئی پریاں میریاں لکھن والیاں اتے دوجیاں بیبیاں نال گوڑھیاں دوستیاں نیں...... جے اج میں ایس انجانی کُڑی نال ٹُر پیا، تے عُمر بھر اک بدنامی نال لگی رہے گی۔ سبھے ای چشم دید گواہ سَن۔

اک پل وچ جیویں سوچاں نیں چھلانگاں ماریاں...... میں بے دلی نال بُرقعے والی دا تھیلا اوہنوں پھڑایا۔ اوہنے ٹُٹے دِل نال تھیلا پھڑیا...... جان بُجھ کے اپنے ہتھ نوں میرے ہتھ تے رکھیا۔ کوئی عام ویلا ہوندا تے میں تھڑک جاندا۔ سبھے شاعر سرگودھے والی بس وَل ٹُر پئے سَن، تے بولیاں مار رہے سَن۔ آ جا، آ جا۔ عزت نال واپس آ جا......'' میں بُرقعے والی نوں رب راکھا کہیا، تے ہور کہہ دی کِیہ سکناں ساں۔ میں مُنہ پھیر کے ٹُر گیا، پرت کے ویکھیا وی نئیں، خبرے اوہدا کیہ حال سی۔

کہانی تے ہُن ٹُردی اے......

کئی مہینے لنگھ گئے......اپنیاں رُجھاں وچ رُجھ کے میں اوہنوں انج بُھل گیا جینویں تپدی دوپہر وچ ٹھنڈی ہوا دا بُلھبا آوے، تے لنگھ جاوے۔

مُشاعرے دے سفر وچ چھوٹا گُورو وی نال سی۔ اوہنے وی سارا نظارا تکیا سی تے نالے فقرے مارن وچ اوہ وی شیر سی۔ اجے ایہہ بھائی ہوری بوہت وڈی ہستی نہیں سَن بنے ...... دِن وچ اِک واری ضرور میرے وَل پھیرا پاندے سن۔ اسیں فلماں وی کٹھیاں ویکھدے ساں، تے ہیرا منڈی دی یاترا وی کرلئی دی سی۔ اوہنے مینوں دسیا سی میں ڈیپریشن وچ آں، مینوں جسماں دی لوڑ، تے تھوڑا اے میں اوہنوں اک سوہنی جیہی ماہر نفسیات ڈاکٹر نال وی ملایا، تے اوہدا ویاہ وی ہوئیا ہوئیا سی......خیر، انج ہوای جاندا اے۔

گُورو آیا، سویر دے کوئی یاراں باراں وجے ہون گے۔ آندیاں ای حُکم جاری کیتا ......''اُٹھ چلیئے۔'' ''میں کہیا ایس ویلے......؟'' ہَس کے کہن لگا......''آغا جی ایس کم دا کوئی ویلا نہیں ہوندا......!'' اوہ مینوں آغا ای کہہ کے بُلاندا اے......

اسیں ہیرا منڈی اپڑے......اوہنے آکھیا......''میں نویاں گلیاں دی ریکی کرناں واں......'' میں اک چاء خانے وچ بیٹھ گیا اوہ تھوڑی دیر بعد آیا، اتے عجب حرانی تے خوشی نال کہن لگا......اوئے، اوہ ویگن والی یاد ای......؟'' میں وی حیرت نال اوہدے وَل تکیا، جینویں گل سمجھیا نہ ہوواں......اوہنے چاء خانے دا لحاظ کیتیاں بغیر اُچی اُچی بولنا شروع کر دتا......

''اوئے، اوہ تیری مسافر محبوبہ......جیہڑی فیصل آباد دی ویگن وچ ملی سی۔''

''ہیں......'' میں ڈھورا بھورا ہو گیا۔

اک عجیب جیہی حالت سی۔ خبرے اوہدے مُڑ کے مِل جان دل خوشی سی یاں ایہہ صدمہ سی پئی اوہ کنجری اے......گُورو بولی جا رہیا سی......''آغا، اوہنے مینوں آپ پچھانا اے، تے پہلی گل ایہو کیتی سو، اوہ تہاڈے نال والا کِتھے وے تے......'' گُورو کہن لگا......

''اوہنے گل توڑ دیاں ہوئیاں پُچھیا، تُسیں مینوں ایتھے ویکھ کے حران تے نہیں ہوئے...... تے اوہ تہاڈا سنگی......؟'' گُورو نیں آکھیا، اوہ باہر چاء خانے وچ بیٹھا وے، اوہ وی تینوں مل کے ڈھیر خوش ہووے گا۔''

میں بھنبھل بھُوسے وچ پیا ساں۔ سچی گل اے، میریاں دھڑکناں انج اُتے تھلے ہو رہیاں سَن اتے انج مچل رہیاں سَن جینویں

خورے پہلے پہلے عشق ویلے ہوئیا ہوناں اے...... میں اوہنوں مِلناں وی چاہناں ساں، اتے نہیں وی ملناں چاہناں ساں...... پتا نہیں ایہہ کیہڑی کیفیت سی......

گورو کہن لگا......''اوہ کہندی اے...... میں کمرہ تے تھوڑا دھولواں تے تسی ادھے گھنٹے تک آ جاناں۔ کیوں، کیسا اے......؟'' گورو نیں سوٹا لاندیاں تے قہقہہ اُچھالدیاں آکھیا۔

گورو چلا گیا...... پر مینوں ہمت نہ ہوئی۔ پتا نہیں ایہہ اوس رومانوی ملاقات دے ایخو جیہے انجام دا اثر سی۔ گوا چی انجانی محبوبہ دے مِل جان دی خوشی سی یا خبرے کیہ سی...... محبوبہ وی اوہ جیدا نہ مینوں ناں آندا سی نہ اوہنوں میرا......

ڈنگ ٹپا کے گورو پرتیا تے کہن لگا......''اوہ تینوں اڈیک رہی اے۔'' میں کہیا ''یار فیر سہی کدی......'' گورو کھرا ہو کے بولیا ''چڑھ میرے انگوٹھے تے......''

ہفتہ اک لنگھیا ہوناں اے کہ اوہدر دا فیر پروگرام بن گیا۔ وچوں میری وی ایہو خاہش سی۔ گورو مینوں اوہدے کمرے دی دس پا کے کسے ہور وراثٹی ول چلا گیا۔

اسیں جینویں مِلے، کیہ ہیر رانجھا بیلے وچ ملے ہون گے۔ کہن لئی کجھ نہیں سی، بس کجھ کرن دی ای آپر سی...... منجی تے لیٹیاں تے پیار دے مُنہ زور ہڑ وچ ٹھلدیاں اوہنے نظراں اُتے چھت ول کیتیاں، ہتھ اُتاں کیتے، اُتے لماں جیہا ساہ لے کے آکھیا۔

''رَبا، تیرا سو سو شکر اے، تو نہہ میری مراد پوری کیتی اے۔ تے اج ایہہ ویلا نصیب ہوئیا اے۔''

میں رب دی مہربانیاں اتے اوہدے صادق جذبے تے حران پریشان ہو گیا...... اِک چھوٹے جیہے سفر وچ، جیہدے وچ کوئی گل بات نہیں ہوئی سی، کوئی قول قرار نہیں ہوئیا سی، اوہنے میرے نال پیار دی سانجھ پالتی سی، اتے خورے کنھیاں دعاواں کیتیاں تے مَنتاں میناں ہون گیاں۔

ایہہ گل گورو وی کیتی سی اتے مینوں وی ویگن وچ تے خیر اوہدے نال ملاپ ویلے ایہہ یقین ہوندا سی، وہ کنجری نہیں...... کوئی شریف تے معصوم کُڑی اے، جیہڑی رب جانے کیہڑے چکر وچ پے کے ایس کنجر خانے اپڑ گئی اے۔

کجھ پر پچھوں میں کلا گیا۔ اوہدے کمرے وچ کوئی ہور کنجری سی...... میں کجھ پچھیاں آکھیاں بنا پرت آئیا۔ پر اندر ہل چل جیہی سی۔ فیر گیا، تے کمرہ اوسے طرحاں کسے ہور کول سی۔ اوس کمرے والی مینوں کاروباری طریقے نال واج ماری۔ میں گیا، تے آکھیا۔ ''میں اوہنوں لبھ رہیا واں، جیہڑی تیتھوں پہلاں ایس کمرے وچ ہوندی سی۔''

اوہ ہسی، ''باؤ...... عشق عُشق دے چکر وچ تے نہیں پے گیا؟ اوہ، شریفاں دی کُڑی سی۔ اپنے گھر ٹُر گئی اے۔ حران تے ہوئیا ہوویں گا...... اسیں وی ساریاں حران آں، جیہڑی اک واری ایس دُنیا دِی دلدل وچ پھس جاوے، اوہ مُڑ مر کے ای نکل دی اے...... اوہ بھاگاں والی سی...... پتا نہیں کینویں اوہدیاں گھر والیاں اوہنوں قبول کر لیتا......''

میں مُنہ لٹکا کے پرتن لگا، تے اوہنے میری بانہہ پھڑ کے اپنے ولوں بڑے پیار نال آکھیا...... آجا...... باؤ...... تینوں اوہ بُھلا دیّاں گی۔ اوہنے کیہ بُھلانا سی۔ میں آپے ای اوہنوں بُھل گیا واں...... اج پندراں ویہاں ورھیاں پچھوں خورے اوہ کس طرحاں یاد آ گئی اے......؟

◆◆◆

تبصرے

مے خانۂ اُردو کا پیرِ مغاں (نارنگ ساقی)

مبّصر : انور سدید

ممتاز نقاد ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے زیرِ نظر کتاب ''مے خانۂ اُردو کا پیرِ مغاں —— نارنگ ساقی'' کے پیش لفظ میں لکھا ہے:

> ''اُردو کے عاشق صادق، ادیب اور قلم کاروں کے بے لوث میزبان اور فرشتہ صفت انسان کرشن لال نارنگ ساقی جیسے لوگ آج بہت کم دکھائی دیتے ہیں، یہ ایسا نارنگ ہے جس میں رنگ ہی رنگ ہیں۔ یہ مے خانہ کا ایسا ساقی ہے جو دوسروں کا پیالہ تو بھرتا ہے لیکن خود اپنا سبو خالی رکھتا ہے اور سب پر اپنی محبتیں لُٹاتا ہے۔ ایسا لطیفہ گو ہے جس نے کبھی جھوٹ بول کر یا ٹھٹھا کر کے نہیں ہنسایا۔''

میں نے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے یہ الفاظ پڑھے تو دل سے آواز آئی کہ ''انہوں نے جو لکھا ہے، سچ لکھا ہے اور سچ کے سوا کچھ نہیں لکھا۔'' دہلی میں کرشن لال نارنگ ساقی ایک ایسی منفرد شخصیت ہیں جن کے گھر کے دروازے اُردو کے ہر دیار کے ادیب کے لیے کھلے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا اور ڈاکٹر وحید قریشی کے ساتھ مجھے دو مرتبہ دہلی جانے کا اتفاق ہوا۔ اندرا گاندھی ایئر پورٹ پر قدم رکھتے ہی نارنگ ساقی صاحب کا پیغام موصول ہوا کہ وہ ہم سب کے میزبان ہوں گے۔ لیکن افسانہ نگار جوگندر پال آڑے آ گئے اور نارنگ ساقی، جوگندر پال صاحب کے ہاں ہمارے قیام پر اس شرط پر راضی ہوئے کہ ڈاکٹر وحید قریشی اور وزیر آغا صاحب کے اعزاز میں ایک ''گرینڈ پارٹی'' نارنگ ساقی صاحب کے دولت کدے پر ہوگی جس میں دہلی کے سب ممتاز ادیب شریک ہوں گے۔ یہ الفاظ لکھتے ہوئے مجھے نارنگ ساقی کی مرتّب کی ہوئی شاندار محفل یاد آ رہی ہے جس کی صدارت کنور مہندر سنگھ بیدی سؔحر نے کی تھی اور محفل کو زعفرانِ زار نارنگ ساقی کے لطیفوں نے بنا رکھا تھا۔

نارنگ ساقی دِلّی کی وسیع ترین ادبی دنیا کی ہر دلعزیز شخصیت ہیں۔ ان کی مخصوص ادبی جہت تالیف نگاری ہے۔ ان کا خیرِ کثیر دُکھی عوام میں مسکراہٹیں تقسیم کرتا ہے۔ ان کے ادبی، سماجی اور تہذیبی کاموں کی تعریف کرنے والوں کا حلقہ پوری اُردو دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ اور ان کی شہرت بین الاقوامی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ اس کا ثبوت زیرِ نظر کتاب ہے جس کے مؤلف سہ ماہی رسالہ ''اسباق'' (پونے) کے مدیر نذیر فتح پوری ہیں، جو ادبا اور شعرا کے فکر و فن اور شخصیت پر کتابیں مرتّب کرنے اور ''اسباق'' کے خاص نمبر

شائع کرنے میں شہرتِ خاص رکھتے ہیں۔لیکن نارنگ ساقی پر اس کتاب کی ترتیب و تدوین کو انہوں نے ایک ادبی نیکی شمار کیا ہے جس کا انعام خود یہ کتاب ہے بلکہ خدائے بخشندہ کی عطا ہے کہ نارنگ ساقی جیسی محبوبِ جہاں شخصیت اور ان کی ادبی خدمات پر ایک مبسوط کتاب مرتّب کرنے کا اہم کام نذیر فتح پوری کی قسمت میں لکھا گیا جسے انہوں نے محبت کے خالص اور بے لوث جذبے سے انجام دیا ہے۔

خوبی کی بات یہ ہے کہ اس کتاب میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ موجود ہیں تو ساقی کی بزم لطافت میں شمس الرحمان فاروقی بھی شگوفہ نگاری کر رہے ہیں۔حروف تہجی کے اعتبار سے کتاب کا آغاز اختر الاسلام کے نام سے ہوتا ہے اور آخری ایک سو اکیسواں مضمون یوسف ناظم کا ہے جن کا ارشاد ہے کہ ''نارنگ ساقی ظریفانہ ادب کے کاشتکار نہیں بلکہ اس مجیر العقول جنس کے ملک التجار ہیں......نارنگ ساقی ہم میں نہ ہوتے تو پتہ نہیں ہم کب تک اور کہاں تک روتے بسورتے ہی رہ جاتے......'' میں نارنگ ساقی کو خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ انہوں نے ایک سو اکیس ادیبوں سے اپنی تحسین اپنی کتابوں کے میرٹ پر کرائی۔ان میں وہاب اشرفی، وارث علوی، نثار احمد فاروقی، ناصر زیدی، ڈاکٹر مشتاق اعظمی، مجتبیٰ حسین، مالک رام، مشفق خواجہ، قتیل شفائی، اظہر جاوید، ارتضٰی کریم، اشفاق نقوی، جگن ناتھ آزاد، دلیپ سنگھ، حمید اختر، جوگندر پال، زبیر رضوی اور قاضی عبدالستار چند اہم نام ہیں۔مضامین کے ساتھ مختلف ادیبوں کی تصویریں بھی شامل ہیں۔معنوی طور پر یہ ایک حوالہ جاتی کتاب ہے۔ضخامت 595 صفحات۔قیمت چار سو روپے۔ ملنے کا پتہ: ایم آر پبلشرز۔10- میٹروپول مارکیٹ۔45-1724 کوچہ چیلان، دریا گنج، نئی دہلی۔110002 (انڈیا)۔ نارنگ ساقی کا پتہ: ایل 4۔ کناٹ سرکس۔نئی دہلی 110001۔انڈیا(0981-1580888)

....

تمہیں اپنا بنانا ہے (ریاض ندیم نیازی)

مبّصر : انور سدید

''تمہیں اپنا بنانا ہے'' بلوچستان کی سرزمین سے اُبھرنے والے منفرد شاعر ریاض ندیم نیازی کی شاعری کا پہلا مجموعہ ہے۔ اُردو کے ممتاز شاعر افتخار عارف جب یہ کتاب پڑھ رہے تھے تو ''ادبی گہما گہمی کے اعتبار سے نسبتاً بڑے شہروں سے دور رہنے والے اس شاعر کو پڑھ کر خوش ہو رہے تھے کہ غزل میں کیسے کیسے امکانات ہیں اور کیسے کیسے تازہ نفس اور صاحبِ امکان شعرا اُردو کی اس مقبول صنف میں اپنے تخلیقی جوہر کا اظہار کر رہے ہیں۔'' درحقیقت وہ باور کرا رہے تھے کہ صنفِ غزل قیدِ مقام سے آزاد ہے اور اس پر بڑے شہروں کا اجارہ نہیں ہے، اچھا شاعر دور اُفتادہ دیار و امصار سے بھی اُبھر سکتا ہے اور اس کی مثال ریاض ندیم نیازی ہیں جن کی شاعری پر سحر انصاری، رفیع الدین راز، ایوب خاور، خالد شریف اور امجد اسلام امجد نے حروفِ تحسین لکھے ہیں اور انہیں بلوچستان کا ایک تابندہ ستارہ قرار دیا ہے جس کی تابندگی اور تازگی برقرار رکھنے کی دعا جناب اعتبار ساجد نے کی ہے۔

میں نے اس کتاب (''تمہیں اپنا بنانا ہے'') مطالعہ کیا تو یوں محسوس ہوا کہ ریاض ندیم نیازی شاعری نہیں کر رہے، پتھروں سے پھول اُگا رہے ہیں۔بلاشبہ انہیں پتھروں سے وہ شعلہ بھی اُبھرا تھا جو دفاعِ وطن کا ضامن قرار دیا گیا تھا لیکن اس شعلے کو اُگانے میں ملک کے نامور سائنس دان شامل تھے جن کے قومی فرائض کی جہات ایک شاعر کی فطری جہات سے مختلف ہوتی ہیں۔اور اس کا تخلیقی عمل

بھی الگ نوعیت کا ہوتا ہے اور وہ فطرت سے سرگوشیاں کرتا ہے تو اظہار کی کھڑکی کا دروازہ باہر کی طرف کھول دیتا ہے تا کہ فطرت کی سرگوشی میں زندگی کے دُکھوں سے کچلے ہوئے عام لوگ بھی شرکت کر سکیں۔ ڈاکٹر اجمل نیازی نے ریاض ندیم کو لفظ اور خیال کی خوشبو پھیلانے والا شاعر شمار کیا ہے تو یہ بلا وجہ نہیں۔ ان کی شاعری پہاڑوں سے رونما ہوئی لیکن اس کی خوشبو دیوارِ چمن پار کر گئی اور لاہور تک پہنچی جو دور دراز کے مضافات کے خوش فکر شاعروں کو اپنی حدود میں شامل نہیں ہونے دیتا۔ لاہور نے انہیں داد و تحسین سے نوازا ہے تو یہ ان کی شاعری کا خصوصی اعزاز ہے اور کتاب کے عنوان کی رعایت سے کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے لاہور، کراچی، ملتان اور اسلام آباد کو اپنا بنا لیا ہے اور میں تو یہ بھی کہوں گا کہ جناب خالد شریف کے ادارے ''ماورا'' (لاہور) سے ان کی کتاب کی طباعت و اشاعت کو بھی وہ اپنا افتخار شمار کر سکتے ہیں۔

بلا شبہ ریاض ندیم نیازی غزل اور نظم میں اپنے احساسات و جذبات رقم کرتے ہیں تو ان کا زندگی کا مطالعہ اور واقعات اور حادثات پر ان کا ذاتی ردِعمل ہمارے سامنے آتا ہے۔ ان کی شاعری میں زمانہ اپنے پورے سیاق اور سباق کے ساتھ اُبھرتا ہے اور وہ ہمیں مثبت قدروں کے شاعر نظر آتے ہیں:

ہر لفظ کے بدن سے تراشی ہے روشنی ہر حرف کو چراغ بناتا رہا ہوں میں
ہیں کب سے گھات میں شبِ خون مارنے والے تو اپنی ڈھال کو تلوار میں سنبھال کے رکھ
مفلسی تیرا بھلا ہو کہ رہا چین سے میں ورنہ ہے آج ہر اک صاحبِ زر، نامحفوظ

شاعری کی یہ خوبصورت اور معنی خیز کتاب 272 صفحات پر مشتمل ہے۔ قیمت 300 روپے۔ ملنے کا پتہ: ماورا پبلشرز، دی مال۔ لاہور۔
مصنف کا پتہ......ندیم نیازی لائبریری، مسجد روڈ۔ سبّی (بلوچستان)

....

یادسہاگن ہوئی

شاعر : اخلاق عاطف
ناشر : پنجابی مرکز، لاہور، مجلسِ میاں محمد، سرگودھا
صفحات : 192 قیمت -/200 روپے تبصرہ : آفتاب خان

اخلاق عاطف اُردو اور پنجابی کے معروف شاعر ہیں۔ یہ اُن کی غالباً دسویں کتاب ہے جو پنجابی کلام پر مشتمل ہے۔ اس میں غزلیں، نظمیں اور گیت شامل ہیں جو خالص پنجاب کی دھرتی کی عکاسی کر رہے ہیں۔ اُن کا یہ پنجابی کلام اپنی زبان اپنی زمین اور اپنے کلچر سے محبت کی کھلی گواہی پیش کر رہا ہے۔ اخلاق عاطف اپنے اس کلام میں مکمل طور پر زمین سے جُڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اُنہوں نے نہ صرف انسانوں کے دُکھ درد کو موضوع بنایا ہے بلکہ عشق و محبت کے روایتی انداز کو بھی نئے ڈھنگ سے بیان کرنے کا ہُنر آزمایا ہے۔ اُن کے چند مختلف انداز کے اشعار دیکھیے :

لوک سُن کے تڑفدے رہندے نیں خورے کِس بے قرار دی گل اے

لہراں اُتے بنیاں ہوئیاں تصویراں نئیں بولدیاں سفنے مِتّاں کر کر تھکے، تعبیراں نئیں بولدیاں

....

پیار پریتاں رنگے لوک کدھر گئے؟ او چنگے لوک

....

کوئی پھل بچیا تے اپنے کالر بارے سوچاں گا عاطف اجے کسے لئی گجرے ہار پرونے باقی نیں

پنجابی اگرچہ اخلاق عاطف کی مادری زبان نہیں لیکن اُنہوں نے خالص پنجابی زبان میں کمالِ فن کا نادر نمونہ پیش کیا ہے اور نہایت ٹھیٹھ پنجابی الفاظ کے استعمال سے شاعری کو زبان کی حقیقی لطافتوں سے سرشار کرنے کی کوشش کی ہے جس میں وہ بے حد کامیاب رہے ہیں۔ اُن کی یہ کتاب پنجابی ادب کے شائقین کے لیے ایک خوبصورت اور نایاب تحفہ ہے جسے ہر گھر کی لائبریری میں موجود ہونا چاہیے۔

....

کبھی سوچا تھا؟

شاعر : ضیاءالرحمان ضیاء

صفحات : 128 قیمت : -/300 روپے

ناشر : ادبی ڈائجسٹ پبلشر، کراچی تبصرہ : آفتاب خان

ضیاءالرحمٰن ضیاء کا پہلا شعری مجموعہ ''پیار کا پہلا دن'' ادبی حلقوں میں خوب پذیرائی حاصل کر چکا ہے۔ اب یہ اُن کا دوسرا شعری مجموعہ منظرِ عام پر آیا ہے۔ ضیاء الرحمٰن بنیادی طور پر محبت اور عشق کے شاعر ہیں۔ اُن کی بیشتر غزلیں اور اشعار محبت کی نازک کہانیاں بیان کر رہے ہیں۔ چند اشعار دیکھیں :

دل میں جو بسی تیرے پیار کی خوشبو ہے ہم تو اِسی مہکار میں زندہ رہتے ہیں

....

امتحاں سے وہی گزرتے ہیں جو محبت کسی سے کرتے ہیں

....

مجھ کو سراپا اُس کا قیامت اثر لگا وہ کیا ملی کہ حشر کا سامان کر گئی

عشق و محبت کی قلبی وارداتوں کے ساتھ ساتھ اُن کی شاعری میں وارداتِ زمانہ کی جھلک بھی واضح دکھائی دیتی ہے۔ دنیا کی ستم ظریفیاں اور حوادثِ زمانہ بھی اُن کی نظروں سے پوشیدہ نہیں اور وہ اسے بھی بڑی مہارت سے اپنی شاعری کا حصہ بناتے ہیں اور پھر اس طرح کے اشعار کاغذ پر بکھرے نظر آتے ہیں :

کیوں نہ جنگل میں ہی جا بسیں ہم اب تو شہروں میں دل ڈولتے ہیں

....

ایک انجانی سی انہونی کے ڈر سے　　دہل جاتا ہے دل نکلیں جو گھر سے

....

اک خول چڑھا رکھا ہے لوگوں نے ریا کا　　جھانکو جو کبھی اُن میں تو اندر نہیں کچھ بھی

....

صرف جنسِ وفا ہوئی نایاب　　ورنہ ہر چیز اِس جہان میں ہے

غزلوں کے علاوہ اس مجموعہ میں کچھ نظمیں بھی شامل ہیں بلکہ اس کتاب کا عنوان بھی ایک نظم سے لیا گیا ہے۔غزلوں کی طرح نظموں میں بھی محبت اور رومان کی دلکش فضا واضح دکھائی دیتی ہے اور یہ تمام نظمیں محبت کے لطیف جذبات کی عکاس ہیں۔محبت ضیاء الرحمٰن کی شاعری کے سب سے مضبوط استعارے کی صورت نظر آتی ہے۔اسی لیے تو ڈاکٹر جمیل جالبی بھی کہتے ہیں کہ ''ضیاء کی شاعری، عشقیہ شاعری نہیں، یہ رومانی شاعری ہے جس کے سرے اختر شیرانی سے جا ملتے ہیں۔''

....

پرندہ سفر میں (انور سدید)

مبصر : جام سجاد حسین

ڈاکٹر انور سدید اُردو ادب کی ایک نامور شخصیت ہیں۔ان کی شاعری کا پہلا مجموعہ 2009ء میں شائع ہوا۔ان کی اس کتاب میں 46 غزلیں شامل ہیں جن میں حکومتی رویّوں پر کڑی تنقید کی گئی ہے۔شاعر کی رائے میں ''دہشت گردی اور بدعنوان (کرپٹ) سیاست دانوں کی بدعملی کی وجہ سے ملک بدترین سیاسی بحران سے گزر رہا ہے۔ان کے ہر شعر سے وہ ذہنی دباؤ، تناؤ اور کھنچاؤ ظاہر ہوتا ہے جس کا سامنا آج کے عام آدمی کو ہے۔ڈاکٹر انور سدید نے اپنی شاعری صرف اُردو اور پنجابی زبان میں پیش کی ہے اور وہ کثیر اللسانی شاعر نہیں ہیں۔وہ پاکستانی عوام کو امن، آشتی اور محبت کا پیغام اپنی شاعری کے ذریعے دیتے ہیں۔

یہ کتاب سماجی اور سیاسی عناصر کی نشاندہی بھی کرتی ہے لیکن انہوں نے فطرت کی رعنائیوں اور زندگی کی نیرنگیوں کو فنی تجلّی سے اپنی شاعری کا حصّہ بنایا ہے۔ان کی شاعری میں ورڈز ورتھ کی روحانیت، کالرج کے مابعدالطبیعیاتی عناصر کا تاثر اور شیلے کی نیچرل شاعری کا وجدان نمایاں ہے۔

ڈاکٹر انور سدید کی شاعری کو متعدد نامور ادباء نے خراجِ تحسین ادا کیا ہے۔ڈاکٹر وزیر آغا کی رائے میں انور سدید کی شاعری ان کے ذاتی مشاہداتِ حیات کا حامل ہے۔انہوں نے اپنی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا، پھر وہ تنقید کی طرف آ گئے اور اب ان کی شاعری سامنے آئی ہے تو یہ داد کے قابل ہے۔ان کے علاوہ پروفیسر سجاد نقوی، پروفیسر صابر لودھی، محمد نعیم بزمی، علیم صبا نویدی (انڈیا)، اور خیر الدین انصاری نے بھی انور سدید کی شاعری پر تحسین آمیز الفاظ میں تبصرہ کیا ہے۔''پرندہ سفر میں'' 112 صفحات پر مشتمل ہے۔قیمت دوسو روپے۔ناشر: مقبول اکیڈمی، چوک اُردو بازار، سرکلر روڈ، لاہور۔

(انگریزی اخبار ''دی نیشن لاہور'' سے ترجمہ)

◆◆◆

اظہر جاوید مدیر 'تخلیق' کی پہلی برسی

اُردو کے جلیل القدر ''تخلیق'' کے مدیر اظہر جاوید گزشتہ برس کے ''ویلنٹائن ڈے'' پر ہم سے بچھڑ گئے تھے۔ 2013ء کا ''ویلنٹائن ڈے'' آیا تو ان سے اظہارِ محبت کرنے کے لئے ادارہ ''تخلیق'' نے الحمرا کی ''ادبی بیٹھک'' میں ایک تقریب کا اہتمام کیا۔ اظہر جاوید کی پہلی برسی کے دن آسمان کھل کے رویا، موسلا دھار آنسوؤں کے سیلاب میں لوگوں کا گھر سے نکلنا ناممکن ہو گیا لیکن اظہر جاوید سے محبت کرنے والے الحمرا میں پہنچ گئے۔

تقریب کا آغاز سیّد **شاہد بخاری** نے تلاوت کلام پاک اور نعتِ رسول مقبولؐ سے کیا۔ سب سے پہلے **قاضی منشا صاحب** نے اپنی تقریر میں اظہر جاوید کی یادوں کی تجدید کی اور ان کی انسانیت نوازی اور ادب پروری کی تحسین کی۔ **راجہ اسد علی خان** نے اظہر جاوید کی ان خدمات کا تذکرہ کیا جو انہوں نے ظفر علی خان فاؤنڈیشن میں انجام دی تھیں۔ **ممتاز صحافی سرفراز سیّد** نے اظہر جاوید کو دوستی کی قدروں کو خلوصِ قلب سے نبھانے والا انسان قرار دیا۔ **محترمہ بسمل صابری** اس تقریب میں شرکت کے لئے خصوصی طور پر ساہی وال سے تشریف لائیں تھیں انہوں نے غم لرزہ آواز میں اظہر جاوید کو منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا، چند اشعار حسبِ ذیل ہیں:

ہمارے عہد کا اِک دیدہ ور چلا ہی گیا وہ پُرخلوص سا انساں مگر چلا ہی گیا
رُخِ حیات پہ رونق اُسی کا دم سے تھی زمانے بھر کو دکھا کر ہُنر چلا ہی گیا
تھا اس کو تیز ہواؤں کا سامنا بسمل گلے لگا کے وہ برق و شرر چلا ہی گیا

پروفیسر حسن عسکری کاظمی نے اظہر جاوید کی ادب کے لئے خدمات کا تذکرہ کیا تو یہ بھی کہا کہ آج کے بیشتر نامور لکھنے والوں کی تربیت ''تخلیق'' کے گہوارے میں ہوئی تھی۔ **محترمہ بشریٰ رحمان** نے کہا کہ ہر انسان دنیا میں ایک خاص مشن لے کر آتا ہے۔ اظہر جاوید محبتیں تقسیم کرنے اور ادب کی تخلیقی خدمات انجام دینے کا مشن لے کر آئے تھے۔ انھوں نے خصوصی طور پر خواتین کو ادب کی طرف راغب کیا اور ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو اُجاگر کیا۔ **ڈاکٹر انور سدید** اپنا خراجِ تحسین مقالے کی صورت میں لکھ کر لائے تھے لیکن ان کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے اور وہ اپنا مضمون پڑھ نہ سکے تاہم ان کا تاثر یہ تھا کہ اظہر جاوید کی شخصیت کے عقب میں درد کی ایک لہر ہمیشہ موجزن رہی لیکن انھوں نے اس درد کو منکشف نہ ہونے دیا اور ہمیشہ ادبی محفلوں کو مہکائے رکھنے میں کامیابی حاصل کی۔ ''تخلیق'' ان کی رگِ جان تھے جسے سونان اظہر جاوید نے جاری رکھ کر باور کروایا کہ اظہر جاوید ہم میں موجود ہیں۔ صدرِ محفل **ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا** نے اظہر جاوید سے اپنی پہلی ملاقات کے ذکر سے آغاز کیا جو بے دل پانی پتی نے کرائی تھی اور بتایا کہ ان کی دوستی 45 برس تک پھیلی ہوئی ہے۔ انہوں نے خصوصی طور پر بتایا کہ ادب اظہر جاوید کا اوڑھنا بچھونا تھا اور وہ نئے لکھنے والوں کی ادبی بصیرت کو ابتدا میں ہی پہچان لیتے اور پھر اس کے ذوق کی پرورش کرنے لگتے۔ انہوں نے اظہر جاوید کو محبتیں کرنے والا انسان شمار کیا۔ سونان اظہر جاوید کی تحسین کی کہ اُنہوں نے ''تخلیق'' کو جاری رکھا۔ انہوں نے اظہر جاوید کے غیر مطبوعہ ادب پاروں کی اشاعت کی طرف بھی توجہ دلائی۔ آخر میں **سونان اظہر جاوید** نے مہمانوں کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کیا کہ وہ موسم کی خرابی کے باوجود اظہر جاوید کی یادوں میں شرکت کے لئے تشریف لائے تھے اور افسوس کا اظہار کیا کہ **جناب خالد محمود، جناب عزیز میرٹھی، محترمہ بشریٰ اعجاز** علالت کی وجہ سے اور **افتخار مجاز، اعزاز احمد آذر** فیملی فنکشن کی وجہ سے تشریف نہ لا سکے۔ میں ان تمام دوستوں کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے باقاعدہ معذرت کے فون کئے اور اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ تقریب کے نمایاں شرکا میں ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، محترمہ بشریٰ رحمان، ڈاکٹر انور سدید، پروفیسر حسن عسکری کاظمی، بسمل صابری، سرفراز سیّد، سیّد شاہد بخاری، محمد سلیم اختر (آرٹسٹ)، راجہ اسد علی خان، ڈاکٹر کنول فیروز، قاضی منشا، جاوید منظور، گلوکار شوکت علی، نوید قتیل، ریاض قادر، عزیز شیخ، زاہد ہما، طاہر منظور، محترمہ تسنیم منٹو، سیما پیروز لبنیٰ جاوید، بینا طاہر، سعدیہ سونان، عمرانہ مشتاق، پروین سجل اور صائمہ اشتیاق شامل تھیں۔

(دائیں سے بائیں) ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، پروفیسر حسن عسکری کاظمی، سیّد شاہد بخاری
ریاض قادر، عمرانہ مشتاق، عزیز شیخ، سونان اظہر جاوید، راجہ اسد علی خان، منشا قاضی

(دائیں سے بائیں) محترمہ تسنیم منٹو محترمہ بشریٰ رحمان، محترمہ بسمل صابری، محترمہ سیما پیروز
محترمہ پروین سجل، محترمہ لبنیٰ جاوید، محترمہ سعدیہ سونان، محترمہ عمرانہ مشتاق، محترمہ بینا طاہر

انجمنِ خیال (خطوط)

﴿1﴾ عزیز از جان سونان صاحب! دعائیں

آپ کو کل ٹیلی فون پر عید کی مبارک دی تو بعد میں مجھے کئی برس پہلے کی وہ عید یاد آئی جو میں نے قتیل شفائی کے گھر منائی تھی اور جس میں احمد ندیم قاسمی بھی شریک تھے۔ میرا جب بھی لاہور جانا ہوتا تھا میرا قیام قتیل صاحب کے گھر ہی میں ہوتا تھا جس کی خبر لاہور کے اخبارات میں شائع ہو جاتی تھی اور کئی روز تک قتیل صاحب کا گھر میرے ملنے والوں کا مہمان خانہ بنا رہتا تھا۔

ہم ہریانہ اُردو اکادمی کے زیرِ اہتمام ہر سال چنڈی گڑھ میں ایک شاندار انڈو پاک مشاعرہ کا انعقاد کرتے تھے اور ''پاکستان سے کن شعرا یا شاعرات کو مدعو کیا جائے'' اس کی ذمہ داری میں نے قتیل صاحب کو سونپ رکھی تھی۔ یہ شاید 1984 کی بات ہے۔ اس مشاعرے کے لئے قتیل صاحب نے کہا کہ اس برس لاہور سے اظہر جاوید اور بشریٰ اعجاز کو دعوت نامے بھجواؤں۔ یہ اظہر جاوید کے چنڈی گڑھ آنے کا پہلا موقع تھا۔ بمبئی سے میں نے سردار جعفری اور کیفی اعظمی کو مدعو کیا تھا۔ مشاعرے کی صدارت کنور مہندر سنگھ بیدی نے کی۔ سچ مانئے اس مشاعرے کی دھوم ایک عرصہ تک مچی رہی۔ اُس کے بعد میں ہر برس اظہر جاوید کو دعوت نامہ بھیجتا لیکن ''تخلیق'' میں اُن کے لکھے ہوئے ایڈیٹوریل کا جادو تھا کہ انہیں پاکستان سے یہاں آنے کا کبھی ویزا نہیں ملا۔ البتہ میں جب کبھی لاہور جاتا تو اظہر جاوید صاحب سے ہمیشہ ملاقات ہوتی۔

تخلیق کے ستمبر کے شمارے میں کئی جگہ سرگودھا کا ذکر آیا ہے۔ سرگودھا سے میرا بھی ایک رشتہ ہے۔ سرگودھا سے میرا ایک تعلق الطاف مشہدی کی وجہ سے بھی ہے۔ وہ سرگودھا سے ایک پرچہ ''ہملوگ'' نکالتے تھے۔ میں انہیں اکثر جموں 'بزم ادب' کے مشاعروں میں بلاتا رہتا تھا۔ وہ لمبی قمیص اور رنگدار تہمد میں بڑے پروقار لگتے تھے۔

بعد میں سرگودھا اور خوشاب سے میرا ذاتی رشتہ اس وقت استوار ہوا جب میری پہلی پوسٹنگ نوشہرہ میں ہوئی اور احمد ندیم قاسمی صاحب سے میری پہلی ملاقات اُن کے گاؤں انکہ میں ہوئی جو نوشہرہ سے کوئی تین میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ یہ ملاقات بعد میں مستقل دوستی میں بدل گئی جو اُن کی وفات تک قائم رہی۔

میں سمجھتا ہوں کہ اب اظہر جاوید کے جانشین مولا نا صاحب سے بھی محبت اور خلوص کا یہ رشتہ قائم رہے گا اور میں سونان کے ساتھ اظہر جاوید سے بھی مل لیا کروں گا۔

کشمیری لال ذاکر (چنڈی گڑھ)

....

﴿2﴾ عزیز گرامی سونان اظہر جاوید!

تخلیق دسمبر 2012ء دست بدست ملا، ظفر چترالی بھائی نے شام کے وقت میرے غریب خانے کو نگارخانۂ تخلیق بنادیا وہ جس والہانہ انداز میں آپ کا پیغام اور سلام محبت لے کر مثالِ مژدۂ فصلِ گل، داخل ہوئے، مجھے یوں محسوس ہوا کہ ان سے برسوں کی شناسائی ہے، انہوں نے جریدۂ صدرنگ میری طرف بڑھایا تو حرفِ دعا میری زبان پر جاری ہوا کہ اظہر جاوید کا مظہر بن کر سونان آئینۂ تخلیق میں اسی خط وخال کے ساتھ حیاتِ جاوداں پائے۔

مجھے یاد ہے کہ 1978ء میں میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ پھر اظہر جاوید سرخ وسفید، چھریرہ بدن، سیاہ بال، سوٹ پہنے اور ٹائی لگائے ہمعصر دوستوں کے ساتھ ہنستے، کھل کھلاتے اور ماں بولی میں گفتگو کرتے دکھائی دیتے' ان سے بھگوان سٹریٹ میں ملاقات ہوا کرتی وہ کتابوں کے درمیان یوں بیٹھے رہتے جیسے کتابوں نے انہیں باندھ کر رکھا ہوا ہو، وہ کتاب کے عاشق اور ترسیل فکر کے رسیا، اب وہی اوصاف مجھے آپ میں دیکھنے کو ملے تو خیال آیا کہ آپ اپنے بابا کے نقش قدم پر چلنے کا عہد نامہ لکھ کر ''تخلیق'' کی زمامِ اشاعت سنبھال چکے ہیں۔ اس اعتبار سے اظہر جاوید کی روح مطمئن ہے کہ بھگوان گلی سے ڈیفنس چوک کی طرف رخ کرنے کے باوجود ''تخلیق'' اپنے ادبی مقام پر قائم ہے۔ اور یہ دمکتے چمکتے اوراق کا خوبصورت گلدستۂ ہنر ہے۔ تخلیق کاروں نے کمال فن کاری کے ساتھ اسے ادب کا جاذبِ نظر مرقّع بنادیا ہے۔ اسلم گورداسپوری نے اظہر جاوید کے ساتھ اپنی محبتوں کا ذکر کر کے ہماری آنکھیں نم کردیں۔ سلمٰی اعوان بیک وقت سفر نامہ نگار اور افسانہ نگار ہیں اور کبھی دل چاہے تو آزاد نظم تخلیق کر کے ہمیں چونکا دیتی ہیں۔

نیا سلسلہ ''محبت'' کے تحت دوستوں کے دوست اظہر جاوید کے خطوط......معاصرین کے نام......مطالعے سے یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اظہر جاوید نے معاشرتی احوال کی آئینہ داری کے لیے دوستوں کو خط لکھتے ہوئے اپنا دل کھول دیتے تھے، وہ سچی اور کڑوی بات برملا کہتے ہوئے ذرا نہیں جھکتے تھے، وہ عقائد، نظریات اور اختلافات کے اظہار میں کسی مصلحت کے قائل نہیں تھے۔ وہ خط لکھتے ہوئے قلم برداشتہ اور بے تکان ہر وہ بات ضبط تحریر میں لانا پسند کرتے، جو انہیں گدگداتی تھی مثلاً ایک خط کے آخر میں لکھتے ہیں......اور کیا لکھوں......کہ لکھنا تو دراصل آپ کا کام ہے، ہم تو پڑھتے ہیں اور لطف لیتے ہیں (اظہر جاوید بنام ڈاکٹر انور سدید) نواب مصطفٰے خان شیفتہ، ڈاکٹر انور سدید کا مضمون بانداز دگر آیا ہے۔ یہ مضمون معلومات افزا ہے کہ نواب شیفتہ صاحب ''رجو'' پر ریجھ گئے اور اس عاشقی میں رسوائی بھی ہوئی، نواب صاحب نے بجا فرمایا:

ع اس زلف پیچ پیچ میں الجھی ہے جاں ہنوز

اس زمانے کے بزرگوں میں دونوں وصف بیک وقت موجود تھے۔ ایک طرف عشق میں شیفتہ کی بے قراری دیدنی ہے اور دوسری طرف سید احمد شہید بریلوی کے ساتھ ان کی تحریک جہاد سے ذہنی وابستگی کے اشارے بھی ملتے ہیں۔

منظومات میں تبرکات کے طور پر ڈاکٹر وزیر آغا اور غلام الثقلین نقوی شامل ہیں...... یہ اچھی روایت ہے، غزلیں کہنے والوں میں کشمیری لال ذاکر اعزاز احمد آذر، کرامت بخاری، بیدار سرمدی، رفیع الدین ذکی، کرشن کمار طور، پرتپال سنگھ بیتاب، باقر رضا، میثم علی آغا اور امتیاز کاظمی کے علاوہ دوسرے بہت سے شاعر ''تخلیق'' کے حلقہ اثر میں نظر آئے۔

عزیز گرامی! بلاتکلف یہ بتانا ضروری ہے کہ جس جذب وشوق کے ساتھ یہ ذمہ داری قبول کی ہے،اب اس ذمہ داری کو نبھانا بھی ہے، بلکہ آپ نے تو خود اعتراف کیا ہے کہ ''دم ہے تو تخلیق پیہم رہے گا اور یہ علامت'' ''افکار'' ''صریر'' ''تقاضے'' اور ''طلوع افکار'' جیسے رسائل کی صف میں شامل نہیں ہوگا (انشا اللہ) جو مدیر اعلیٰ کی وفات کے ساتھ ہی مرحوم ہو گئے۔''

آخر میں یہ کہنا ضروری ہے کہ اگر تخلیق زندہ ہے تو اظہر جاوید بھی حیات ابدی سے ہمکنار ہے کیوں نہ ہو کہ سونان جاوید اظہر پوری آن بان سے تخلیق کا نگہبان ہے۔

حسن عسکری کاظمی (لاہور)

....

﴾3﴿ عزیزم سونان اظہر۔ دعائیں!

''تخلیق'' کا تازہ ترین شمارہ موصول ہوا۔ شکریہ! اس بات کا بھی کہ آپ نے اپنے والدِ مرحوم کے بلند کئے ہوئے علم کو جھکنے نہیں دیا۔ سرورق سے لے آ کر آخری صفحے تک یہ ایک معیاری جریدہ ہے۔ ''اپنی بات'' میں آپ نے جس مسئلے کو چھیڑا ہے دراصل اب وہ لاعلاج مرض بن چکا ہے۔ جس ملک میں خواندگی کا معیار مسلسل گرتا جارہا ہو اور ''انگلش'' میڈیم کی میزبانی سے بچے الف سے ی تک گنتی بھی نہ جانتے ہوں اور یہ پوچھیں کہ چھپن کا مطلب کیا ہے، وہاں ادب کی آبیاری اور ترقی کی کیسے امید رکھی جاسکتی ہے۔ لیکن امید پر دنیا قائم ہے۔ کبھی تو اللہ ہمارے دن اور حالات بھی بدلے گا۔

میں مضامین پر تبصرہ عموماً نہیں کرتا لیکن آپ کی ادارت میں شائع ہونے والے شمارے کو میں نے بغور پڑھا ہے اور اچھی رائے قائم کی ہے۔ آپ نے اچھا کیا کہ آغاز ہی ڈاکٹر انور سدید کے مضمون سے کیا۔ نواب مصطفٰے خان شیفتہ کو وہ شہرت اور ناموری نہ مل سکی جس کے وہ مستحق تھے لیکن ان کا کلام آنے والے وقت میں ان کی شہرت اور مقبولیت کا سبب بن جائے گا۔ مرزا غالب کے وہ محبوب تھے۔ غالب کے بہت سے خطوط ان کا نام لکھے گئے ہیں یا خطوط میں ان کا تذکرہ ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شیفتہ کو کس قدر عزیز رکھتے تھے۔ شیفتہ مزید مقالات کے حقدار ہیں جن میں تفصیل سے ان کی شاعری کا جائزہ لیا جائے تاکہ ان کے ساتھ انصاف کیا جاسکے۔ ''پل دو پل کا شاعر'' ساحر لدھیانوی کے حوالے سے لکھا گیا ہے۔ یہ بہت مختصر جائزہ ہے۔ جو اشعار درج کئے گئے ہیں ان میں اکثریت ان اشعار کی ہے جو ساحر نے فلموں کے لئے لکھے تھے۔ ساحر کا کمال یہ تھا کہ انہوں نے اپنی فلمی شاعری میں بھی ادبی معیار برقرار رکھا۔ انہوں نے فلمی شاعری میں ایک نیا رنگ اور آہنگ پیدا کیا۔

ساحؔر کی زندگی کا آغاز اور انجام دونوں ہی غمگین کردینے والے تھے۔ بچپن والد کی بے رخی اور بے تعلقی کے باعث تلخیوں کی نذر ہوگیا اور حساس ساحؔر کے دل پر نقش ہو کر رہ گیا۔ وہ اپنی والدہ کے شکرگزار بلکہ معترف تھے جنہوں نے ساحر کو ایک خوددار انسان بنایا اور ان کی پرورش کی۔ ماں سے انہیں سب سے زیادہ محبت تھی۔ میرے ایک مضمون کے جواب میں ان کی سوتیلی بہن کا خط مجھے موصول ہوا تھا جس میں انہوں نے انکشاف کیا تھا کہ ساحر کی ایک بار منگنی ہوئی تھی اور شادی کی نوبت آنے والی تھی مگر ایک دن منگیتر نے بے تکلفی یا شوخی سے ان کی لمبی ناک پر فقرہ کس دیا تو اپنی ناک اونچی رکھنے کے لئے ساحر نے یہ منگنی توڑ دی، اس کے بعد انہوں نے منگنی تو نہیں توڑی مگر دل توڑتے رہے۔

ساحرلدھیانوی کی زندگی میں بہت تلخیاں تھیں۔ ہوش سنبھالنے کے بعد ہی انھیں جن گھریلو حالات سے واسطہ پڑا وہ بہت ہی زیادہ تکلیف دہ اور تلخ تھے۔ یہ تلخیاں تمام زندگی وہ بھول نہ سکے، زندگی کے مختلف مراحل میں انھیں ایسے ہی حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ کالج چھوڑنے کے بعد بھی انھیں بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا پھر جن حالات میں چپکے سے بھیس بدل کر وہ پاکستان سے روانہ ہوئے وہ بھی خوش کن نہ تھے۔ممبئی پہنچ کر بھی وہ مشکلات سے چھٹکارہ حاصل نہ کرسکے۔ بے روزگاری اور معاشی پریشانیوں نے انھیں اپنے گھیرے میں لئے رکھا۔ ساحر میں خوداعتمادی بہت زیادہ تھی انھیں یقین تھا کہ وہ ایک بہت اچھے شاعر اور دادِ تحسین کے مستحق ہیں۔ ممبئی میں ان کے دوستوں اور مداحوں خصوصاً کرشن چندنے بہت حوصلہ اور سہارا دیا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ ان کے گھر میں انہیں ساحر کے مزاج پہ بارگزرتا ہے تو انھوں نے فلم سازوں اور ہدایت کاروں سے ساحرلدھیانوی کو ملوایا لیکن کسی نے ساحر کو اہمیت نہیں دی نہ ہی ان سے فلمی گیت لکھوائے۔ یہ بھی ایک ایسا گھاؤ تھا جو آخر دم تک انھیں تکلیف دیتا رہا۔ جب انھیں مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی تو انھوں نے ایک ایک کر کے تمام بدلے چکائے۔فلم سازوں سے توہین آمیز سلوک کرنا اور ان سے اپنی شرائط منوانا بھی اسی کا ردعمل تھا۔ یوں سمجھئے کہ یہ ان کا انتقام تھا جب کہ انھوں نے خود ایک شعر میں اظہار کیا ہے۔

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں   جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہاہوں میں

یہ ایک شعر ان کے جذبات کا نچوڑ سمجھ لیجئے۔

رومانی داستانوں سے قطع نظر ساحرصاحب کو صرف اپنی ماں سے محبت تھی۔ دوسری حسیناؤں کے لئے ان کے دل میں گنجائش نہیں تھی۔ وہ اپنی ماں کی پرستش کرتے تھے اور دنیا میں وہی ان کے لئے سب سے بڑا سہارا تھیں۔ ماں کی وفات نے ساحر کو ایسا صدمہ پہنچایا جس سے وہ جان بر نہ ہوسکے۔ ان کے دوستوں کو بھی ان سے شکایت پیدا ہوگئی۔حمیداختر کا بیان ہے کہ جب وہ آخری بار بمبئی گئے تو مشترکہ دوستوں نے انھیں خبردار کردیا تھا کہ ساحراب بھلا ساحرنہیں رہا ہے۔تم اس کے پاس جاکر نہ ٹھہرنا مگر جب وہ ساحر کے گھر پہنچے تو تمام تر شکستہ دل کے باوجود انھوں نے حمیداختر کوخوش آمدید کہا اور ان سے پہلے کی طرح گھل مِل گئے۔ ساحر کی زندگی کا آغاز بھی تلخیوں سے بھرا ہوا تھا اور ان کی زندگی کے آخری ایام بھی بہت تلخ گزرے۔ وہ تقریباً گوشہ نشین ہوکررہ گئے تھے۔ مسکراہٹ اور خوشی ان کی زندگی سے رخصت ہو چکی تھی۔ بدمزاجی اور تلخ کلامی ان کا شیوہ بن چکا تھا۔ انھیں تنہائی سے خوف آتا تھا مگر عجب بات یہ ہے کہ وہ دوستوں تک سے ملنا گوارہ نہیں کرتے تھے۔ انھیں ہردم موت کا دھڑکا لگا رہتا تھا۔ یہاں تک کہ موت نے ان کی تمام مشکلات آسان کردیں۔

علی سفیان آفاقی (لاہور)

....

﴿4﴾ عزیزم سونان اظہر:

''تخلیق'' کا نیا شمارہ موصول ہوا۔خوشی ہوئی کہ آپ کی ادارات میں یہ شمارہ بھی دیدہ زیب شائع ہوا ہے۔تخلیقات کا معیار تو وہی ہے جو بھائی اظہر جاوید کے وقت ہوا کرتا تھا۔ اور یہ معیار کسی معیاری ادبی رسالے کے عین مطابق تھا۔ یہ دیکھ کر روحانی مسرت ہوتی ہے کہ ''تخلیق'' کو ہمیشہ ممتاز اہلِ قلم کا تعاون حاصل رہا۔ جہاں تک قارئین کی پسند کا سوال ہے یہاں ہندوستان میں کسی بھی رسالے میں قارئین کے چار چھ سے زائد خطوط شائع نہیں ہوتے۔ ''تخلیق'' میں جو کثیر خطوط شائع ہوتے ہیں ان کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ لوگ سنجیدگی سے مطالعہ کرنے کے بعد اپنی رائے لکھتے ہیں۔ اس بار انجمن خیال میں آپ نے 36 خطوط شائع کئے ہیں۔ اس

سلسلے میں محترمہ تسنیم فاطمہ راولپنڈی کا خط بہت اچھا لگا اظہر جاوید کا یہ کہنا ''بی بی تم مجھے نانا کہہ لو، دادا کہہ لو، بڑھا بابا کہہ لو، نانا کہہ لو، چاچا کہہ لو......اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سارے بزرگ رشتوں میں جینا چاہتے تھے۔ایسے رشتے جن کے منھ سے صرف دعائیں نکلتی ہیں۔نیا سلسلہ محبت شروع کر کے آپ نے اظہر جاوید کی ایک اور شخصیت کو متعارف کرانے کام کیا ہے۔ہم آپ کے شکر گزار ہیں۔

....

نذیر فتح پوری (پونہ بھارت)

﴿5﴾ جانِ عزیز سونان اظہر جاوید!

اپنی روایتی آن بان بلکہ رنگین ریشمی کاغذ کے پیرہن اور تراش خراش میں پہلے سے کہیں زیادہ دلکش و نظر افروز ''تخلیق'' کا دسمبر کا شمارہ ملا۔''اپنی بات'' پڑھ کر اپنی بے مائیگی کا احساس شدت سے ہوا، دسمبر کی یخ بستہ شام کے سر پہ ہونے کے باوجود پیشانی عرق انفعال سے شرابور ہوگئی۔کاش خاکسار آپ کا ہاتھ بٹا سکتا مگر ''اے بسا آرزو خاک شدہ''۔مرزا غالب کے دوست نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ جنہیں نئی نسل فراموش کر چکی ہے۔ان کے حال احوال اور فن و شخصیت کو محترم ڈاکٹر انور سدید نے کیا خوب بیان کیا ہے۔گویا سمندر کو سیپ میں سمو دیا ہے۔اسی طرح سکندر حیات میکن نے ''پل دو پل کا شاعر'' کے عنوان سے شعلہ مستعجل ساحر لدھیانوی کی شاعری اور اس کی دکھی زندگی پر بڑی دردمندی سے روشنی ڈالی ہے۔ثمینہ سید کی پُر تحریر پر اثر ہے۔مراق مرزا کے افسانے ''ایک دہشت گرد کا بیان'' کا مرکزی خیال موجودہ دہشت گردی کی نشاندہی کرتا ہے، لیکن دہشت گرد ماں کے پیٹ سے جنم نہیں لیتا۔بھوک، استحصال، ظلم اور ناانصافی کی کوکھ سے جنم لیتا ہے ''بڑی مشکل ہے ڈگر پنگھٹ کی'' زہیرہ سمن علی کی چھوٹی سی کہانی کا انجام چونکا دیتا ہے۔نجیب عمر کا جذبۂ عشق دوراز کار تشبیہات و استعارات اور بھاری بھرکم لفاظی سے پُر ایک سبق آموز افسانہ ہے۔''پانی پر لکھی نصیحت''، شاہانہ طرز بیان میں طنزیہ، عبرت ناک، فکر انگیز علامتی افسانہ۔دردانہ نوشین خاں کی عمدہ کاوش ہے۔غلام الثقلین نقوی کی ڈائری بھی قابل توجہ تحریر ہے۔طارق محمود ذکا ''سفر شمال''، نذیر فتح پوری کی آپ بیتی، شفیع عقیل کی یادنگاری اور پروفیسر جمیل آذر کا تبصرہ ''روس کی ایک جھلک''، سب معیاری مضامین ہیں۔آپ نے تخلیق کے قائم کردہ بلند معیار کو گرنے نہیں دیا۔لگتا ہے آپ کے اندر بھی ایک ادیب و مدیر چھپا بیٹھا تھا۔جو مرحوم اظہر جاوید کی کمی پوری کرنے کے لئے اب منصۂ شہود پر نمودار ہوا ہے۔میری ناقص رائے میں پرچے کی دوماہی اشاعت ہی مناسب ہے۔

....

عزیز میرٹھی (لاہور)

﴿6﴾ محترم سونان اظہر جاوید!

''تخلیق'' کا تازہ شمارہ اپنی تمام تر علمی و ادبی انفرادیت کے ساتھ موصول ہوا۔گو کہ اظہر جاوید اپنے ابدی سفر پر جا چکے ہیں، لیکن رسالہ ''تخلیق'' کی آمد ہمیشہ یہ احساس دلاتی ہے کہ وہ ہمارے درمیان موجود ہیں۔سانسوں کا سفر جہاں ختم ہوتا ہے ایک تخلیق کار کی حقیقی زندگی دراصل وہاں سے شروع ہوتی ہے۔ ''تخلیق'' کے تعلق سے یہ بات قابل غور ہے کہ اس کے معیار و وقار میں ذرہ برابر بھی کسی طرح کی کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔اظہر جاوید کی اس انمول ادبی وراثت کو آپ نہایت خوبصورتی و عمدگی سے آگے بڑھا رہے ہیں۔(اعلاعاً عرض ہے کہ زرِ سالانہ محترم نارنگ ساقی صاحب کو ارسال کر دیا گیا ہے)

....

مراق مرزا (بمبئی۔بھارت)

﴿7﴾ عزیزم سونان اظہر۔دعائیں!

آپ جس ذوق وشوق سے اپنے والد کی وراثت کے تقاضوں کو سنبھال رہے ہیں آج کے پرآشوب عہد میں اس کی مثالیں کم کم ہیں۔جناب اظہر جاوید کی روح مقام ارفع پر پُرسکون ہوگی۔گوشۂ اظہر جاوید،حالیہ شمارے میں اسلئے بھی نظرنواز ہے کہ اس میں اظہر جاوید کی نظمیں،غزلیں خطوط،شامل ہیں۔مروجہ حصّوں کی طرح ارتقائی زاویے بھی چشم منظر تک آئے۔''نواب مصطفیٰ خان شیفتہ'' ریسرچ اور تنقید کا مرکز ہیں،ڈاکٹر انور سدید نے اس حوالے سے بہتر رہنمائی کی ہے۔نظموں میں ڈاکٹر وزیرآغا،غلام الثقلین نقوی اور صفدر صدیقی رضی کی تخلیقات دسمبر کے''تخلیق''کو مقام رفعت دے رہی ہیں۔افسانے میں زہیرہ سمن علی نے''بڑی مشکل ہے پنگھٹ کی ڈگر''میں اپنی منفرد صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔حسن عسکری کاظمی،اعزاز احمد آذر،میثم علی آغا،کا کلام دل میں اتر گیا جبکہ ڈائری، انشائیہ،آپ بیتی،یادنگاری اور جائزے کو میرے خیال میں زیادہ ضخامت کی ضرورت ہے۔تاہم ان کو جگہ دینا بھی آپ کی جانب سے ان اصناف کی قدر افزائی ہے جس سے ادب Static ریجن سے dynemic ریجن میں جاتا نظر آ رہا ہے۔غزل کے حوالے سے درجِ ذیل اشعار نے خود کو دیر تک محسوس کرایا۔

پڑھوں گا تم کو لکھوں گا تم کو یہ فیصلہ تھا
رہو گے میری کتاب بن کر یہ طے ہوا تھا

گمرہی میری مجھے راہ پہ لا چھوڑتی ہے
مرے تلووں میں کوئی شے ہے تھکن سے باہر

اگر مل جائے تم کو تو خبر کرنا ہمیں بھی
متاعِ عافیت جانے کہاں رکھی ہوتی ہے

سلیمان خمار (انڈیا)

....

﴿8﴾ محترمی سونان اظہر جاوید!

میرے دوست اور مہربان اظہر جاوید صاحب بے شمار خوبیوں کے مالک تھے۔وہ ایک مخلص اور محبت کرنے والے انسان تھے۔ان کی رحلت سے اردو ادب کو بہت نقصان ہوا ہے۔دسمبر کے شمارے میں شفیع عقیل صاحب کا کرنل مجید ملک پر مضمون ایک خوبصورت تحریر ہے۔جائزے میں پروفیسر جمیل آذر روس کی ایک جھلک خاصے کی چیز ہے۔ذاکر سلیم آغا قزلباش کے انشائیے نے بہت متاثر کیا۔انہوں نے اس انشائیے میں تھکن کے مختلف پہلوؤں کا ذکر کیا ہے جو عام لوگوں کی نظروں سے اوجھل تھے۔غلام الثقلین نقوی کی ڈائری سنگریزے اور جواہر بہت خوبصورت ہے۔نقوی صاحب کی ذاتی ڈائری سے معلوم ہوا ہے کہ انہیں سانس کا مرض تھا اور وہ''اِن ہیلر''بھی استعمال کیا کرتے تھے۔ڈاکٹر انور سدید کا مضمون نواب مصطفےٰ خان شیفتہ کا مطالعہ کرنے کے بعد میری معلومات میں چندنئی باتوں کا اضافہ ہوا ہے۔عزیز میرٹھی،ثمینہ سید،زہیرہ سمن علی اور دردانہ نوشین کے افسانے دامن دل کو چھوتے محسوس ہوئے۔اللہ تعالیٰ تخلیق کی شمع کو تادیر اسی طرح روشن اور تابندہ رکھے آمین۔

شفیع ہمدم (فیصل آباد)

....

﴿9﴾ محترمی!

''تخلیق'' کا تازہ شمارہ (دسمبر 2012ء) کونظرنواز ہوا۔ ماشاءاللہ آپ نے اس کے روایتی معیار کو برقرار رکھا ہے۔آپ نے ''پہلی بات'' میں کتاب اورادبی جریدے کے حوالے سے جوتقابلی جائزہ پیش کیا ہے میں اس سے سوفی صد متفق ہوں۔ بلاشبہ ''ادب کے فروغ میں باقاعدہ چھپنے والے رسائل دوسرے ذرائع ابلاغ کے مقابلے زیادہ خدمت انجام دے رہے ہیں۔'' ''نواب مصطفیٰ خان شیفتہؔ'' (ڈاکٹر انور سدید) اور ''پل دو پل کا شاعر'' (سکندر حیات میکن) فکرانگیز مضامین ہیں۔عزیز میرٹھی صاحب کو میں بہت دلچسپی سے پڑھتا ہوں۔اس مرتبہ ان کی دوتحریریں شائع ہوئی ہیں۔ایک (''نکلے ہوئے جنت سے'') آپ بیتی کے تحت اور دوسری (''گورے کالے'') افسانے کے تحت۔ دراصل موخرّ الذکر بھی اپنی نوعیت میں آپ بیتی ہی ہے اور مجھے اس میں مبالغے کا رنگ زیادہ نظر آیا۔ ''انشورنس'' (ثمینہ سید)، ''بڑی مشکل ہے پنگھٹ کی ڈگر'' (زہیرہ سمن علی) اور ''جذبۂ عشق'' (نجیب عمر) معیاری افسانے ہیں۔غلام الثقلین نقوی صاحب کی ''ڈائری'' نے کئی پرانی یادیں تازہ کر دیں۔اسلوب میں افسانوی رنگ نمایاں ہے جو اُن کا طرۂ امتیاز تھا۔ ''تھکن'' (سلیم آغا قزلباش) بہت عمدہ انشائیہ ہے۔ مجھے اس میں یہ جملہ بہت پسند آیا جو ایک آفاقی حقیقت کی عکاسی کرتا ہے۔

''جب کوئی قوم تھکن کی زد پر آئی تو اُس کا شیرازہ بکھرنے لگا''۔

''بیتے کل کا اک اک پل'' (نذیر فتح پوری) میں یہ پڑھ کر ''روحانی تکلیف'' ہوئی کہ پونا کے جعلی پیر ''ہرے بھرے بابا'' کو مصنّف کے درود شریف پڑھنے پر ''روحانی تکلیف'' ہوئی حالانکہ وہ درود شریف پڑھ بھی نہیں رہے تھے۔تاہم عقیدت اندھی ہوتی ہے۔ اُس فراڈ شخص کے پاس بھی ''اہل حاجت'' کا ہجوم لگا رہتا تھا۔''گوشہ اظہر جاوید'' کے مطالعہ سے مرحوم جیتے جاگتے ذہن میں آ گئے۔ شعری حصے کا انتخاب بھی خوب ہے۔

ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی (کراچی)

....

﴿10﴾ محترم سونان اظہر جاوید صاحب!

آپ کے والد گرامی کی ''روانگی'' کے موقع پر میں نے صرف ایک شعر کہا تھا:۔

''تخلیق'' کے دھارے سے جدا ہو نہیں سکتا　　مرجاؤں گا لیکن میں فنا ہو نہیں سکتا

مقام شکر ہے کہ تخلیق کا دھارا زوروں سے بہہ رہا ہے اور مدھوبن کے گردھر کی مُرلیا میٹھے سروں کے ساتھ اسی طرح بج رہی ہے۔آپ کا شمارہ نمبر۹ (ستمبر 2012) نظر کے سامنے ہے، جو ہرصورت سے ایک نہایت معیاری جریدہ ہے۔لاہور کے قدیم وجدید اورادب افروز رسالوں کی طرح اللہ آپ کو کامیاب کرے۔

تشنہ بریلوی (کراچی)

....

﴿11﴾ جناب سونان جاوید صاحب!

وہ ایک سیاہ رات تھی، جب نارنگ ساقی صاحب نے مجھے یہ خبر دی کہ تخلیق کے ایڈیٹر اظہر جاوید صاحب کا انتقال ہوگیا، مجھ پر گویا ایک سکتہ طاری ہوگیا اس لئے کہ میں ان کی دعوت پر پاکستان جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ اس خبر نے میرے ہوش اڑا دیئے، اظہر جاوید ایک اچھے شاعر، ادیب، صحافی ہی نہیں تھے وہ محبتوں کے پیکر تھے۔خاص طور پر ہندوستانی شاعروں ادیبوں سے انہیں خاص

لگاؤ تھا، یہی وجہ تھی کہ ''تخلیق'' میں بڑی تعداد میں ہندوستانی شاعروں، ادیبوں کی تخلیقات شائع ہوتی تھیں۔

اظہر جاوید صاحب سے تقریباً بیس سال سے میرے تعلقات تھے۔ ''تخلیق'' کا شاید ہی کوئی شمارہ ہوگا، جس میں میری کوئی چیز نہ چھپی ہو، یہی نہیں انھوں نے میری دو تین کتابوں پر مشہور ادیب نقاد انور سدید صاحب سے ایسے مضامین لکھوائے کہ ساری ادبی دنیا میں ان کتابوں کی شہرت ہوگئی، خاص طور سے میرے سفرنامے ''سرونج سے لندن تک'' اور میری آپ بیتی ''یہ تو سچا قصہ ہے'' پر ڈاکٹر انور سدید کے تبصرے۔ ان کے انتقال سے جو خلا پیدا ہوا ہے، وہ بھرنا تو ممکن ہی نہیں ہے لیکن جو مایوسی ''تخلیق'' کے بند ہونے سے ادبی دنیا میں چھائی ہوئی تھی، وہ اچانک ''تخلیق'' کا اظہر جاوید نمبر دیکھ کر خوشی میں بدل گئی۔ یہ کارنامہ ان کے لائق فرزند سونان اظہر جاوید نے انجام دیا۔ کاش بڑے بڑے شاعروں اور ادیبوں کی اولادیں سونان اظہر جاوید جیسی باپ سے محبت کرنے والی ہوتیں تو آج فنون، اوراق جیسے بڑے بڑے رسالے بند نہ ہوتے۔ مجھے یقین ہے کہ سونان اظہر جاوید اپنے والد کے ان تمام ادبی دوستوں کے تعاون سے ''تخلیق'' نکالتے رہیں گے، خاص طور پر انور سدید صاحب کا تعاون، اس لئے کہ اظہر جاوید کے نام کو زندہ رکھنے کے لئے تخلیق سے زیادہ کوئی دوسرا کام نہیں ہوسکتا۔

سیفی سرونجی (انڈیا)

....

﴿12﴾ مکرمی سونان اظہر جاوید!

''پہلی بات'' میں ادبی جرائد اور کتب کی اشاعت کے حوالے سے سچ کہا گیا۔ تخلیق کے زرسالانہ کی وصولیابی کے لئے آپ کا طرز عمل حقیقت پسندانہ اور پہلے سے مستعد ہے جبکہ اظہر جاوید مرحوم کا رویہ منکسرانہ تھا۔ وہ یقیناً اس کے لئے لائق تحسین تھے۔ مگر سرمایہ کے بغیر کام نہیں چلتا۔ رسالہ کی Pasting اور پیپر improved ہے۔ جہاں تک ''تخلیق'' کی مدت کے تعین کا تعلق ہے اسے سہ ماہی ہونا بہتر رہے گا، ماہانہ یا دو ماہی کی صورت میں جہاں آپ پر وقت کا بڑا حصہ مخصوص کرنے کا دباؤ ہوگا وہاں قارئین لکھاریوں پر بھی جلد لکھنے کا تقاضا پڑے گا۔ میانہ روی اور اعتدال سہ ماہی میں ہے۔ رسالہ بے شک سہ ماہی مگر باقاعدہ ہو اور ترسیل کا نظام بے عیب ہو۔

ڈاکٹر شباب للت کی دعائیہ نظم خوب ہے۔

غلام الثقلین نقوی ''میں ابھی نرسری میں پڑھتا ہوں'' گہرے خیال، صوفیانہ رنگ اور بندگی، بے چارگی کی مہکتی ہوئی نظم ہے۔

عزیز میرٹھی کا افسانہ ''گورے کالے'' گلیمر کی دنیا کے ستاروں کی کردار نگاری ہے جو کہکشاں بننے کے لئے راہیں کھوجتے ہیں۔ ویسے سوچنے کی بات ہے ستارہ مؤنث کے ساتھ جڑا ہوتا ہے۔ آنچل میں ہو، مانگ میں ہو یا پلکوں پر، ستارہ نام بھی مونث ہے مگر ستارہ بذات خود مذکر ہے۔

ثمینہ سید کا افسانہ ''انشورنس'' ایک ڈسکشن پوائنٹ ہے۔ مراق مرزا (انڈیا) نے بھی دہشت گرد کو موضوع بنایا مگر یہاں اُس مظلوم دہشت گرد کا ذکر ہے جس کے تمام پیاروں کو دہشت گردی اور ظلم کا نشانہ بنا کر اسے دیوار سے لگا دیا جاتا ہے۔

غلام الثقلین نقوی کی ڈائری ''سنگریزے اور جواہر'' خاصے کا مطالعہ تھا۔ فرخندہ لودھی کی ''میری کہانی'' بھی اچھی تحریر ہے اس کا مزہ خوب ہے جیسے تیز بھوک لگنے کے بعد گرم چپاتی، تازہ بگھاری دال اور دھنیا پودینہ ٹماٹر کی چٹنی کھانے کا تشکر آمیز مزہ ہو۔ ماضی آغوش مادر کی طرح ہوتا ہے ہمیشہ اپنی جانب بلاتا ہے زمانہ عسرت ہو یا راحت۔ ماضی کا بدل کوئی نہیں۔

تخلیق ستمبر 2012 چونکہ بہت Late ملا تھا لہٰذا اُس پر بات نہ ہو سکی۔ مگر یہاں ڈاکٹر ابدال بیلا کے مضمون ''پیا دیکھن کے آس'' کا ذکر ضرور کروں گی جو اظہر جاوید کے بارے میں ہے۔ ابدال بیلا کی تحریر لفظ لفظ، سطر سطر، دل و دماغ میں گھولنے، گھمانے اور روک کر پھر گھمانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ان کی تحریر پانچوں حسیّات میں چھٹی حس کے ادراک کو شامل کر لیتی ہے۔ بانصیب ہے وہ جس کے نصیب میں یہ تحریر ہوئی۔

.... دردانہ نوشین خان (مظفر گڑھ)

﴿13﴾ عزیز محترم سونان اظہر جاوید!

آپ سے اوّلین گفتگو عیدالضحیٰ کے چند روز بعد ہوئی تھی جب میں سرگودھا میں تھا۔ آپ نے رابطے میں پہل کی یہ آپ کی سعادت مندی کی دلیل ہے کہ اپنے والدِ محترم کے دوستوں کی عزت اور ان کا احترام کرتے ہیں۔

''تخلیق'' سے ہمیں پیار ہے اور اس کی باقاعدہ اشاعت میں معاونت کو ایک فریضہ سمجھ کر آئندہ بھی آپ کا ساتھ دیتے رہیں گے، انشاءاللہ۔ عزیز محترم! پرچے کا معیار پہلے جیسا نہیں ہے۔ تاہم اس شمارے کا سرورق بہت خوبصورت ہے۔ ورق ورق سے آپ کے جمالیاتی ذوق، جواں ہمتی اور مدیرانہ صلاحیتوں کا اظہار ہو رہا ہے۔ امید ہے آئندہ شماروں میں مزید نکھار کے ساتھ پہلا معیار واپس آئے گا۔ ''اختصار سے لکھئے'' تحریک وقت کی ضرورت ہے۔ میں آپ سے پوری طرح متفق ہوں۔ بالخصوص افسانوں میں ''اختصار لفظی'' ایک بنیادی عنصر کے طور پر شامل ہونا چاہیے۔ ان میں عزیز میرٹھی کا ''گورے کالے'' بہت پسند آیا۔ دیگر تحریروں میں ''سنگریزے اور جواہر'' انشائیہ ''تھکن''.....شہزاد نیّر کی نظم ''ہدایت کار'' اور گوشہ اظہر جاوید پسندیدگی اور تحسین میں سب سے آگے ہے۔

.... خاقان ساجد (راولپنڈی)

﴿14﴾ محترم سونان اظہر جاوید صاحب!

تخلیق کا تازہ شمارہ (دسمبر 2012ء) نظر نواز ہوا۔ شمارے کی تزئین و آرائش میں بہت ہی اہتمام اور توجہ خاص دی گئی ہے۔ آپ نے طباعت کو معیاری بنایا ہے۔ ''اظہر جاوید'' کل بھی ''تخلیق'' کے ماتھے کا جھومر تھا، آج بھی ہے اور ''تخلیق'' کے ماتھے پر یہ ہمیشہ سجا رہے گا، ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش کا انشائیہ ''تھکن'' پڑھ کر تھکن دور ہو گئی۔ غلام الثقلین نقوی کی نظم 'میں ابھی نرسری میں پڑھتا'' ہوں یقیناً دھیان کے آتش دان میں بہت سے در روشن کرتی ہے۔ آپ کی ہمت کی داد دیتا ہوں کیوں کہ آپ نے تخلیق کے آدرش کو گم نہیں ہونے دیا۔ ''انجمن خیال'' میں ''اظہر جاوید نمبر'' پر ملنے والی داد و تحسین صرف آپ کا طرۂ امتیاز رہے گی۔ افسانہ انشورنس (ثمینہ سید) اور ''پانی پر لکھی نصیحت'' (دردانہ نوشین) فکری حوالے سے عمدہ ہیں۔ خدا کرے کہ آپ ''تخلیق'' کو مستقل مزاجی کے ساتھ جاری رکھیں۔

.... سکندر حیات میکن (سرگودھا)

﴿15﴾ جناب سونان اظہر جاوید!

آداب۔ ماہنامہ ''تخلیق'' کا تازہ شمارہ دیکھ کر خوشی بھی ہوئی اور اطمینان بھی کہ ''تخلیق'' ایک بار پھر اپنے سفر پر رواں ہوا ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ پوری دل جمعی سے اس کام کو سرانجام دیں گے (آمین)۔ میرا قلمی تعاون ہمیشہ ''تخلیق'' کے ساتھ رہے گا۔

''نواب مصطفیٰ خان شیفتہ'' پر ڈاکٹر انور سدید اور ''ساحر لدھیانوی'' پر سکندر حیات میکن کے مضامین سیر حاصل تھے۔ جبکہ انسانوں میں ''گورے کالے'' (عزیز میرٹھی) اور ''جذبہ عشق'' (نجیب عمر) اچھے لگے۔

رومانہ رومی (کراچی)

....

﴿16﴾ عزیزم سونان جیتے رہو!

آپ کا دسمبر ۲۰۱۲ کا شمارہ مل گیا تھا۔ قبل اس کے آپ کا پہلا خط بھی ملا تھا۔ پہلے میں ہسپتال میں داخل تھا۔ گھر آنے پر بھی طبیعت زیادہ نہیں سنبھلی۔ جناب کنول فیروز کی لندن میں آمد کے باوجود ان سے ملاقات نہ ہوسکی۔ آپ مجھے بے حد عزیز ہیں۔ فی الحال صحت لکھنے لکھانے کی اجازت نہیں دیتی۔

خان پرویز (انگلستان)

....

﴿17﴾ محترمی!

دسمبر کا شمارہ ملا۔ جریدے کو خوشنما بنانے کیلئے آپ نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ آپ اور آپ کے معاونین مبارک باد کے مستحق ہیں۔ اگر کمپوزنگ کا font ذرا چھوٹا کر دیا جائے تو زیادہ تحریری مواد رسالے میں جگہ پاسکتا ہے۔ ایک ہر دل عزیز رسالہ تین ماہ کے بعد پڑھنے کو ملے اور اس میں میٹریل بھی کم ہو تو یقیناً مایوسی ہوتی ہے۔ اظہر جاوید جہاندیدہ ادیب تھے۔ اپنی پالیسیاں خود بناتے اور خود چلاتے تھے۔ اُن کے جانشین مخلص اور جذبے سے معمور ہیں۔ انہیں مفت کے مشورے دینے والے بہت ہوں گے اور اُنہیں مرغ دست آموز بنانے والے بزرگ بھی بہت ملیں گے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ نوجوان مدیر ''تخلیق'' کس طرح اپنے راستے خود بناتا ہے یا دوسروں کی انگلی پکڑنے میں عافیت محسوس کرتا ہے۔

غلام نبی اعوان (راولپنڈی)

....

﴿18﴾ محترمی سونان اظہر جاوید!

دسمبر کا ''تخلیق'' نظر نواز ہوا۔ بحمداللہ وہی معیار، وہی سج دھج، بے حد خوشی ہوئی کہ آپ نے اپنے والدِ محترم کی بے مثال ادبی روایت کو دم نہیں توڑنے دیا۔ یہ کام کٹھن ضرور ہے مگر ناممکن نہ تھا۔ خدا آپ کو استقامت عطا فرمائے۔

آپ نے اداریے میں ''تخلیق'' کے سچے خیرخواہوں کا ذکر کیا ہے، ایسی مہربان گھٹاؤں سے سیراب ہونے والے درخت سوکھا نہیں کرتے۔ انشاءاللہ تخلیق کا کارواں بھی رواں دواں رہے گا۔ عزیزی سحر حفیظ صاحبہ کی محنت بھی تخلیق کی حسن آرائی میں شامل ہے۔

اخلاق عاطف (سرگودھا)

....

﴿19﴾ عزیز محترم سونان اظہر جاوید!

ستمبر کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ ''اظہر جاوید نمبر'' کے بعد یہ آپ کی دوسری کاوش ہے۔ ''پہلی بات'' میں آپ نے وہ ساری باتیں کہہ دی ہیں جو میں آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا تھا۔ ادبی رسالے کی ادارت کا تجربہ آپ تیزی سے حاصل کر رہے ہیں۔ انشاء اللہ آپ ایک کامیاب مدیر ثابت ہوں گے۔

''گوشۂ اظہر جاوید'' کے عنوان سے لکھے گئے مضامین میں اظہر سے احباب کی محبت کا اظہار ہوتا ہے۔ شہزاد احمد کی آخری تحریر، ابدال بیلا کا مضمون اور ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش کا اظہر جاوید کی ذات کے ساتھ جڑے عشق و محبت کے افسانوں کا نفسیاتی تجزیہ بہت پسند آئے۔ ''تخلیق اظہر جاوید نمبر'' پر انور سدید اور قیصر نجفی کے تبصرے بڑے جاندار ہیں۔ سچ ہے ''اظہر جاوید نمبر'' دوستی محبت اور خلوص کا ایک حسین مرقع ہے۔ حصہ نظم و نثر کے انتخاب میں آپ نے بڑی جانفشانی سے کام لیا ہے۔ مبارکباد!

مظفر حسن منصور (جوہر آباد)

....

﴿20﴾ محترم سونان اظہر جاوید!

''تخلیق'' یقیناً اردو ادبی رسائل میں ایک نمایاں اور قابلِ قدر مقام کا حامل ہے۔ اظہر جاوید صاحب نے اپنا خونِ جگر پلا کر جس انداز میں اس پرچے کو اپنی زندگی کے آخری سانس تک سرسبز و شاداب رکھا وہ اب ادبی تاریخ کا ایک درخشاں حصہ ہے۔ مرحوم ایک عمدہ شاعر اور نثر نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نہایت ادب نواز شخصیت ہونے کے ناطے بھی ایک قابلِ رشک حیثیت رکھتے تھے، انہوں نے اعلیٰ ادبی اقدار کے فروغ کے لئے عمر بھر جدوجہد کی۔ انہیں نہ ستائش کی تمنا رہی اور نہ صلے کی پروا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا حلقہ ادب بڑا وسیع تھا اور اُس میں ہر مسلک و مشرب کے لوگ شامل تھے۔ وہ ایک صوفی اور درویش منش انسان تھے، جو فکرِ سُود و زیاں سے بے نیاز ہو کر اپنے حصّے کا تفویض کردہ کام سر جھکائے، ہمہ وقت انجام دینے میں مگن رہتا ہے۔ انہوں نے تمام زندگی میاں محمد بخشؒ کے اس زندہ اور زندگی بخش شعر کے مصداق گزاری۔

دنیا اُتے رکھ فقیرا ایسا بہن کھلوون کول ہوویں تے لوکی ہسن، دور ہوویں تے رَوون

آپ نے ''تخلیق'' کی جگمگاتی مشعل کے ورثے کو جس انداز سے اپنے والدِ گرامی سے وصول پایا ہے، ایسا لگتا ہے کہ اس کی شعلگی اللہ کے فضل سے نہ صرف باقی رہے گی بلکہ اس کی جگمگاہٹ میں اور اضافے کا امکان ہے۔ ''تخلیق'' سے جو براہِ راست رابطہ پیدا ہوا ہے انشاء اللہ برقرار رہے گا۔

محمد آصف مرزا (مری)

....

﴿21﴾ محترمی سونان صاحب!

آپ نے ''تخلیق'' کی بقا اور اس کے اجراء کا بیڑا اٹھایا ہے۔ اللہ ہمت اور برکت دے۔ کام بہت کٹھن ہے اسے صرف مرحوم اظہر جاوید ہی کر سکتے تھے۔ آپ کا مراسلہ میرے کاغذات کے ڈھیر میں کھو گیا تھا آج ملا ہے تو ندامت کے ساتھ لکھ رہا ہوں۔ ایک مرتبہ آپ اپنے والد مرحوم کے ساتھ مجاز ہسپتال میں آئے تھے غالباً دانتوں کا کوئی مسئلہ تھا۔ پھر آپ کو ریفرنس کے روز دیکھا تھا اور

سنا بھی تھا۔

میں نے متعدد دوستوں کے نام ''تخلیق'' جاری کروایا تھا۔ بدقسمتی سے وہ میرے ساتھ، دوسرے احباب کو بھی باقاعدگی سے نہ مل سکا۔ یہ رسالے کی مقبولیت اور ڈاک خانے کے اہل کاروں کے ''اعلیٰ'' ادبی ذوق کی دلیل ہے۔ خدا کرے آپ کو ایک اچھی ٹیم مل جائے۔ لکھنے والوں کی تو ایک بہت بڑی ٹیم ''تخلیق'' کو پورے برصغیر میں میسّر ہے۔ سب سے مشکل کام رسالہ ایڈٹ کرنا، چھاپنا اور اخراجات برداشت کرنا ہے۔ اس کام کے لئے ایک دو ساتھی ہی مل جائیں تو کام چل نکلے گا۔ اللہ آپ کا اور ''تخلیق'' کا نگہبان ہو۔

انوار احمد بگوی (لاہور)

....

﴿22﴾ محترمی!

جناب اظہر جاوید سے میری وابستگی ایک خدمت گار سے زیادہ نہیں تھی۔ مگر وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ تم سمجھتے، کم ہو بولتے بہت زیادہ ہو۔ کاش میں ان کی زندگی میں بولتا کم اور سنتا سمجھتا زیادہ، مگر افسوس میں ان سے ذرا سا بھی سیکھ نہ سکا۔ اس کا پچھتاوا مجھے رہتی عمر تک رہے گا۔ بھارت سے واپس آئے تو مجھے فون کر کے فوراً لاہور آنے کا کہا۔ میں کئی دن تک لاہور نہ جا سکا تو ''تخلیق'' کے تازہ شمارہ کے ہمراہ ایک بڑا سا لفافہ بھی ملا کھولا تو اس میں روزنامہ ''ہند سماچار'' کے کئی ایک اخبار نکلے۔ ورق گردانی کی تو اس میں میری لکھی کہانی ''بالا ٹھگ'' کی قسط وار ترتیب تھی۔ یہ سٹوری ''نوائے وقت''، ''امروز''، ''مشرق'' میں چھپتی رہی تھی اور دہلی میں ہند سماچار کے سنڈے ایڈیشن میں بھی لگتی رہی۔ بہر حال مجھے تو اس کی خبر نہیں تھی مگر اظہر جاوید نے اپنے دورۂ بھارت کے دوران اُسے دیکھا اور آتے ہوئے اخبار اپنے ساتھ لے آئے۔ میں لاہور آیا تو شکریہ ادا کیا۔ وہ حسبِ عادت مسکرائے اور کہا ''شاہ جی بس کرو'' اظہر جاوید نظروں سے اوجھل ہوئے مگر ہر پل ہماری آنکھوں کے سامنے تھے۔ سونان اظہر جاوید سے میری محبت اس حوالے سے محسوس کی جا سکتی ہے کہ میں نے اپنے بیٹے کا نام سونان جاوید رکھا ہے۔ سنا تھا بوڑھ کی جگہ بوڑھ نہیں اگتا۔ بوڑھ (برگد) اُگا ہے اور خوب اُگا ہے۔ ''تخلیق'' کی نئی شکل اور سلیقہ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ''تخلیق'' زندہ تھا اور پیہم زندہ رہے گا کہ اظہر جاوید = سونان اظہر جاوید کی شکل میں تخلیق کا ہی وجود ٹھہرا۔ دسمبر 2012 کے شمارے میں مراق مرزا نے ایک دہشت گرد کا بیان اس انداز میں ڈس کس کیا ہے کہ جیسے وہ خود سے محسوس کی گئی کیفیت کو لفظوں میں ڈھال کر اپنا اظہار کھلے عام کر رہے ہوں۔

محترم طارق محمود ''سفر شمال'' کو بڑی خوبصورتی سے ڈیزی فلا ور جیسی مہک سے نوازگئے بہت خوب! سیما پیروز (گوشۂ اظہر جاوید) سوالنامے کی روشنی میں: الگ سی محسوس ہوئیں۔ بہر حال سونان اظہر جاوید کا شکر گزار ہوں جن کی عرق ریزی اور محنت سے نہ صرف ''تخلیق'' میں چھپنے والے سبھی اہلِ قلم کی تازہ کاوشیں پڑھنے کو عطا ہوئیں بالکل ویسے ہی جس طرح اظہر جاوید کی زندگی میں ہوتی تھیں۔ اُن کی کمی کو سونان اظہر جاوید نے محسوس نہیں ہونے دیا۔ وہ بھی خوددار ہیں اپنے والد محترم کی طرح ''تخلیق'' کیلئے ان کے ارادے پختہ ہیں اگر ان کے ارادوں میں آپ میں اور ادب دوست احباب مل کر ان کا ساتھ دیں تو ''تخلیق'' انشا اللہ ماہنامے کی صورت اختیار کر جائے گا۔

جاوید راہی (اوکاڑہ)

....

﴿23﴾ محترمی سونان اظہر جاوید!

دو تین دن پہلے ''تخلیق'' کا تازہ شمارہ 12 بابت ماہ دسمبر 2012 نظر نواز ہوا۔ انور سدید صاحب سے مجھے یہ تو معلوم ہو گیا تھا کہ آپ ''تخلیق'' کو باپ کا ورثہ سمجھ کر جاری رکھیں گے لیکن اس بات کا یقین نہیں آتا تھا کیونکہ تھوڑے ہی عرصے میں کئی ادبی پرچے اپنے ایڈیٹر یا جاری کرنے والے کی وفات کے بعد دوبارہ شائع نہیں ہوئے۔ میں ویسے بھی ایک گوشہ نشین اور معذور آدمی ہوں۔ بصارت سے محرومی کی بناء پر جو مجھ سے 1993 میں چھن گئی تھی۔ کسی کے پاس آنا جانا میرے لئے دشوارترین کام تھا۔

اظہر جاوید صاحب سے میری پہلی ملاقات کئی سال پہلے ڈاکٹر وزیر آغا کے ہاں ہوئی۔ کئی لوگ جمع تھے اور مزے مزے کی باتیں ہو رہی تھیں۔ آغا صاحب نے میرا تعارف اظہر جاوید صاحب سے کروایا۔ اس وقت میں بینا تھا۔ تین چار سال بعد میں نابینا ہو گیا۔ اور کم وبیش سولہ سترہ سال پہلے اظہر جاوید صاحب سے میری ملاقات ''تخلیق'' کے دفتر واقع بھگوان سٹریٹ میں ہوئی۔ میں ایک نوجوان لڑکے کو ساتھ لے کر وہاں گیا۔ وہ بڑے تپاک اور محبت سے ملے۔ باتیں ہوتی رہیں، چائے پی اور جب میں اجازت لے کر واپس آنے لگا تو اظہر جاوید نے اٹھ کر مجھے رخصت کیا اور میرے ہاتھ میں ایک نوٹ تھما کر بولے یہ ایک ہزار روپیہ ''تخلیق'' کی طرف سے۔ میں نے انکار کرتے ہوئے وہ ہزار کا نوٹ انہیں واپس دینے کی کوشش کی لیکن انہوں نے میری مٹھی دبا دی۔ میں احسان مندی کے بوجھ سے جھکا ہوا دفتر سے نکلا اور گھر آ گیا۔ اس کے بعد ''تخلیق'' مجھے باقاعدگی سے ملتا رہا لیکن ان کے دفتر نہ جا سکا۔ دعا کرتا ہوں کہ آپ شاد و آباد رہیں۔ اور اُس عظیم دوست کا لگایا ہوا پودا ''تخلیق'' آپ کی نگہداشت میں اور بھی ترقی کرے پھلے اور پھولے۔ آمین!

مشتاق احمد (لاہور)

....

﴿24﴾ محترمی!

اظہر جاوید صاحب سے میری پہلی ملاقات میرے دوست شفقت تنویر مرزا صاحب نے دفتر ''امروز'' میں کرائی تھی۔ یہ 1974ء کا واقعہ ہے۔ اظہر جاوید نے ''امروز'' میں کالم نگاری شروع کر رکھی تھی۔ اظہر جاوید صاحب ساری زندگی بڑی استقامت سے احمد ندیم قاسمی اور ڈاکٹر وزیر آغا کے دبستانوں کے درمیاں ایک مضبوط پُل کا سا کردار ادا کرتے رہے ہیں کیونکہ اظہر جاوید بذاتِ خود Creator اور Innovaator تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ''۵۰ نامور ادبی شخصیات'' میں ملک مقبول احمد نے یہ انکشاف کیا کہ احمد ندیم قاسمی کی وفات کے بعد اظہر جاوید ہر جمعرات کو قاسمی صاحب کے مزار پر ''دیوا'' جلاتا ہے اور پھر اسی تحریر میں ملک صاحب سوال کرتے ہیں کہ اظہر جاوید کون سی مٹی کا بنا ہوا انسان ہے؟ اظہر جاوید صاحب سے میری یادِ اللہ کوئی 38 سالوں پر محیط ہے۔

ہم دونوں جب بھی ہم کلام ہوتے تو اپنا نظامِ تنفس کا سلسلہ بحال رکھنے کے لیے پنجابی میں ہی گفتگو کرتے تھے۔ وہ بڑے انسان تھے۔ بڑے وضع دار۔ بھی اللہ سبحان تعالیٰ اظہر جاوید صاحب کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ آمین!

آئی۔ یوجرال (میر پور۔ آزاد جموں وکشمیر)

....

﴿25﴾ مکرمی سونان جاوید صاحب!

اظہر جاوید صاحب کے اچانک انتقال سے قارئینِ 'تخلیق' کو جو جانکاہ صدمہ پہنچا ہے اُس کی گرفت سے آزاد ہونا آسان نہیں۔ اگر چہ یہ واقعہ ہے کہ زندگی اور موت کے درمیان کشمکش کا سلسلہ انسان کی پیدائش کے روزِ اول سے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ اس جنگ میں کبھی زندگی غالب رہتی ہے اور کبھی موت کامیاب ہو جاتی ہے۔ لیکن بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جن کو شکست دے کر بھی موت اُن پر غالب نہیں ہو پاتی۔ اظہر جاوید بھی ایسے ہی شخص تھے جو زندگی بھر جیتے رہے اور مرنے کے بعد بھی زندہ ہیں۔ ایک بالغ نظر، کشادہ ذہن، ہمدرد دل اور مجبوروں و محکوموں سے پیار کرنے والا انسان کبھی مر نہیں سکتا۔ آج کے اس پُر آشوب دور جب انسان کا قد چھوٹا اور سائے لمبے ہوتے جا رہے ہیں، اصولوں اور قدروں پر عمل کرنا تو دور کی بات، گفتگو کرنا بھی تضیعِ اوقات اور بے محل ٹھہرتا ہو، موقع پرستی اور مفاد پرستی کو محبت، ایثار اور ہمدردی پر فوقیت حاصل ہو رہی ہو، وہ شخص جس نے اصولوں سے کبھی سمجھوتہ کرنا گوارا نہیں کیا جو مصیبت اور تکالیف کے دور میں بھی ثابت قدم رہا، جس نے دولت و ثروت کو نہ تو کبھی اہمیت دی اور نہ ہی سیاسی بازی گروں کے سامنے گھٹنے ٹیکے، نہ ہی وقتی مفاد کی خاطر کسی خمیدہ ابرو اور کشیدہ سر آمر کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا، جو اپنے ملک اور قوم کی محرومیوں اور بدنصیبیوں پر زندگی بھر کڑھتا رہا پھر بھی اس حوصلے کے ساتھ جیتا تھا کہ۔

بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے   فروغِ گلشن و صوتِ ہزار کا موسم

اُس شخص کی خدمت میں نذرِ عقیدت پیش کرتے ہوئے ہزاروں سلام، بے انتہا خلوص اور بے پناہ محبت کا اظہار بھی کم ہوگا کہ وہ ہماری دعاؤں کا محتاج نہیں بلکہ خود ہمارے اپنے وجود کا اظہار اُس کی شخصیت کی پھوٹتی ہوئی رنگ برنگی کرنوں کا مقروض ہے۔ اظہر جاوید ایک شخصیت ہی نہیں ایک انجمن بھی تھا۔ وہ ایک ایسا جہاں دیدہ شخص تھا جس نے خرابوں سے موتی چنے، گدڑیوں میں لعل تلاش کیا اور اپنے جریدے 'تخلیق' کی صفحات پر اُنہیں سجا کر معنویت کے رموز سے قاری کو روشناس کیا۔ اُس کا اعتراف نہ کرنا کم ظرفی ہی ہوگی۔

.... سرور حسین (پٹنہ۔انڈیا)

﴿26﴾ سونانِ اظہر جاوید صاحب!

''اظہر جاوید نمبر'' نہایت معرکہ آراء تھا۔ حسنِ ترتیب و تزئین اور مواد کی گراں قدر پیشکش نے اظہر جاوید کو زندہ و پائندہ کر دیا۔ ازاں بعد ستمبر کا شمارہ میری دسترس میں نہ آ سکا۔ اب خدا خدا کر کے اور متعدد بار یاد دہانیوں کے بعد دسمبر کے پرچے کا دیدار کرنے میں کامیاب ٹھہرا ہوں۔ اظہر جاوید مرحوم کی علمی و ادبی کاوشوں کا دل و جان سے گرویدہ ہونے کے سبب تخلیق سے منقطع ہونے کا ''گناہِ کبیرہ'' مجھ سے سرزد کیوں ہونے لگا؟ بہر حال آپ کا دسمبر کا شمارہ احساس دلا رہا ہے کہ آپ نے اپنے والدِ گرامی کے اثاثے کو ٹھیس نہیں لگنے دی اور اُس کا معیارِ تخلیق ''حسبِ سابق'' بلند ہے......اچھے تخلیق کاروں کا تعاون آپ کے شاملِ حال ہے۔ اُن کے دستِ تعاون کو کسی مقام پر بھی دھچکا نہ لگے۔ نئے لکھنے والوں کی بھی حوصلہ افزائی کیجئے۔ لیکن معیار کا برتر ہونا شرطِ اولیں ہو۔

.... سیّد ریاض حسین زیدی (ساہیوال)

﴿27﴾ محترم سونان اظہر جاوید صاحب!

ماہنامہ ''تخلیق'' کا دسمبر کا شمارہ مل گیا ہے۔ باعثِ مسرت واستعجاب ہے۔ ہر چیز اپنی جگہ پر موجود ہے۔ رنگ آمیز ہے۔ خرد افروز ہے۔ لکھنے والوں کا جذبہ اپنی سطح پر قائم ہے۔ تمام تحریریں نگینوں کی طرح اپنے اپنے مقام پر متعین اور روشن ہیں۔ سارا منظر خوبصورت ہے۔ سارا چمن شاداب ہے۔ لیکن صاحبِ منظر، روحِ چمن اور جانِ ''تخلیق'' اظہر جاوید نہیں ہے۔ مرحوم اظہر جاوید کے لئے ہزاروں دعائیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، ان کا اگلا جہاں روشن رکھے اور ان کا ''تخلیق'' آباد رکھے۔

.... **خالد عبداللہ** (راولپنڈی)

﴿28﴾ محترمی سونان اظہر صاحب!

''تخلیق'' کا تازہ شمارہ دسمبر 2012ء نظر نواز ہوا۔ سرِ ورق خوبصورت ہے اور دیگر تبدیلیاں بھی پرچے کے حسن میں اضافے کا موجب ہیں۔ آپ جانیں میں نے پورا پرچہ پڑھ لیا ہے۔ علمی وادبی نثر پاروں کے ساتھ معیاری اور دل پسند منظومات ہمیشہ کی طرح تخلیق کا اختصاص رہا۔ سچ تو یہ ہے کہ وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔

.... **تصور اقبال** (اٹک)

﴿29﴾ جناب سونان اظہر!

اظہر جاوید کی دو تخلیقات میرے سامنے ہیں۔ ایک ''ادبی تخلیق'' اور دوسری ''سونان اظہر'' خدا ان دونوں کو رہتی دنیا تک قائم رکھے آمین! ''ادبی تخلیق'' ایک تن آور درخت کی مانند ہے جس کی آبیاری و بقا کی ذمہ داری سونان اظہر جیسے باہمت نوجوان کے کندھوں پر ہے، مجھے اُمید ہے کہ سونان اس شجر کو بچائے رکھنے کے لئے پوری دل جمعی سے کام لیں گے، اس لئے کہ وہ ایک خوددار اور باہمت باپ کے بیٹے ہیں۔

سونان! آپ کا شکریہ کہ آپ نے یاد رکھا اور تازہ شمارہ ارسال کیا، یہ شمارہ بھی آپ کی کاوش کی مثال ہے بہت اچھا اور معیاری ہے، مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ رسالہ اظہر جاوید ہی نکال رہے ہیں، اور کیوں نہیں کہ ان کے دیرینہ ساتھی آج بھی تخلیق کے ساتھ ہیں بطور خاص انور سدید جیسا جیّد عالم جسے میں ''علم کا سمندر کہتی ہوں'' آپ کے ساتھ ہیں۔ خدا ان کا سایہ ہمیشہ ہمارے سروں پر قائم رکھے۔ آمین! ان کی تحریریں عالمانہ اور مدبرانہ ہوتی ہیں جس سے ہمیں معلومات کا خزینہ مل جاتا ہے اور بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے، اس شمارے میں انور سدید صاحب کا مضمون ''نواب مصطفیٰ خان شیفتہ'' اور سکندر حیات میکن کے مضامین سرفہرست ہیں۔ پڑھ کر علم میں اضافہ ہوا۔ نظموں میں شہزاد نیر کی نظم اور عمر برناوی کے گیت پسند آئے، افسانوں میں ثمینہ سیّد کا ''انشورنس'' اور نجیب عمر کا ''جذبۂ عشق'' بہت اچھے لگے۔ سلیم آغا قزلباش کا انشائیہ ''تھکن'' لاجواب تھا، گوشۂ اظہر جاوید میں ان کی نظم ''SMS کے جواب میں'' بہت پسند آئی، اظہر جاوید پر لکھے جانے والے مضامین پڑھ کر لگتا ہے کہ ان سے ملاقات نہ ہو کر بھی ملاقات رہی ہے۔

.... **مہ جبین قیصر** (کراچی)

﴿30﴾ سونان اظہر جاوید صاحب!

محترم ڈاکٹر انور سدید صاحب کے لئے بے حد ممنونیت کہ اُن کی کرم فرمائی سے ''تخلیق'' کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ آپ نے اپنے علمی و ادبی ورثے کو نمایاں پیش رفت کے ساتھ جس طرح سنبھالا اور اُجالا ہے وہ بلا شبہ لائقِ تحسین ہے اور 'تخلیق' کے تخلیقی و اشاعتی مراحل جس خوش اُسلوبی و کامیابی سے طے کئے ہیں وہ اس ادبی جریدے کے روشن مستقبل کی پیش گوئی کرتے ہیں۔

'تخلیق' کے مندرجات تنوع سمیٹے ہوئے ہیں اس سے مختلف پہلوؤں سے ادبی آگہی و ذہنی سرشاری ملتی ہے کہ جملہ اصنافِ نظم و نثر اپنے مخصوص رنگ و آہنگ سے متاثر کرتی ہیں۔ یوں 'تخلیق' کی روایت، جدت سے ہمکنار ہوئی جاتی ہے۔

'پہلی بات' کے حوالے سے 'تخلیق' کی حسبِ سابق دو ماہی اشاعت برقرار رہے۔ مضامین، موضوعات پہ عمدگی سے محیط ہیں۔ نظموں میں بھی بہت رنگا رنگی پائی جاتی ہے۔ افسانے، زندگی کے مختلف ذائقوں سے روشناس کراتے ہیں۔ ڈائری کے اوراق بھی اچھے لگے۔ انشائیہ مختلف سا لگا کیونکہ 'تھکن' کے مثبت زاویوں پہ فوکس کیا گیا تھا۔ گوشۂ اظہر جاوید، ترتیب و پیشکش کے اعتبار سے بہت خوب تھا۔ 'پنجاب رنگ' بھی دلچسپی سے پڑھا۔ تبصرے، بھی کتب کے تعارف میں ممد و معاون رہے اور ''انجمنِ خیال'' تو سجائی ہی اس لئے جاتی ہے کہ قارئین و قلم کار پرچے کی تحریروں پہ متوازن و مدلل اظہارِ رائے کریں۔

سالِ نو کی مبارکباد اور 'تخلیق' کے لئے نیک خواہشات کے ساتھ۔

شگفتہ نازلی (لاہور)

....

﴿31﴾ مکرمی سونان اظہر جاوید!

آپ کی عنایت سے ''تخلیق'' کا تازہ شمارہ دسمبر 2012ء میرے ہاتھوں میں ہے۔ 'تخلیق' کی مسلسل اشاعت ہم سب کا خواب ہے۔ اسے ماہنامہ، دو ماہی یا سہ ماہی جو بھی بنائیں، تسلسل سب سے اہم ہے۔ اب یہ فیصلہ کرنا آپ کا کام کہ کون سی صورت اس کی اشاعت میں معاون ہو گی۔ لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ اظہر جاوید صاحب کے بعد جس طرح آپ نے ایک ضخیم خاص نمبر اور دو عام شمارے پیش کیے ہیں۔ یہ آپ کے ارادے کی استقامت کی دلیل ہے جس سے مستقبل کے لئے اچھے توقعات وابستہ کئے جا سکتے ہیں اور اس سے بڑھ کر آپ کو بے شمار صفِ اوّل کے لکھنے والوں کی معاونت بھی حاصل ہے۔

سکندر حیات میکن صاحب نے ساحؔر کے جس گیت سے اپنے مضمون کا عنوان لیا ہے (پَل دو پَل کا شاعر) وہ ان کے امر گیتوں میں سے ایک ہے۔ یہ جب بھی کانوں میں پڑے، ایک کیفیت سے دوچار کرتی ہے۔ واقعی یہ پَل دو پَل صدیوں پر بھاری ہیں۔ مصنف نے دل کی گہرائیوں سے ساحؔر کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا، ہائے یہ زباں پہ کس کا نام آیا۔ اردو ادب کا ایک بڑا نام، ان کی نظم ''پھر یوں ہوا، شاعری کا ایک ایسا ٹکڑا جہاں حُسنِ کلام کے ساتھ نزاکتِ خیال کا ایسا اہتمام جو نظموں میں عام طور سے نہیں پایا جاتا۔ خصوصاً آخری دو مصرعے۔

اس کا بدن تھا دھند کی خوشبو کا پیرہن — دھندلے تھے سارے نقش دھواں اس کی سانس تھی

اب کچھ افسانوں کے بابت۔ عزیز میرٹھی کا گورے کالے، افسانے کی ابتدا جس موضوع سے ہوئی تھی۔ انجام کسی اور طرف چلا گیا لیکن اندازِ بیان خوب ہے۔

ثمینہ سیّد کا 'انشورنس'۔ واقعی پیسہ سب کچھ نہیں ہوتا اور نہ زندگی کے سارے مسائل کا حل۔لیکن یہ بات اگر سمجھ میں آئے تو بڑی قیمتی ہے۔ دوسری طرف زندگی میں اور بھی بہت سی چیزیں ہوتی ہیں۔ نہایت قیمتی، گرچہ ان کی مالی قدر تو نہیں ہوتی لیکن ہوتی انمول ہیں۔ مراق مرزا ایک مستند اور معروف افسانہ نگار ہیں۔ ان کے جتنے افسانے میں نے پڑھے ہیں وہ ہمارے سماجی مسائل کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ان کا بے باک لہجہ قاری کے دل میں اُتر جاتا ہے۔ مذکورہ افسانہ ''ایک دہشت گرد کا بیان'' اسی کی ایک کڑی ہے۔ دہشت گردی کی بات سب کرتے ہیں لیکن مراق مرزا کی طرح کوئی یہ کہنے کی جرأت نہیں کرتا کہ دہشت گرد بنتے کیوں کر ہیں۔

''بڑی مشکل ہے پنگھٹ کی ڈگر'' زہیرہ سمن علی کا مختصر لیکن اپنے انجام کے لحاظ سے دلچسپ افسانہ ہے، پیار کا فسوں، عشق کا رنگ اور محبت کی لذت انسان کو کسی اور دنیا میں لے جاتی ہے اور لالی کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ غربت اور بے بسی میں کھلے پھول کو اس کا قدر دان مل گیا۔

''تھکن''، سلیم آغا قزلباش کا خوبصورت انشائیہ ہے۔ اُنہوں نے تھکن کے مثبت و منفی دونوں پہلو اُجاگر کر دیے، وگرنہ ہم اسے منفی ہی جانتے۔ ستائش کے طور پر کہا جاتا ہے کہ وہ کبھی تھکتا نہیں۔ لیکن وہ تھکان ہی تو ہے جو اسے نیند جیسی نعمت سے روشناس کراتی ہے۔

نجیب عمر (کراچی)

....

﴾32﴿ جناب سونان اظہر صاحب!

نیا شمارہ ''تخلیق'' دسمبر 2012ء پھر اُسی آب و تاب کے ساتھ نمودار ہوا۔ پتہ ہی نہیں چل رہا ہے کہ رسالہ اظہر جاوید صاحب نکال رہے ہیں یا اُن کے فرزند آپ فرزندِ ارجمند ہونے کے ناطے پورا پورا حق ادا کر رہے ہیں۔ جاوید صاحب ایک عظیم شخصیت کے مالک تھے۔ میں ایک عرصہ سے ''تخلیق'' کا خریدار ہوں ان کو اور ان کی خدمات کو کوئی نہیں بھول سکتا۔ میرا بے شمار کلام ''تخلیق'' میں شائع ہو چکا ہے۔ بعض اوقات لگا تار ہر شمارے میں میرا کلام شائع کیا کرتے تھے۔ آخری شمارے میں بھی میری غزل ہے۔ ایک مرتبہ فون پر بھی بات ہوئی تھی۔ ایک دفعہ خط بھی لکھ چکے ہیں۔ وہ قلم کار کو صرف قلم کار مانتے تھے۔ یہ نہیں دیکھتے تھے کہ یہ ہندوستان کا ہے پاکستان کا ہے۔ بہت بڑے آدمی تھے رب ان کے درجات بلند کرے۔ آمین!

مجھے 2013ء کے دو شمارے مل چکے ہیں لیکن کسی میں بھی میرا کلام نہیں شائع کیا گیا ہے۔ لگتا ہے آپ کو میرا کلام پسند نہیں آ رہا ہے۔ اگر پسند آئے تو اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھوں گا اس لئے کہ ''تخلیق'' مجھے پسند ہے۔

حفیظ انجم (انڈیا)

....

﴾33﴿ مکرمی!

اظہر جاوید صاحب کے انتقال کے بعد میں نے سوچا تھا کہ شاید اب ''تخلیق'' بند ہو جائے گا۔ لیکن پتہ چلا ہے کہ ''تخلیق'' کی اشاعت تھوڑے سے تعطل کے بعد دوبارہ جاری ہوگئی ہے۔ ایک عرصے سے میں ''تخلیق'' کا قاری رہا ہوں۔ میرے افسانے بھی مرحوم نے بہت اہتمام سے شائع کئے ہیں۔ میں نارنگ ساقی صاحب سے ربط پیدا کر رہا ہوں تاکہ ''تخلیق'' پابندی سے ملتا رہا۔

یٰسین احمد (انڈیا)

◆◆◆

﴿34﴾ محترم سونان اظہر جاوید!

دبیز اور دلکش سرِ ورق کے ساتھ اندرون صفحات اپنی روایتی تہذیب و تربیت کو قائم رکھتے ہوئے ''انجمن خیال'' میں شامل صاحب مکتوب کو ترتیب کی فہرست میں شامل کر کے بہت بڑا احسان کیا ہے۔ یہ اضافہ قابلِ تحسین اور مفید بھی ہے۔ اس سے آپ کی ادارتی تہذیب کی سلیقہ مندی کا پتہ چلتا ہے۔

''انجمنِ خیال'' کے کالم میں اپنے نام کے ساتھ مکرانی کی جگہ عمرانی دیکھ کر عجیب سا لگا۔ تخلیق کے قارئین مجھے جانتے ہیں وہ تصحیح کر کے پڑھ بھی لیں گے مگر سوال پروف ریڈینگ پر ضرور اُٹھے گا۔ آئندہ خیال رکھیئے گا۔

آپ نے اپنے اداریہ ''پہلی بات'' کے حوالے ''تخلیق'' کو ماہنامہ، دو ماہی اور سہ ماہی پر اظہار خیال کرنے کو کہا ہے۔ اس سلسلے میں میری رائے یہ ہے کہ ''تخلیق'' ماہنامہ تو کبھی رہا نہیں جب سے میں ''تخلیق'' کو جانتا ہوں۔ اچھا تو یہی ہے کہ اسے ''دو ماہی'' ہی رکھا جائے۔ خداوند قدوس آپ کی ہمت کو مزید مستحکم کرے۔ آمین!

''نواب مصطفٰے خاں شیفتہ'' کے تعلق سے ڈاکٹر انور سدید کا مضمون معلومات میں اضافہ کرتا ہے۔ ان کے فنّی عظمت کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ ''پل دو پل کا شاعر'' میں سکندر حیات نے حوالہ جات کے ساتھ ساحر لدھیانوی کی ادبی و فلمی شعری سرمائے کی اہمیت کی اچھی تصویر کشی کی ہے۔

ڈاکٹر شباب للت نے بڑے اچھے اور پُر کیف حمدیہ اشعار کہے ہیں۔ شہزاد نیّر کی آزاد نظم ''ہدایت کار'' پسند آئی۔ عزیز میرٹھی کا مقالہ ''گورے کالے'' جذباتی تحریر ہے۔ جس میں نفسِ امارہ کو مارنے کا درسِ عبرت بھی ہے۔ ثمینہ سیّد کا افسانہ ''انشورنس'' متاثر کرتا ہے۔ اس دنیا میں بچوں کیلئے انسان کیسے کیسے عبرت ناک فیصلے لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ مراق مرزا کا افسانہ ''ایک دہشت گرد کا بیان'' اچھا لگا۔ دیگر افسانے بھی اچھے ہیں۔ اس بار افسانوں کا اچھا انتخاب کیا ہے آپ نے۔ مختلف صفحات پر اظہر جاوید کے اشعار کا لطف ہی کچھ اور ہے۔ مجھے یاد ہے کسی صاحب نے اپنے خط میں اظہارِ خیال کیا تھا کہ ''تخلیق'' میں اظہر جاوید اپنی غزلیں شریک اشاعت کیوں نہیں کرتے اس کے بعد بھی اظہر جاوید کی کوئی مکمل غزل ''تخلیق'' کے صفحات پر نظر نہیں آئی۔ غزلوں کا انتخاب بھی عمدہ ہے۔ شفیق احمد فاروقی، ڈاکٹر شباب للت، کرشن کمار طور، ڈاکٹر محبوب راہی، شہزاد نیر، عظیم راہی کی غزلیں اثر پذیر ہیں۔

مولانا پھول محمد نعمت رضوی انڈیا میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ آپ ان کے نام کا رسالہ بھی میرے ہی پتہ پر ایک ساتھ ارسال کریں ان کا زرتعاون بھی جلد ہی ساقی صاحب کو بھیج دیا جائے گا۔ کتابوں پر تبصرے بھی بڑے مزیدار ہوتے ہیں۔ ''انجمنِ خیال'' سے تخلیق اور صاحب تخلیق کے ساتھ قارئین کو ایک دوسرے کے اظہارِ رائے سے آگاہی ہوتی ہے۔

''تخلیق'' کو اور آپ کو خدا ہر نظرِ بد سے محفوظ رکھے۔ ''تخلیق'' کے پڑھنے والے تھک جائیں مگر ''تخلیق'' کا نکلنا بند نہ ہو۔ یہ نعرہ ہمیشہ قائم رہے۔ ''دم ہے تو تخلیق نکلتا رہے گا''۔ خداوندِ قدوس آپ کے عزم کو مزید استحکام بخشے اور آپ کو صحتِ دوام عطا کرے (آمین) چند کلام حاضرِ خدمت کرتا ہوں۔

وصی مکرانی واجدی (نیپال)

....

﴿35﴾ محترم جناب سونان اظہر جاوید!

یاد آوری کا بے حد شکریہ اور تاخیر کے لئے معذرت۔ آپ کے ارشاد کے مطابق نہایت عجز کے ساتھ اپنی چند تحریریں ارسال کر رہی ہوں۔ انشا اللہ جلد ہی ایک آدھ افسانہ بھی پیشِ خدمت کر دوں گی۔ اُمید ہے اور دعا بھی ہے کہ یہ سب کچھ آپ کے معیارِ اعلیٰ پر پورا اُترے۔ محترم اظہر جاوید صاحب کے ساتھ گزرے ہوئے لمحات میرے لئے سرمایۂ حیات ہیں۔ اللہ پاک انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین! اُمید ہے آپ اسی طرح یاد فرما کر عزت افزائی کرتے رہیں گے۔

نسرین نکہت سبزواری (لاہور)

....

﴿36﴾ عزیزم سونان اظہر جاوید!

مجھے خوشی ہے کہ آپ کے عظیم والد جناب اظہر جاوید نے جو پودا لگایا تھا اور اسے خونِ جگر سے 43 سال تک پالا تھا۔ آپ نے اسے مرجھانے نہیں دیا اور اس کی دیکھ بھال اچھی طرح کر رہے ہیں۔ معیار کا بھی خیال رکھتے ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ کہ آپ نے اپنے والد کے دوستوں کو فراموش نہیں کیا اور پرچہ بھیجنے کی ان کی روایت کو زندہ رکھا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔

دسمبر کا شمارہ بھی بے حد خوبصورت ہے۔ ہر صفحہ پر اظہر جاوید صاحب کی تصویر دیکھ کر ان کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ لیکن ان کی یاد تو ہمارے دل میں بسی ہوئی ہے۔ اُمید ہے بخیر ہوں گے۔

انوار فیروز (راولپنڈی)

◆◆◆